ادارۂ فن اور شخصیّت
کے لئے
جشن
اردو صحافت
میں
ایک نیا ریکارڈ
قائم کیا
جی پی سپّی۔ رمیش سپّی

عظیم شخصیتوں پر نمبر نکال کر

اردو زبان کی ادبی صحافت میں
نئی روایت کی بنیاد ڈالنے پر
صابر دت مدیرِ "فن اور شخصیت" کو مبارکباد

گلشن رائے

غزل
نمبر
کے لئے
نیک تمنّائیں
دلھر
مینڈر
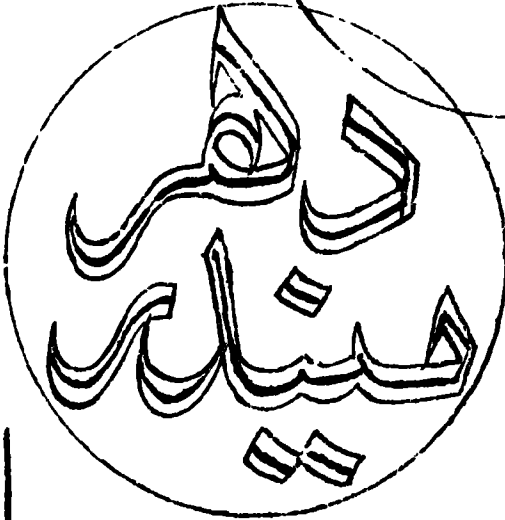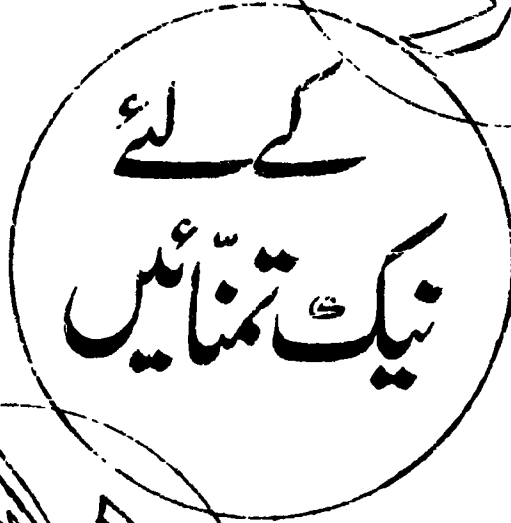
غزل
کی
اعلیٰ قدروں کیلئے
نذرانۂ خلوص
موج
حمار

سے لیکر

موجودہ دور کے شعراء کی غزلوں کا

پیش کرنے پر

ادارہ "فن اور شخصیت" کو مبارکباد

غزل نمبر کے خالق صابر دت کے لیے

ہدیۂ خلوص

ماہنامہ ساگر

موجودہ اُردو صحافت کے اہم ستون

رسالہ "فن اور شخصیت" کے

غزل نمبر کے لئے

گلشن زندہ

غزل نمبر
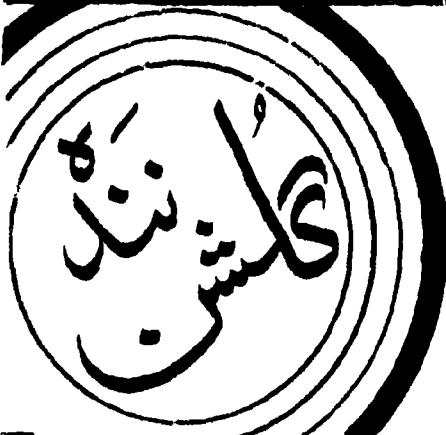
کے لئے

نذرانۂ خلوص

پریمی جی

ہندوستان

کی اردو صحافت میں

پہلی بار

غزل نمبر

شائع کرنے پر

نوجوان صحافی و شاعر صابر دت کو مبارکباد

کالیداس گپتا رضا

ھدیۂ تہنیت

مہندر ناتھ یادگار نمبر

جاں نثار اختر نمبر

اور کملیشور نمبر

پیش کر کے رسالہ "فن اور شخصیت"
نے نئی روایت کی بنا ڈالی ہے جس کی تاریخی
اہمیت ہی نہیں بلکہ یہ وقت کی ایک اہم
ضرورت بھی ہے۔ اُمید ہے

غزل نمبر

بھی حسبِ روایت شاندار ہو گا۔

ستیش بھٹناگر

کے لئے

نیک خواہشات
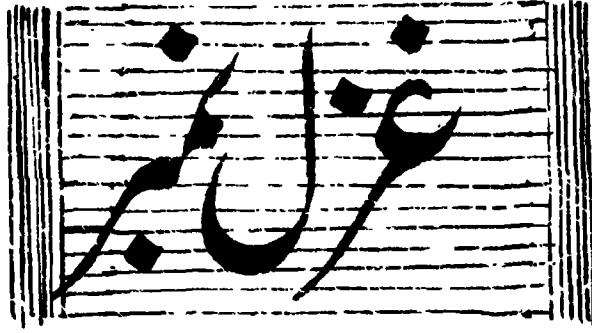
کے ساتھ

آنند بخشی

ہریانہ کی کامیابیوں کی شاندار رزمیہ داستان

پچھلے تقریباً چھ مہینوں میں جنتا سرکار کی طرف سے چلائے جا رہے سماجی اور اقتصادی پروگرام سے عوام میں اُمید و اعتماد کا ایک نیا جذبہ جاگا ہے۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ ترقیاتی کاموں نے ایک نئی سمت اختیار کی ہے۔ خوردنی اجناس کی پیداوار کا نشانہ ۱۵ لاکھ ٹن مقرر کیا گیا ہے۔ زرعی خدمات کی توسیع اور فصل تحفظ کاموں سے دو نئی اسکیمیں شروع کی جا رہی ہیں۔ کسانوں کو زرعی خدمات سے متعلقہ امداد باہمی سوسائیٹیوں کی وساطت سے فصل ربیع کے لئے ۴۶.۵۰ لاکھ روپے کے قرضہ جات دیئے جائینگے۔ مزید برآں زرعی اصلاحات، ٹیوب ویل لگانے اور ٹریکٹر وغیرہ خریدنے کے لئے بینکوں کے ذریعہ برس ۱۹۷۷-۷۸ میں ۱۷۰۰۶.۲۸ لاکھ روپے کے قرضہ جات مہیا کرائے جائینگے۔ گزشتہ ۹ مہینوں میں ۱۱۰۰۰ ایکڑ رقبہ کا زرعی سدھار ہوا جو کہ ایک نیا ریکارڈ ہے۔ آبپاشی کی سہولیات میں توسیع لانے کی غرض سے آئندہ سال ایک نئی پانچ سالہ اسکیم شروع کی جا رہی ہے۔ پانی کے رساؤ کو روکنے کے لئے کئے گئے اقدامات سے مزید ۱۳۵۰۰۰ ہیکٹر رقبہ کو آبپاشی سہولیات مہیا ہونگی جسکے نتیجہ کے طور پر ۲۰ کروڑ روپے کی مالیت کی فصل میں سالانہ اضافہ ہوگا۔ چھوٹی آبپاشی کے زیر آبپاشی ۱۲.۵۰ لاکھ ہیکٹر رقبہ بڑھ کر ۱۳.۱۳ لاکھ ہیکٹر ہو جائے گا۔ گزشتہ چھ مہینوں میں بجلی کی یومیہ سپلائی ۶۵ لاکھ یونٹ سے بڑھ کر ۷۵ لاکھ یونٹ ہو گئی ہے۔ بجلی سپلائی میں زراعت کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس وقت بجلی سے چلنے والے ٹیوب ویلوں کی تعداد ۱۶۴۰۰۰ ہے اور چالو مالی سال میں ۱۸۰۰۰ نئے ٹیوب ویلوں کو بجلی مہیا کی جائے گی۔ بجلی کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے نئے تھرمل پلانٹوں کی تعمیر کا کام تیزی سے عمل میں آرہا ہے۔ دیہی گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کے قیام کیلئے نئی اسکیمیں جاری کی گئی ہیں جن سے ۱۹۷۸-۷۹ء میں ۴۷۰۰۰ بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرائے جانیکی توقع ہے۔ چالو مالی سال کے آخر تک ۱۱۶ نئے دیہات میں پینے کے پانی کی سپلائی کی جائیگی جو کہ اس قلیل مدت میں ایک نیا ریکارڈ ہے۔ مارچ ۱۹۷۸ء کے آخر تک اس اسکیم سے فیض یاب ہونے والے دیہات کی تعداد ۱۰۴۶ تک پہنچ جائیگی۔ مالی سال رواں کے دوران ۲۱۰ دیہات پکی سڑکوں سے ملائے جائینگے۔ ریاست میں ۵۳۱۰ دیہات کو پکی سڑکوں سے ملایا جا چکا ہے۔ ۱۹۷۷-۷۸ء میں سیلاب کی روک تھام اور نالوں کے کام پر ۱۰.۹۵ کروڑ روپے کی بجائے ۲۵.۰۱ کروڑ روپے خرچ ہوئے۔ ریاست آئندہ پانچ برسوں میں باڑھ کی آفت سے پوری طرح نجات پا جائے گی۔

جاری کردہ:۔ **محکمۂ تعلقات عامہ ہریانہ**

اللہ
صبر کرنے والوں
کے ساتھ ہے

اردو شاعری کی آبرو
غزل
کے لئے نذرانۂ خلوص

نگراں :-

علی سردار جعفری

مدیر :-

صابر دت

رسالہ "فن اور شخصیت" ہر سال آپ کی خدمت میں دو شاہکار پیش کرتا ہے، ان فنکاروں اور شخصیتوں کے بارے میں جنہوں نے ادب، فلم، سائنس، سیاست، مصوری یا زندگی کے کسی بھی شعبے میں انسانیت کی فلاح و فروغ کے لئے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے —

(ادارہ)

ششماہی
فن اور شخصیت
بمبئی

مارچ ۱۹۷۸ء
جلد (۴) شمارہ (۶)

غزل نمبر

مُدیر:-
صابر دت

معاون مُدیر:-
رفیق جعفر

موجودہ شمارہ: ۴۰ روپے
عام شمارہ: ۱۰ روپے

پبلیشرز:-
فن اور فنکار

سول ڈسٹری بیوٹر:-
علوی بُک ڈپو
۴۹ - محمد علی روڈ ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

فون نمبر:
۳۲۰۲۰۴

سفارت خانۂ ہند،
ماسکو،
۲۰ اپریل ۱۹۷۸ء

پیارے صابر دت!

تم میرے خط کی توقع دو ہفتے پہلے کر رہے ہوگے۔ لیکن میں یہاں آکر اتنا مصروف ہوگیا کہ نہ تو تمہیں خط لکھ سکا اور نہ غزل نمبر کے لئے وہ چھوٹا سا مضمون جس کا وعدہ کرکے آیا تھا۔ اب اس تحریر کو تم خط بھی سمجھ سکتے ہو اور میرا مضمون بھی۔

بمبئی سے ماسکو تک کا سفر یوں تو آرام دہ تھا لیکن تھکان کا باعث تھا۔ اب دلی سے ماسکو تک جیٹ ہوائی جہاز ساڑھے پانچ چھ گھنٹوں میں پہنچ جاتا ہے۔ بمبئی سے دلی تک کے سفر کے لئے پونے دو گھنٹے کافی ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارا ہوائی جہاز بمبئی سے دلی اور تہران ہوتا ہوا ماسکو گیا اور بارہ گھنٹے جہاز پر گزارنے پڑے۔ تہران کے ہوائی اڈے پر اترنے کی اجازت نہیں تھی اس لئے جہاز ہی میں بیٹھنا پڑا۔ خیریت یہ ہوئی کہ عصمت چغتائی اور سلطانہ میرے ساتھ تھیں اس لئے تنہا اور بور ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ ویسے مجھے سفر بہت پسند ہے اور میں ہمیشہ غالب کا مصرعہ دہراتا رہتا ہوں۔ "زہے مردان عمرے کہ در سفر گزرد" ـــ یہ میرا ہندوستان سے یورپ کی طرف نواں سفر تھا۔

اس بار سوویت یونین ہی میں پرواز کرتا رہا۔ ۱۲ اپریل کو دوپہر کے وقت ماسکو پہنچا اور ایک دن آرام کرکے ۱۴ اپریل کو تاجکستان کے لئے روانہ ہوگیا۔ ۱۲ اپریل کو فیض بھی دلی سے آگئے۔ اور تاجکستان میں وقت ساتھ ساتھ گزرا۔ تاجکستان کی راجدھانی دوشنبہ میں جس کا پرانا نام استالن آباد تھا۔ بزرگ تاجیک ادیب اور شاعر صدرالدین عینی کا صد سالہ جشن پیدائش تھا۔ ہم لوگ اسی میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ تاجیک زبان دراصل فارسی زبان کا وہ اسٹائل ہے جسے دری کہتے ہیں۔ اس کا لہجہ اور تلفظ تاجکستان، افغانستان اور ہندوستان میں مشترک ہے۔ ہم لوگ مترجم سے بے نیاز ہوگئے تھے۔ اور ٹوٹی پھوٹی فارسی میں باتیں کر رہے تھے۔ فیض نے تقریر بھی فارسی میں کی۔ میں نے اردو میں جس کا فارسی اور روسی ترجمہ ساتھ ساتھ کیا گیا۔

سوویت یونین میں ادیبوں کا جو احترام ہوتا ہے اس کا مجھے پہلے سے اندازہ تھا۔ میں طالسطائی، پوشکن، گورکی وغیرہ کی یادگاریں اور میوزیم دیکھ چکا تھا۔ تاجکستان میں رودکی کا مجسمہ اور صدرالدین عینی کا مزار دیکھ کر جی خوش ہوگیا مزار ایک بڑے اور خوبصورت باغ میں ہے۔ ہندوستان کے کسی شاعر اور ادیب کو ایسی یادگار نصیب نہیں ہوئی۔ اس

کے علاوہ صد سالہ جشن کے موقع پر صدر الدین عینی کے مجسمے کی نقاب کشائی بھی ہوئی۔ یہ ایک عظیم الشان اور فنی اعتبار سے نہایت خوبصورت مجسمہ ہے۔ اور اس کے دونوں طرف تاجکستان کی انقلابی جدوجہد اور آزادی کی تاریخ اس طرح پیش کی گئی ہے کہ آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ یہ عوام کے مجسمے ہیں۔ وہ عوام جن کے لئے عینی نے اپنی ادبی صلاحیتیں وقف کر دی تھیں اور قید خانے کے مصائب برداشت کیئے تھے اور امیر بخارا کے کوڑے کھائے تھے۔ پیکر میں مبتلا عوام اپنی زنجیریں توڑ رہے ہیں۔ اور تاجکستان کا ماضی زندہ ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ فن مجسمہ سازی میں یونان اور روم کے ساتھ اگر کسی ملک کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ سوویت یونین ہے۔ پہلے دو ممالک کا فن قدیم ہے، سوویت کا جدید۔

عینی کے جشن کے موقع پر تقریروں کے علاوہ تہذیبی تقاریب اور دعوتوں میں موسیقی کا خاص انتظام تھا۔ وہاں قدیم اور جدید فارسی غزلیں سننے کو ملیں۔ تاجکستان میں غزل کی گائیکی کا انداز ہندوستان سے مختلف ہے۔ غالباً ہماری گائیکی بہتر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح ہم نے وسط ایشیا کے پلاؤ اور کباب اور قورمے کو بہتر بنا دیا ہے۔ اسی طرح غزل کی نغمہ طرازی کی بھی آرائش کی ہے۔

غزل ہماری زبان کی نہایت خوبصورت صنف سخن ہے اور تم مبارکباد کے مستحق ہو کہ اتنا ہی خوبصورت غزل نمبر نکال رہے ہو۔ اس سے پہلے بھی غزل کے نمبر نکلے ہیں لیکن تم نے جو اہتمام کیا ہے اس سے اس نمبر کی شان بڑھ گئی ہے۔

غزل کے بارے میں دو فقرے بہت مشہور ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ غزل اُردو زبان کی آبرو ہے۔ اور دوسرا یہ کہ غزل نیم وحشی صنف سخن ہے۔ دونوں باتیں بے انتہا مبالغہ آمیز ہیں۔ پہلا فقرہ میرے اُستاد محترم رشید احمد صدیقی صاحب کا ہے جو اقبال کی شاعری کے عاشق تھے۔ اگر اقبال کی شاعری سے غزل خارج کر دی جائے تو اقبال کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ فارسی زبان میں غزل گو حافظ کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ اس مقبولیت میں کوئی دوسرا شاعر حافظ کے قریب نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن مثنوی نگار فردوسی کا درجہ جس نے کبھی غزل نہیں کہی، بلند تر ہے، وہ زیادہ قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔ خود ہمارے یہاں انیس کی شاعری ہے جو غزل کے بغیر بھی عظمت کی حامل ہے۔ اس لیئے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ غزل اُردو زبان کی آبرو ہے۔ لیکن غزل کے بے پناہ حسن سے انکار کفر ہوگا۔ جس طرح ہم اپنے محبوب کو دنیا کی سب سے حسین شخصیت سمجھتے ہیں اسی طرح رشید صاحب نے اُردو زبان کی آبرو کا تاج غزل کے سر پر رکھ دیا۔ ہم اس پر رشید صاحب سے کوئی شکایت نہیں کریں گے۔ صرف اُن کی حسن پرستی کی داد دیں گے۔

لیکن دوسرا فقرہ کہ غزل نیم وحشی صنف سخن ہے۔ ہر اعتبار سے قابل اعتراض ہے۔ جن صاحب نے یہ فقرہ ارشاد فرمایا ہے، وہ نہ تو غزل کے حسن اور لطافت اور بلاغت کو سمجھ سکے اور نہ وحشی اقوام کے فنون کی خوبصورتی کو پہچان سکے۔

آج بھی وحشی اقوام کا رقص اور نغمہ دلوں کو موہ لیتا ہے اور غزل کی یہ نیم وحشی کیفیت اس کے فطری حسن کا اظہار ہے۔
اردو زبان میں غزل فارسی کی روایت سے آئی لیکن اردو غزل نے اس روایت میں کچھ اضافے بھی کئے اور ہماری غزل حسین بھی ہے اور عظیم بھی۔ اور اس حسن اور عظمت کا امتزاج تمہارے غزل نمبر میں ایک جگہ مل جائے گا۔
مجھے اس غزل نمبر کی اشاعت پر اس بات کی بھی خوشی ہے کہ جاں نثار اختر کا ایک ادھورا کام پورا ہو گیا۔ تم تو واقف ہو کہ غزلوں کا یہ انتخاب جاں نثار اختر نے چند سال پہلے کیا تھا۔ اور اس کی اشاعت سے پہلے اُن کا انتقال ہو گیا اس لئے تم نے اچھا کیا کہ اس نمبر کو جاں نثار اختر کے نام سے منسوب کیا ہے۔
وقت گذر جانے کی وجہ سے یہ انتخاب نظر ثانی کا بھی محتاج تھا۔ یہ کام کر کے اور نئی غزلوں کا اضافہ کر کے تم نے اس نمبر کو زیادہ قابلِ قدر بنا دیا ہے۔ شاعروں کی تصویریں اور اُن کی زندگی کے حالات شامل کر کے تم نے اس غزل نمبر کو اور زیادہ کام کی چیز بنا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری تحریر اور رائے سے کسی کو اختلاف پیدا ہو لیکن کوئی تمہاری نیت پر شبہ نہیں کر سکتا۔
مجھے بڑی مسرت ہے کہ فن اور شخصیت کا غزل نمبر نہایت آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے اس کی کامیابی یقینی ہے۔ میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔

تمہارا

سردار جعفری

(علی سردار جعفری)

نیــاز حیدر

غزل کے لئے

میرے شاعر دوست صابر دت نے "فن اور شخصیت" نمبر کا ایک ایسا سلسلہ شروع کیا ہے جو ادبی تاریخ کے ارتقاء میں آنے والے زمانوں تک تمثیلی حیثیت رکھے گا۔ محققین اور طالبانِ ادب کیلئے بے مثال ممد و معاون ثابت ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اس غزل نمبر کو تعلیمی اور ادبی ادارے صابر دت کا ایک گرانقدر عطیہ سمجھیں گے کیونکہ ہر اعتبار سے یہ ایک گرانقدر عطیہ ہے۔

نیاز حیدر

○

صدیوں سے نیا شباب تیرا
تردیدِ خزاں گلاب تیرا
بیداریٔ چشمِ عشق تیرا نام
ہے حسنِ حیات خواب تیرا

○

حافظ و بیدل و غالب کی حسینہ ہے غزل
خاتمِ شعر کا پُر آب نگینہ ہے غزل
جانِ تہذیب ہے سرمایۂ دل، حاصلِ فن
اپنی تاریخِ ثقافت کا دفینہ ہے غزل

○

مرحلوں، منزلوں سے بے پروا
مشکلوں اور غموں سے بے پروا
سائے کی طرح ساتھ آئی غزل
روز و شب کی ضدوں سے بے پروا

○

انتظامِ حرف و لفظ و صوت کو سمجھو غزل
یا کسی دلکش حسیں کی شکل میں دیکھو غزل
زندگی معشوق ہے، معشوق سے باتیں کرو
اور اس معیارِ عشق و حسن سے پرکھو غزل

غزل نمبر

ترتیب

غزل کا مزاج

غزل کا سفر

(ولی سے لیکر ترقی پسند تحریک تک)

پہلا باب

دوسرا باب

تیسرا باب

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

آٹھواں باب

نواں باب

دسواں باب

گیارھواں باب

مئے افرنگ - در جام سفال ہندی

(اردو اور فارسی کے یوروپین شعراء)

مرتب — منظہر حسین قیصر

آج کی غزل

مرتب صابر دت

ہیں اور بھی دُنیا میں...

مرتب حسن کمال

زبانِ خلق

صابر دت ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے یونیورسل ڈائن آرٹ لیتھو پریس، ۲۳ نورجی اسٹریٹ ٹھاکردوار، بمبئی ۲ اور اجمل پریس بے بے اسپتال کا ناکہ بمبئی ۳ سے چھپوا کر ۱۵، چھپرا بلڈنگ، ادھوداس پاستہ روڈ، بمبئی ۱۴ سے شائع کیا۔

میرا صفحہ

پڑھنے والوں کے نام

ہاں تو آپ کو "کملیشور نمبر" پسند آیا.... شکریہ۔

تقریباً سب ہی قارئین نے اس نمبر کو سراہا اور حسب سابق ہمیں مبارکباد کے خطوط لکھے۔ "کملیشور نمبر" کو پڑھنے کے بعد باشعور قارئین نے یک زبان ہو کر کہا کہ برصغیر میں پہلی بار کسی دوسری بھاشا کے ادیب پر اردو کے کسی رسالے نے ایک شاندار نمبر نکال کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ بھئی ایسی کوئی بات نہیں۔ بات در اصل یہ ہے کہ مجھ سے پہلے کے جتنے بھی مدیر (یا رسالے) تھے (یا ہیں) وہ کسی نہ کسی گروپ، ازم، گروہ بندی یا سیاست سے وابستہ تھے (یا ہیں) ایسی بات میرے یا میرے رسالے کے ساتھ ہرگز نہیں ہے۔ میں ہر قسم کے تعصب کو پس پشت ڈال کر اردو کے لئے کام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وقت نے ساتھ دیا تو میں اور بھی کئی زبانوں کے فنکاروں کو متعارف کرا کے اردو زبان کے کینوس کو وسیع کرنے کی کوشش کروں گا۔

اعلان کے مطابق "غزل نمبر" آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ "غزل نمبر" کا خیال میرے دماغ میں کیسے اور کیوں آیا اس کی ایک داستان ہے سن لیجئے ..... میں یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو بمبئی وارد ہوا (جیسا کہ پنجاب کا ہر نوجوان اس "سومناتھ کے مندر" پر حملہ کرنے اور فتح کرنے کی غرض سے آتا ہے۔) یہاں کی مشہور و معروف شخصیتوں میں ہندوپاک کے مقبول شاعر ساحر لدھیانوی صاحب سے میری پرانی ملاقات تھی۔ چنانچہ میں اکثر ان سے ملنے کی غرض سے ان کی قیامگاہ "پرچھائیاں" جایا کرتا تھا۔

مجھے بمبئی شہر بڑا عجیب سا لگا۔ جس سے ملئے فون کر کے ملئے۔ وقت لے کر ملئے۔ ورنہ صعوبتیں جھیلئے۔ کبھی پتہ چلا کہ جن سے آپ ملنے کے متمنی ہیں وہ یا تو کسی پروڈیوسر کی میٹنگ میں ہیں، کہانی پر بیٹھے ہیں یا سچویشن پر گنگناتے ہوئے گانا سوچ رہے ہیں۔ یا پھر باتھ روم میں مقید ہیں۔ آدمی باتھ روم میں بھی کئی گھنٹے گذارتا ہے یہ میں نے اسی شہر میں دیکھا ہے۔ الغرض یہاں کی شامیں میرے لئے عذاب بننے لگیں کیونکہ میں دلی میں ہر شام اپنے شاعر و ادیب دوستوں کے ساتھ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر سیخ کباب کھاتا اور شعر و ادب پر باتیں سنتا اور کرتا تھا۔ اسی لئے میں سوچنے لگا کہ یہ بڑا ہی بے مروت اور عجیب شہر ہے یہاں کوئی دوست نہ کوئی دشمن اور نہ ہی ادبی حلقے میں کوئی ہلچل۔ یہ عجیب بات ہے کہ بغیر غرض کے یہاں پر کوئی کسی سے ملنے یا بات کرنے کو تیار ہی نہیں۔ بغیر شوکت اور دولت کے یہاں آدمی کی حیثیت صفر ہے۔ تعجب ہے آدمی آدمی کو پہچاننے سے انکار کرتا ہے۔ لیکن میں ساحر صاحب کو پہچانتا تھا اس لئے اُن کے

پاس آنے جانے کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ انھیں کے ہاں میری ملاقات جاں نثار اختر صاحب سے ہوئی جو واقعی ایک درویش قسم کے آدمی اور قادر الکلام شاعر تھے۔ پُرانے زمانے کی شرافتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے اس شہر میں فقیرانہ انداز سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ خود کو زندہ رکھنے کے لئے اپنا فن بیچ رہے تھے۔

اختر صاحب باندرہ میں رہتے تھے۔ میں بھی اُن کے فلیٹ کے قریب ہی ایک ہاسٹل میں رہتا تھا اور ایک چارپائی کا کرایہ ۴۵ روپے ماہوار دیتا تھا۔ اختر صاحب سے ملاقات کے بعد یہ کرایہ اکثر وہی ادا کر دیتے تھے۔ بس یوں سمجھئے کہ میں اختر صاحب کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ رات دن کا ساتھ رہتا۔ وہ جہاں بھی جاتے تھے اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ میں ان کی زندگی کے تقریباً ہر مسئلہ سے واقف تھا۔ وہ مجھ سے کوئی بات چھپاتے نہیں تھے۔ وہ جب بھی پریشان ہوتے تو میں کہتا "اختر صاحب آپ کیوں فکر کر رہے ہیں خدا بہت بڑا ہے اسے آپ سے زیادہ آپکی فکر ہے۔" میری اس بات پر وہ اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے اور مسکراتے۔

میں اختر صاحب کے بتائے ہوئے سارے کام دن کو نپٹا کر شام کے چھ بجے ان کے پاس پہنچ جایا کرتا تھا۔ شام کو ندا فاضلی، حسن کمال، محمود چھاپرہ، باقر مہدی، عزیز قیسی میں سے کوئی نہ کوئی وہاں ضرور ہوتا تھا۔ اختر صاحب کے پاس پیسے نہ ہوتے تو چندہ اکٹھا ہو جاتا یا پھر اُدھار شراب منگوائی جاتی۔ بہرکیف محفل جمتی۔

ایک شام حسب معمول میں ان کے گھر گیا کہنے لگے "بھئی ہم آج تمھیں ایک خوشخبری سنائیں، سردار جعفری نے ہمیں ایک کام دیا ہے۔" میں نے کہا "کیا کام؟" کہنے لگے "ہم اُسے ایک کتاب "غزل کا سفر" کے عنوان سے دلّی سے لیکر ترقی پسند شعراء تک انتخاب کر کے دیں گے اور وہ ہمیں "ہندوستانی بک ٹرسٹ" سے "اُتنے" پیسے دلوائے گا۔ ہم تو ایڈوانس بھی لے آئے۔ آخر پڑھے لکھے آدمی ہیں بھئی۔" یہ کہہ کر وہ بالوں پر ہاتھ پھیر کر مسکرانے لگے پھر انھوں نے کہا "اب اس میں ایک کام تمھیں کرنا ہوگا۔" میں نے کہا "کیا کام؟" وہ بولے "میں جو کتابیں بتاؤں وہ مجھے لائبریری سے لا کر دے دیا کرو، تبھی ہو سکے گا۔" میں نے کہا یہ کام تو میں کر ہی دونگا مگر اختر صاحب یہ انتخاب ترقی پسند شعراء تک ہی کیوں؟" کہنے لگے "تم سمجھتے نہیں ہو، ترقی پسند والے اپنے علاوہ کبھی کسی کا کچھ کام کیا ہے؟" میں ان کی یہ بات سن کر خاموش ہو گیا کیوں کہ معاملہ پیسوں کا تھا۔ الغرض میں حسب وعدہ اُن کو کتابیں لا کر دیتا رہا اور وہ کام کرتے رہے۔ آخرش ۱۰؍جون ۱۹۷۱ء کو میں "غزل کا سفر" کے مسودے کی پوری فائل سردار جعفری صاحب کو دے آیا۔ آج ساتویں برس، جبکہ اختر صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں میں انھیں کے مرتب کردہ مسودے کو زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اختر صاحب نے جانے مجھ میں کیا دیکھا کہ ایک رات تین چار پیگ پینے کے بعد مجھ سے بولے "صابر میں نے ایک کام اپنے لئے زندگی میں سوچا تھا سو وہ میں نہ کرسکا۔ میری خواہش ہے اس کام کو تم کر لو۔" میں نے کہا۔

"کیا کام؟" کہنے لگے "تم ایک ایسا رسالہ نکالو جس کا ہر شمارہ صرف ایک ہی ادبی شخصیت پر مشتمل ہو، پانچ چھ برس کے بعد پڑھے لکھے کہلاؤ گے اور صدارتی خطبے پڑھو گے۔" میں نے کہا "اختر صاحب بات تو اچھی ہے۔ اب یہ بتائیے کہ رسالہ کا نام کیا ہونا چاہیئے۔ وہ فوراً بولے "بھئی! "فن اور شخصیت" اور کیا؟۔"

میں نے دوسری صبح ہی ڈکلریشن بھر دیا اور آج آپ کے سامنے مُدیر "فن اور شخصیت" کی حیثیت سے متعارف ہوں۔ مجھے اِس وقت اُس رات کے وہ لمحات یاد آرہے ہیں جب انھوں نے انتقال سے آٹھ دن پہلے اپنے بیٹے جاوید کو اپنے نمبر پر آٹوگراف دیتے ہوئے لکھا تھا۔
"جادو بیٹے کے لیئے۔
"جب ہم نہ رہیں گے تو بہت یاد کرو گے"

میں نے اپنی ذاتی کاپی پر آٹوگراف نہیں لیئے۔ خیال تھا جب چاہوں گا لے لوں گا ..... اچھا خدا حافظ۔ یار زندہ، صحبت باقی۔ اب "نیفی نمبر" میں ملاقات ہوگی ---- آپ کا

صابر دت

نوٹ :- میں محترمہ قرۃ العین حیدر، حسن کمال اور مظہر حسین قیصر کا شکر گذار ہوں جنہوں نے میری درخواست پر اپنا قیمتی وقت صرف کر کے غزل نمبر کے لئے مختلف ابواب مُرتّب کیئے۔

محترمہ قرۃ العین حیدر نے اپنے ذخیرۂ کتب میں سے "سفینۂ غزل" (مولفہ سید محمد عباس) اور "جو ئبار" (مولفہ بیگم ہما اخلاق حسین) مجھے عنایت کیں۔ یہ دونوں قابل قدر کتابیں بیس سال قبل پاکستان میں چھپی تھیں۔ یہ کتابیں "غزل نمبر" کی ترتیب میں معاون ثابت ہوئیں۔ سید محمد عباس صاحب کے تیار کیئے ہوئے سلسلۂ تلامذہ کے شجرے مع مصنّف کے تعارفی نوٹ، شکریے کے ساتھ شامل کیئے جا رہے ہیں۔ محترمہ حیدر صاحبہ جو کہ خود بہت اچھی مصوّر ہیں، "غزل نمبر" کے سرورق کے لئے فارسی، اُردو شاعری کی ایبجری کا خاکہ تیار کر کے ہونہار آرٹسٹ جلیل سے ایرانی مغل میناتور کے انداز میں بنوایا۔

اور میں فلمی دنیا کے صفِ اوّل کے کہانی کار سلیم جاوید کا بھی شکر گذار ہوں جنہوں نے اِس خوبصورت "گلدستۂ غزل" کو آپ تک پہنچانے میں میری ہر طرح مدد کی۔

(مُدیر)

....

جاں نثار اختر کے نام!

مدتوں بعد اٹھائے تھے پرانے کاغذ
ساتھ تیرے مری تصویر نکل آئی ہے

صابر دت
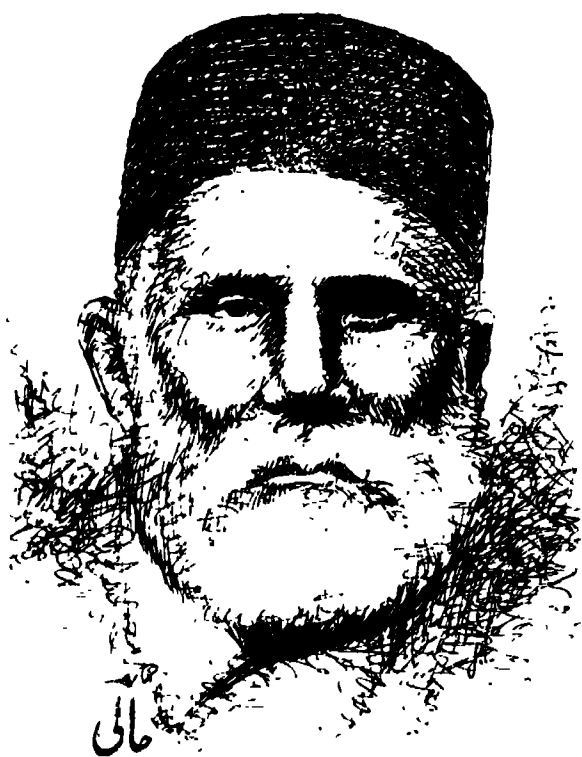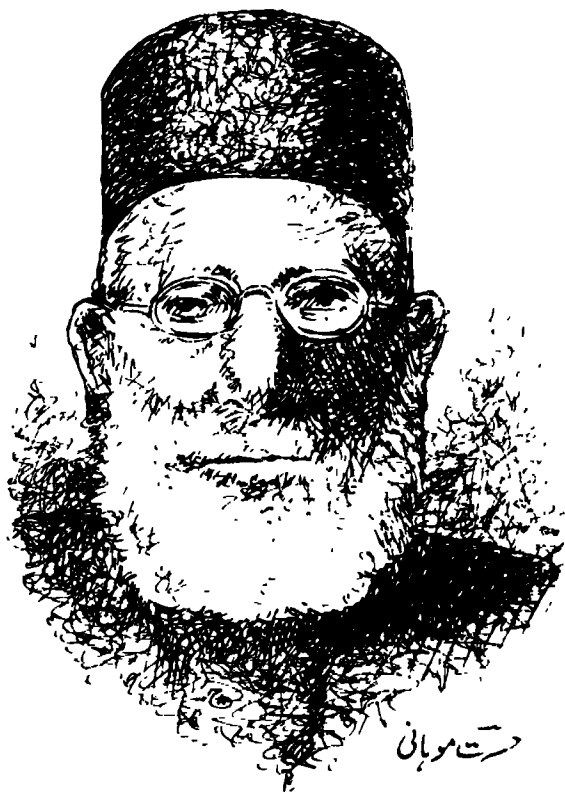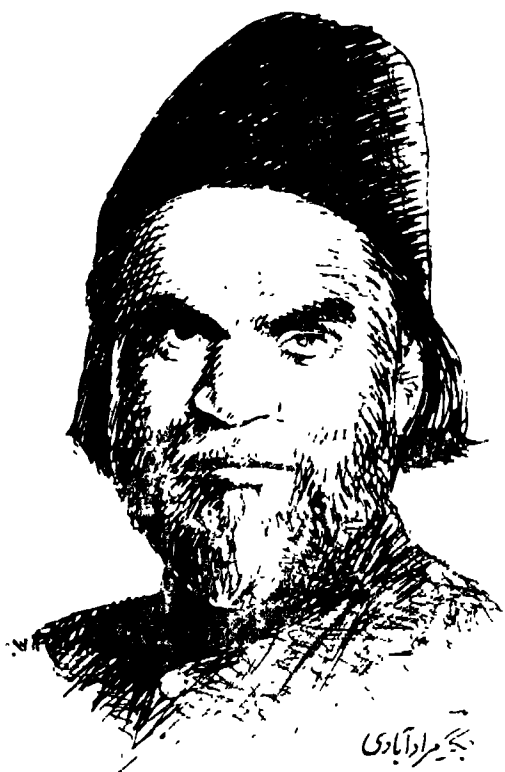
غالب

اقبال

مصحفی

مومن

حالی
داغ
شاد عظیم آبادی

مضطر خیرآبادی
اصغر گونڈوی
حسرت موہانی

فانی بدایونی

جگر مرادآبادی

مرزا یاس یگانہ

حامد سعید خاں حامد

جوش ملیح آبادی
حفیظ جالندھری
فراق گورکھپوری
اختر شیرانی

میراجی
پنڈت ہری چند اختر
احسان دانش
عبدالحمید عدم

نیاز حیدر
صوفی تبسم
کالیداس گپتا رضا

فیض
معین احسن جذبی
مخدوم محی الدین
مجاز
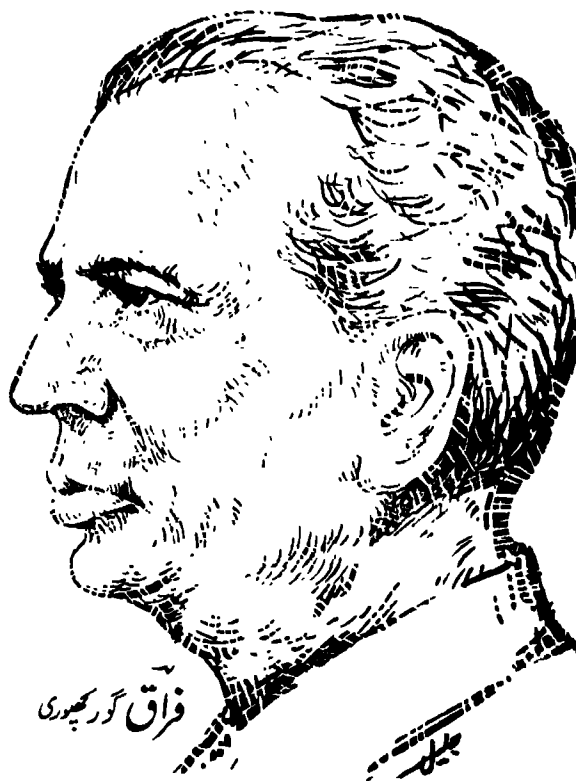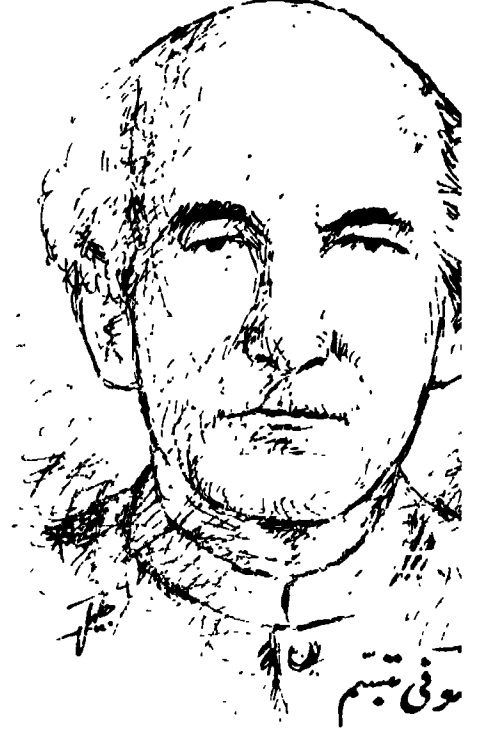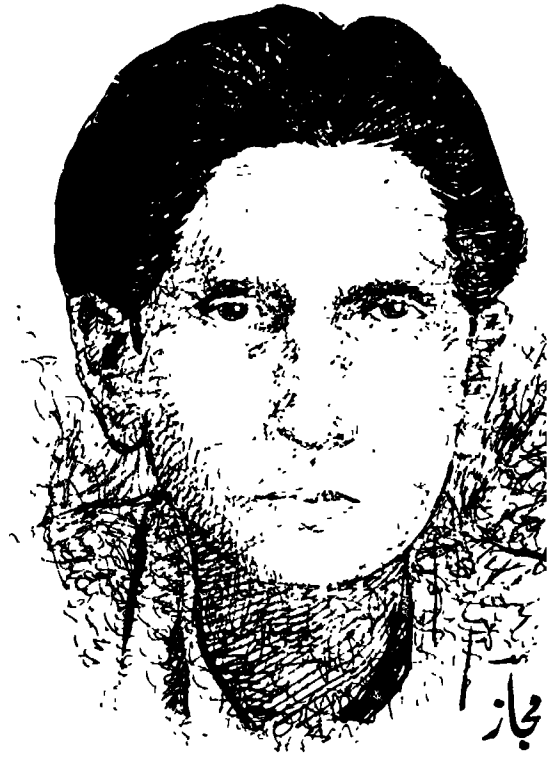
مجروح سلطانپوری
احمد ندیم قاسمی
غلام ربانی تاباں
ساحر لدھیانوی

قتیل
سلام مچھلی شہری
پریم وار برٹنی
جگناتھ آزاد

شکیب جلالی
ناصر کاظمی
احمد فراز

عزیز قیسی
ندا فاضلی
حسن کمال
ڈاکٹر سلمان اختر

جلیل
نذر واراوالا
قریش واراوالا
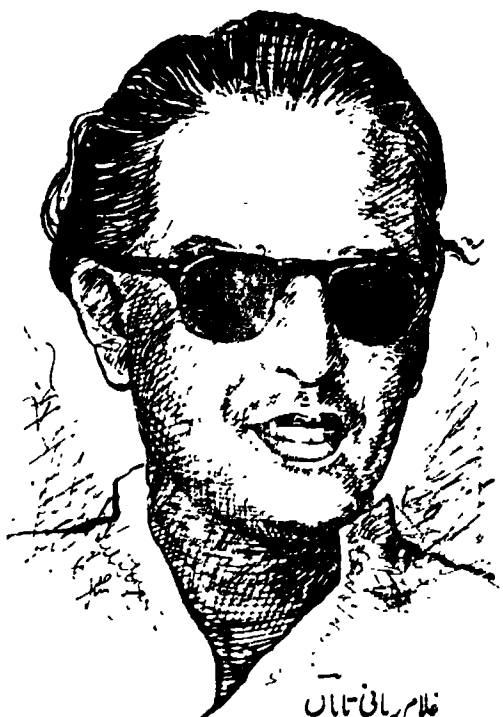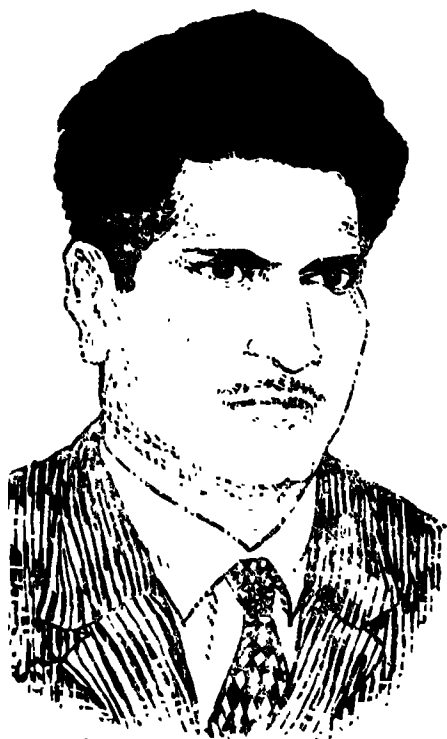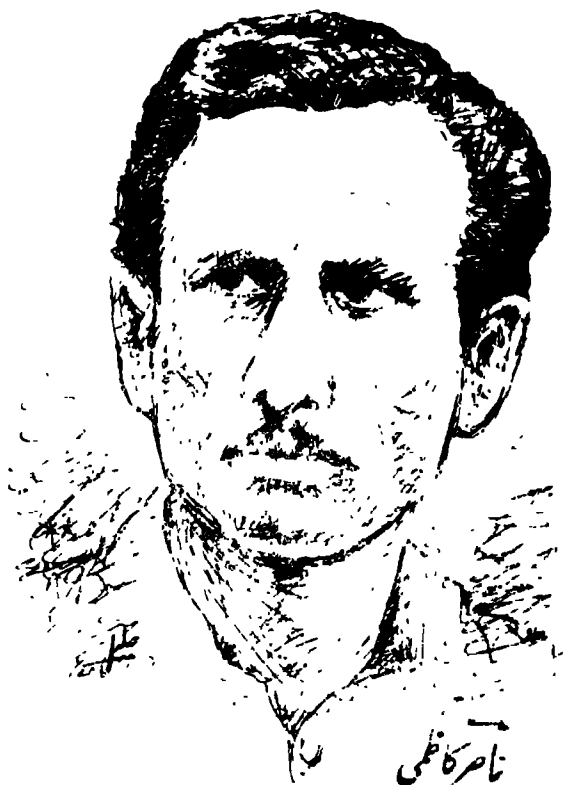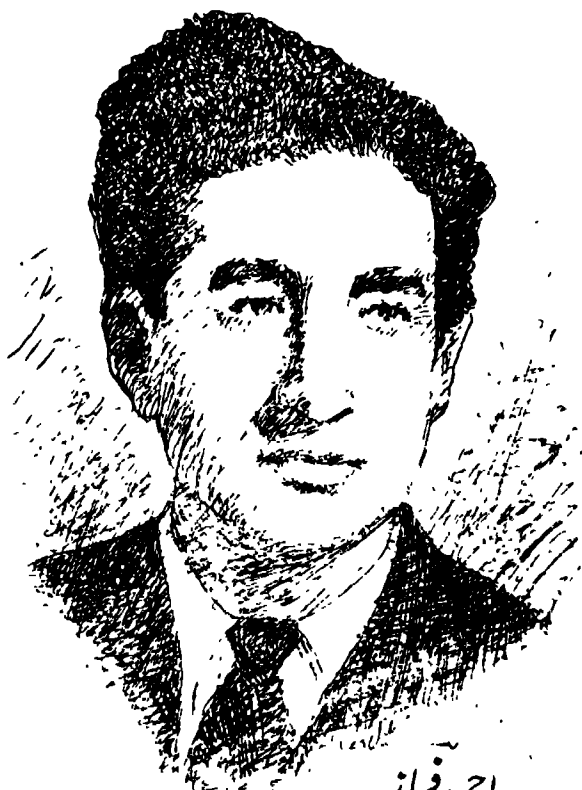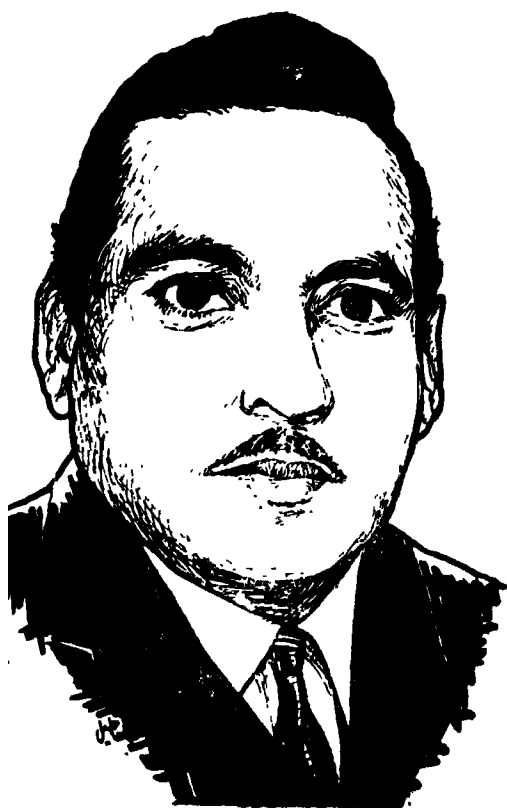
سردار جعفری

غزل کا مزاج

خواجہ الطاف حسین حالی

غزل میں جیسا کہ معلوم ہے کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا۔ اِلّا ماشاء اللہ بلکہ جُدا جُدا خیالات الگ الگ بیتوں میں ادا کئے جاتے ہیں۔ اس صنف کا زیادہ تر رواج موجودہ حیثیت کے ساتھ اوّل ایران میں اور کوئی ڈیڑھ سو برس سے ہندستان میں ہوا ہے۔ اگرچہ غزل کی اصل وضع جیسا کہ لفظِ غزل سے پایا جاتا ہے محض عشقیہ مضامین کے لئے ہوئی تھی۔ مگر ایک مدت کے بعد وہ اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہی۔ ایران میں اکثر اور ہندستان میں چند شاعر ایسے بھی ہوئے ہیں جنہوں نے غزل میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف اور اخلاق و مواعظ کو بھی شامل کر لیا ہے۔ لیکن غزل کی اصلاح تمام اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ اسی لئے ہمارے نزدیک شعراء کو سب سے پہلے غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے مگر غزل کی اصلاح جس قدر ضروری ہے اسی قدر دشوار بھی ہے۔ غزل میں جو عام دلفریبی ہے اصلاح کے بعد اس کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔

پروفیسر حامد حسن قادری

غزل کے معنی ہیں عشق و جوانی کا ذکر کرنا۔ شاعری میں غزل اس نظم کو کہتے ہیں جس میں حسن و عشق، اخلاق و تصوف وغیرہ مضامین ہوں اور ہر شعر الگ مضمون کا ہو۔ اردو شاعری فارسی شاعری کی تقلید ہے اور فارسی عربی کی۔ عربی قصائد کی تشبیب میں غزل بھی شامل تھی۔ یعنی قصیدوں کی تمہید میں عاشقانہ مضامین لکھتے تھے اور اس کو غزل و تغزل کہتے تھے لیکن یہ تمہید غزل مسلسل ہوتی تھی۔ فارسی والوں نے اس ٹکڑے کو غزل کے نام سے مستقل صنفِ شاعری بنا لیا۔

جس وقت اُردو زبان نئی اور بول چال میں آنی شروع ہوئی اسی وقت سے فارسی شاعروں نے ایسی غزلیں کہنی شروع کردی تھیں جن کا آدھا مصرع فارسی آدھا اردو یا ایک مصرع فارسی ایک اردو ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت امیر خسروؒ دہلوی کی بعض غزلیں اسی طرح کی موجود ہیں۔

ڈاکٹر مسعود حسن رضوی

میں غزل کی خوبیوں کا دل سے قائل ہوں مگر نہ غزل گویوں پر ایسا فریفتہ ہوں کہ شاعر اور متشاعر میں امتیاز نہ کر سکوں، نہ غزل کا ایسا شیفتہ ہوں کہ مسلسل نظموں سے لطف اندوز نہ ہو سکوں اور اردو شاعری میں جو نئے نئے تجربے کئے جا رہے ہیں ان میں سے بعض چیزوں کو انفرادی طور پر غلط یا مضر سمجھنے کے باوجود مجموعی طور سے ان کو اردو شاعری کی حیات کے آثار اور ترقی کے اسباب سمجھ کر ان کی قدر کرتا ہوں۔ مگر ہمارے وہ شاعر جو قدیم اصنافِ سخن میں دادِ سخنوری دے چکے ہیں اور کمالِ شاعری صرف کر چکے ہیں ان کے کارناموں کو غلط فہمی کی بدولت مٹتے نہیں دیکھ سکتا۔

نیاز فتحپوری

دور حاضر کی غزل گوئی خواہ وہ لکھنؤ میں ہو یا لکھنؤ سے باہر بالکل دہلوی رنگ کی ہے اور اب عام احساس اس امر کا ہو چلا ہے کہ تغزل کا تعلق صرف جذبات سے ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ تاثرات کا نتیجہ نظر آئے ۔

غزل میں سب سے پہلی آمیزش فلسفہ و تصوف کی ہوئی اور اس میں شک نہیں کہ جس نے اول اول غزل گوئی میں یہ مذہب اختیار کیا وہ سخت "ناکافر" انسان تھا جو ہمارے کرۂ زمین کے "دلبران مہوش" کی کارگاہ حسن و محبوبی کو ہمیشہ کیلئے ویران کر گیا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

میر صاحب کے زمانے سے لیکر حسرت و جگر کے موجودہ دور تک اردو غزل کے اسلوب پر برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن ان کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ اس سے صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ صنف سخن اپنی اصل حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف حالات سے مطابقت کی صلاحیت رکھتی ہے جو اس کے جاندار ہونے کی دلیل ہے ۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

غزل اپنی ترکیب و ترتیب کے لحاظ سے نہایت خوشگوار امتزاج کی متقاضی ہے ۔ غزل حسن کا ایک ایسا نمونہ ہے جس میں ذرا سا بے اعتدالی بھی ناگوار محسوس ہونے لگتی ہے ۔

سید اعجاز حسین

موجودہ غزل میں ایسے مضامین کافی آنے لگے ہیں جن میں سائنس کے ان پہلوؤں پر زیادہ توجہ کی گئی ہے جو تخلیق عالم یا جذبات کی طرف اشارہ کرتے رہتے ہیں جو ہمارے نیم شعوری احساسات کی لہروں سے حرکات و سکنات کا پتہ دیتے رہتے ہیں ۔ نفسیاتی تحلیل اور اس کے اثرات کا نتیجہ اردو غزلوں میں کچھ کم جگہ نہیں پا رہا ہے ۔ نظموں کی طرح یہاں بھی اجرام فلکی اور خوشگوار یا ناخوشگوار مناظر قدرت کو بڑی خوبی کے ساتھ حقیقی و جذباتی رنگ دیکر پیش کیا جا رہا ہے ۔ یہ عملی خصوصیات ہمارے نزدیک بڑی خوبی کے ساتھ غزل کی دنیا میں معنوی حیثیت سے ایک خاص اضافہ ہیں جنکا وجود غزل کی تجدید و بقا کا ضامن ہو سکتا ہے ۔

آل احمد سرور

ولی کے وقت سے لیکر غالب اور ان کے معاصر شعراء تک تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوتے ہیں ۔ اس عرصہ میں غزل

نے تکمیل فن کے تمام مراحل طے کیئے اور وہ ہماری شاعری کی سب سے اہم اور سب سے مقبول صنف بن گئی۔ کہا جاتا ہے کہ آزاد اور حالی نے سب سے پہلے غزل کے خلاف بغاوت کی مگر در اصل آزاد اور حالی غزل سے باغی نہ تھے، اس غزل کے خلاف تھے جو رسمی، محدود اور مصنوعی ہو گئی تھی۔

سید احتشام حسین

اردو غزل گوئی نیم وحشی صنف سخن ہو یا محض روایت پرستی مگر کبھی کبھی اس تار کی ایسے شعلے بھی لرزا ٹھتے ہیں کہ دل کی فضا کچھ دیر کے لئے بے قرار ہو جاتی ہے کیوں کہ ہمارے وجدان کی تعمیر میں قدیم روایات کا بہت شاندار حصہ ہے۔ غور کیجئے تو غزل صرف داخلی شاعری ہے یہی نہیں اسے عقل سے گہرا تعلق ہے اور یہی امتزاج اچھا غزل کو پیدا کرتا ہے۔ اس لئے تصور سے چاہے تغزل ‏ کا مفہوم مجروح ہوتا ہو یا بدلتا ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ اچھا غزل گو عقل کے مسائل سے بہت زیادہ دور نہیں رہتا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں ارتقائی صلاحیتیں تو موجود ہیں لیکن ان ارتقائی صلاحیتوں کا احساس ذرا مشکل ہوتا ہے۔ زندگی کی ہر تبدیلی کے زیر اثر ارتقائی کیفیت غزل میں پیدا اثر دکھاتی ہے۔ خارجی طور پر زندگی میں جو تغیر ہوتا رہتا ہے اس کے اثرات غزل میں پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کا عکس اس میں صاف نظر آتا ہے وہ بدلتی ہوئی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے خود اپنے آپ کو بھی بدل دیتی ہے۔

وقار عظیم

اردو غزل کی دو سوا دو سو برس کی زندگی خود ایک ایسی شہادت ہے جس سے غزل کی ارتقائی صلاحیتوں کا یقین راسخ پیدا ہوتا ہے۔ ولی سے لیکر حسرت اور جگر بلکہ حفیظ ہوشیارپوری اور فیض تک زمانے کے ان گنت اونچ نیچ اور انقلاب کے ساتھ غزل کو جذب و سلوک کی نہ جانے کتنی منزلیں طے کرنی پڑیں لیکن ہر منزل میں غزل نے اپنی انفرادیت اور امتیازی شان برقرار رکھی اور ہر دور میں کے سیاسی، سماجی اور ذہنی فضا کو اپنے اندر سمو کر برابر آگے بڑھتے ہوئے زمانے کے ساتھ آگے بڑھتی رہی لیکن اس طرح کہ اپنی آن بان میں سر مو فرق پیدا نہیں ہونے دیا اور زمانہ کچھ سے کچھ بنا لیکن غزل غزل ہی رہی۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

غزل میں دو عناصر ایسے ہیں جنھوں نے اب تک غزل کا سا نفوذ دیا ہے جو بڑی حد تک غزل کو بحیثیت ایک صنفِ شاعری زندہ رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ ایک شدید قسم کی داخلیت اور دوسرے اس داخلیت سے براہِ راست متعلق ایک خاص قسم کی اشاریت جسے اب غزل کی رمزیت کا نام دیا جاتا ہے۔

سیّد باقر حسین

انسانی تجربوں اور تصورات کے بیان میں افادیت، تجرید اور ضرب المثل کی کیفیت پیدا کرنا صرف غزل کی تکنیک میں ممکن ہے۔ میرے خیال میں ایسی تکنیک کی ضرورت ہمیشہ رہے گی بلکہ موجودہ زمانے کی عدیم الفرصتی اس بات کی متقاضی ہے کہ یہ تکنیک دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں میں بھی اختیار کر لی جائے۔ اگر ہماری غزلوں کے کامیاب تجربے غیر زبانوں میں ہونے لگیں تو عجب نہیں کہ دوسری زبانوں میں بھی غزل گوئی ہونے لگے۔

فیض احمد فیض

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دُور دراز

یوں تو اس شعر میں کئی لفظی رعایتیں موجود ہیں جنھیں روایتی غزل سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن شعر کی خوبی کا انحصار ان لفظی رعایتوں پر بہت کم ہے۔ اس کا انحصار اس دھندلی سی جذباتی فضا پر ہے جو الفاظ کے اصوات و معانی مل کر پیدا کرتے ہیں۔ اسی فضا میں تصورات کے کئی ٹکڑے پھڑپھڑاتے ہوئے اِدھر سے اُدھر نکل جاتے ہیں اور ہاتھ نہیں آتے۔ کئی جالے کئی نقشے، کئی رنگ دھیرے دھیرے نظر کے سامنے اُبھرتے ہیں اور مکمل ہونے سے پہلے محو ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف الفاظ کی کٹیلی تراش اور تیکھا پن اور دوسری طرف معانی کی وسیع اشاریت۔

یوں تو یہ امتزاج ہر اچھے کلام میں لازمی ہے لیکن غزل کا اختصار اور جامعیت اس کی خاص طور سے متقاضی ہے۔ ہر چند سعدی سے حسرت موہانی تک ہر بڑے غزل گو کا اپنا اپنا رنگ، اپنے اپنے مضامین، اپنا اپنا طریقِ اظہار ہے لیکن اس بوقلمونی کے باوجود جزوِ اعظم یہ نیم محسوس غنائیت ان سب کے کلام کا خاصہ ہے اور اسی غنائیت کو ہم نے غزل کے مزاج سے مخصوص کر لیا ہے۔

اُردو شاعری کی ترقی میں درباروں کا حصّہ

شاہانِ گولکنڈہ و بیجاپور:— اگرچہ اُردو شاعری کی ابتداء دکن سے ہوئی لیکن دلی والے جنہوں نے اس فن کو کمال تک پہنچا دیا، دکنی شعراء کی کوششوں کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اِک چیز لچری یہ زبان دکنی تھی

گولکنڈہ کے کئی بادشاہ خود شاعر تھے اور شاعروں کے قدردان۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء — ۱۶۱۱ء) کا کلیات شاید اُردو زبان کی پہلی تصنیف ہے جو اب مکمل صورت میں موجود ہے۔ ان کے کلام پر ہندی شاعروں کا اثر غالب تھا۔ محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ بھی شاعر تھے۔ گولکنڈہ کے دربار میں ابنِ نشاطی، غواصی اور وجہی تھے جن کی تصانیف اُردو زبان کے اولین نمونوں میں سے ہیں۔

بیجاپور کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ (۱۵۸۰ء — ۱۶۲۶ء) اور علی عادل شاہ دوم کے زمانے میں علم و ادب کا چرچہ تھا۔ اول الذکر کے دربار میں فارسی کے مشہور مصنف ظہوری بھی تھے۔ جنہوں نے بادشاہ کی لکھی ہوئی موسیقی کی کتاب کی تمہید لکھی جو "سہ نثر ظہوری" کے نام سے مشہور ہے اور اصل کتاب سے کہیں زیادہ مقبول ہوئی۔

شاہانِ دہلی:— اردو شاعری کے عروج کے وقت دلی کی سلطنت تباہ ہو چکی تھی لیکن آخری شاہانِ مغلیہ باوجود اپنی مجبوریوں کے علم و ادب کی پرورش کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض خود شاعر تھے اور ان کے دربار میں دلی کے اکثر نامور شعراء جمع رہتے تھے۔ شاہ عالم ثانی کے دیوانِ اُردو اور دیوانِ فارسی دونوں موجود ہیں۔ ایک افسانوی مثنوی مضمونِ اقدس اور وہ قصیدہ جس میں غلام قادر کے مظالم کا تذکرہ ہے مشہور ہیں۔ ان کے دو صاحبزادگان اکبر شاہ ثانی اور مرزا سلیمان شکوہ بھی شاعر تھے جن میں سے آخر الذکر کا قیام عرصہ تک لکھنؤ میں رہا جہاں مصحفی، انشا اور دوسرے شعرا کی سرپرستی فرماتے رہے۔

دلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر اردو کے مشہور شعراء میں سے تھے۔ ان کا کلام پاکیزہ ہے جس میں تصوف اور اخلاق کے مضامین بہایت خوبی سے بیان کئے گئے ہیں۔

دربارِ اودھ :۔ دہلی کی تباہی کے بعد اکثر شعراء نے لکھنؤ کا رُخ کیا۔ شاہانِ اودھ علم و ادب کے قدرداں تھے۔ ان میں سے اکثر خود شاعر تھے۔ نواب آصف الدولہ جو اپنی خیرات اور سخاوت کے لئے مشہور ہیں، آصف تخلص کرتے تھے اور میر سوز سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ کلام صاف اور شستہ ہے ؎

جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں
خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں

ان کے صاحبزادے وزیر علی جو جلد ہی سلطنت سے معزول کر دیئے گئے تھے۔ شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کا ایک قطعہ حسبِ حال مشہور ہے ؎

جوں سبزۂ رہ گزر سے اُگتے ہی پیروں کے تلے ہم
اس گردشِ افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم

نواب سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر اور دوسرے بادشاہ بھی اسی طرح شاعری سے ذوق رکھتے تھے لیکن آخری بادشاہ واجد علی شاہ جو اس زمانے کے حالات کے زیرِ اثر حکومت سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے فنونِ لطیفہ میں سب سے زیادہ دخل رکھتے تھے۔ موسیقی کے علم سے پوری طرح واقف تھے۔ شاعری میں اسیر کے شاگرد تھے اور اختر تخلص کرتے تھے۔ غزلوں کے علاوہ ایک مثنوی حُزنِ اختری جس میں اپنے مصائب بیان کئے ہیں اور کچھ مرثیے مشہور ہیں۔ ایک رسالہ جوہرِ عروض بھی ان کے نام سے منسوب ہے۔ آپ نے مدت کلکتہ میں بسر کر کے وہیں انتقال کیا ؎

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالہ میں
لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

رامپور :۔ جب لکھنؤ میں شعر و شاعری کے قدردان مٹ گئے تو داغ اور امیر مینائی نے محفلِ سخن رامپور اور حیدر آباد میں آراستہ کی۔ دہلی کی قربت کے باعث رامپور میں پہلے ہی علم و ادب کا چرچا تھا۔ نواب یوسف علی خاں (وفات ۱۸۶۵ء)، ناظم تخلص کرتے تھے۔ پہلے حکیم مومن خاں اور پھر مرزا غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کا کلام پاکیزہ ہے جس سے اُن کی خوش ذوقی کا پتہ چلتا ہے۔ نواب کلب علی خاں نواب امیر مینائی سے اصلاح لیتے تھے ؎

بھلا کیا خاک سوئے چین سے وہ کنجِ مرقد میں
رہا جو جس کے سر کا تکیہ دوشِ نازنیں برسوں

عجب حسرت سے دیکھا ہے سوئے جاناں دمِ آخر
رہے گی یاد اس کو بھی نگاہِ واپسیں برسوں

ہوئے ہوں گے کسی سے وصل کے اقرار بھی شاید
رہا ہم سے تو اس بے رحم کا فرکی نہیں برسوں
نصیبوں میں جو لکھی ہے بُرائی وہ نہ جائے گی
اگر رگڑوں گا در پر کعبہ کے نقشِ جبیں برسوں

اس زمانے میں رامپور میں بڑے بڑے مشاعرے ہوتے تھے جن میں تمام ہندستان کے شعراء جمع ہوا کرتے تھے۔

حیدر آباد:— اردو ادب دکن سے شروع ہوا تھا اور انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں جب ملک کے دوسرے حصوں میں اس کی خاطر خواہ پرورش نہ ہوئی تو بالآخر اس نے دوبارہ دکن ہی میں پناہ لی۔ میر محبوب علیخاں خود شاعر تھے اور علم وادب کے بڑے قدرداں۔ عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالترجمہ کے ذریعہ اردو زبان نے جو ترقی کی اس سے سب واقف ہیں۔ انجمن ترقی اردو کا قیام بھی ایک عرصہ تک حیدر آباد ہی میں رہا۔ اس کے زیر اہتمام بہت سی پرانی نایاب کتابیں شائع ہوئیں۔

داغ، جلیل اور آخر میں جوش ملیح آبادی جیسے شعراء کے قیام سے اس محفل کی رونق قائم رہی۔ داغ کے شاگرد ہندستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے اور ان کے ذریعہ اردو شاعری کو جو فروغ حاصل ہوا وہ کسی بیان کا محتاج نہیں۔

لکھنؤ، رامپور، حیدر آباد کے علاوہ فرخ آباد، مرشد آباد، ٹونک، عظیم آباد، الور، منگرول اور بہت سی چھوٹی ریاستوں میں اُمراء اور تعلقہ داروں کے یہاں شعر وسخن کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ غدر کے بعد دلی کے ارباب کمال کو جہاں جگہ ملی اور کوئی قدرداں مل گیا وہیں رہ گئے ؎

دلّی بگڑ کے بن گئیں اکثر ولایتیں
جس گھر میں دیکھو لوٹ اسی اُجڑے گھر کی ہے
(منیر)

مشاعرے

مشاعروں کا رواج بھی اردو شاعری کی ایک خصوصیت رہا ہے۔ آجکل مشاعروں میں عموماً ٹکٹ لگتے ہیں۔ اور مشاعرے چندہ جمع کرنے کے لئے منعقد کئے جاتے ہیں۔ لیکن کسی زمانے میں ان جلسوں کی حیثیت صرف ادبی محفلوں کی تھی۔ مشاعروں کے آداب بڑے سخت ہوتے تھے۔ اساتذہ کا کلام بڑی عزت و احترام سے سنا جاتا تھا۔ اور نئے شعراء کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ ساتھ ساتھ اس بات کے لئے تیار رہتے تھے کہ اگر کوئی سرِ محفل اعتراض کر بیٹھے تو اس کے جواب میں برجستہ سند پیش کر سکیں۔

مشاعرے طرحی ہوتے تھے اور عموماً ہر مشاعرے کے لئے نئی غزل کہنا ضروری تھا۔ فرحت اللہ بیگ نے اپنے مضمون "دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ" میں ایک غیر طرحی مشاعرے کا حال لکھا ہے۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک ہی طرح میں اتنے شعراء کی غزلیں ملنا ناممکن تھا۔ کبھی کبھی طرح کے علاوہ مشاعرے میں موضوع کی قید بھی لگا دی جاتی تھی۔ دہلی کے آخری دور کے شعراء کے انتخاب میں آپ چند غزلیں دیکھیں گے جو ایک ہی طرح میں ہیں اور سب دہلی کی تباہی کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ غالباً یہ کسی مشاعرہ میں پڑھی گئی تھیں۔

مشاعروں کے باعث شعراء کے علاوہ سننے والوں میں بھی شاعری اور ادب کا ذوقِ سلیم پیدا ہو گیا۔ شاید عرب کے علاوہ اور کسی ملک کے عام لوگوں کی زبان میں وہ فصاحت اور شیرینی نہیں پائی گئی جو لکھنؤ اور دہلی کے باشندوں کی ایک خصوصیت رہی ہے۔ عرب میں اگرچہ مشاعرے نہیں ہوتے تھے لیکن عام مجمع میں لوگ اپنا کلام پڑھ کر سناتے تھے۔ ممکن ہے اسی رواج نے ہندوستان میں رفتہ رفتہ مشاعروں کی شکل اختیار کر لی ہو۔

سلسلۂ تلمّذ

اُردو شاعری میں اُستاد و شاگرد کا سلسلہ ایک بالکل نئی چیز ہے۔ جہاں تک معلوم ہے کسی دوسرے ادب میں یہ رواج اس شکل میں قائم نہیں ہوا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ زبان نئی تھی۔ اس کے قواعد و ضوابط مستند کتابوں میں نہیں پائے جاتے تھے۔ اس لئے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہر نیا شاعر اپنے لئے ایک رہنما تلاش کرے۔ رفتہ رفتہ ایک ایسی مستقل روایت بن گئی۔ آگے کے صفحات میں شاہ حاتم، سرب سکھ دیوانہ، مصحفی، داغ اور امیر مینائی کے سلسلے درج کئے جاتے ہیں۔ جن سے آپ دیکھیں گے کہ ان بزرگوں کا فیض سلسلہ بہ سلسلہ آج تک چلا آرہا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ استادی شاگردی کے رواج کے باعث شعراء کے ذاتی جوہر پورے طور پر ظاہر نہیں ہونے پائے۔ شاگرد اکثر استادوں کے قدم بہ قدم چلتے رہے اور اپنے لئے نئے راستوں کی کھوج نہیں کی۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ اکثر اساتذہ نے اپنے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیئے اور شاگردوں کو ان کے مخصوص رجحان کے لحاظ سے ترقی کرنے میں پوری مدد دی۔ بہت سے شعراء کا رنگ رفتہ رفتہ اپنے استادوں سے بالکل علیحدہ ہوگیا۔ مثلاً حاتم کے شاگرد سودا مصحفی کے شاگرد آتش، تسلیم کے شاگرد حسرت موہانی اور داغ کے شاگرد اقبال۔ جہاں تک معمولی استعداد کے شعراء کا تعلق ہے یہ بغیر استاد کے کہیں بھی نہ ہوتے، اور اگر انہوں نے کوئی نیا راستہ نہیں نکالا تو کوئی تعجب نہیں۔

سلسلۂ تلامذۂ شاہ حاتم
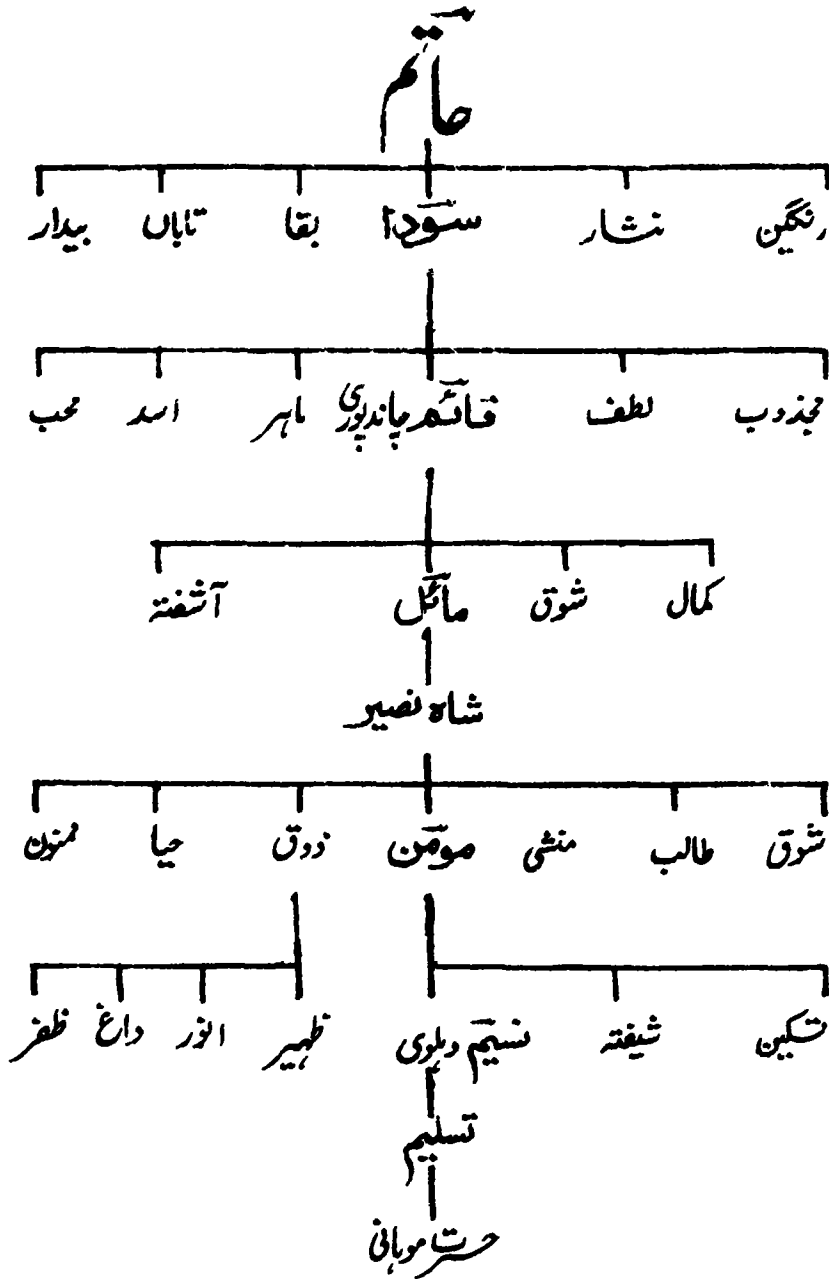
سلسلۂ تلامذہ سر سُکھ دیوانہ
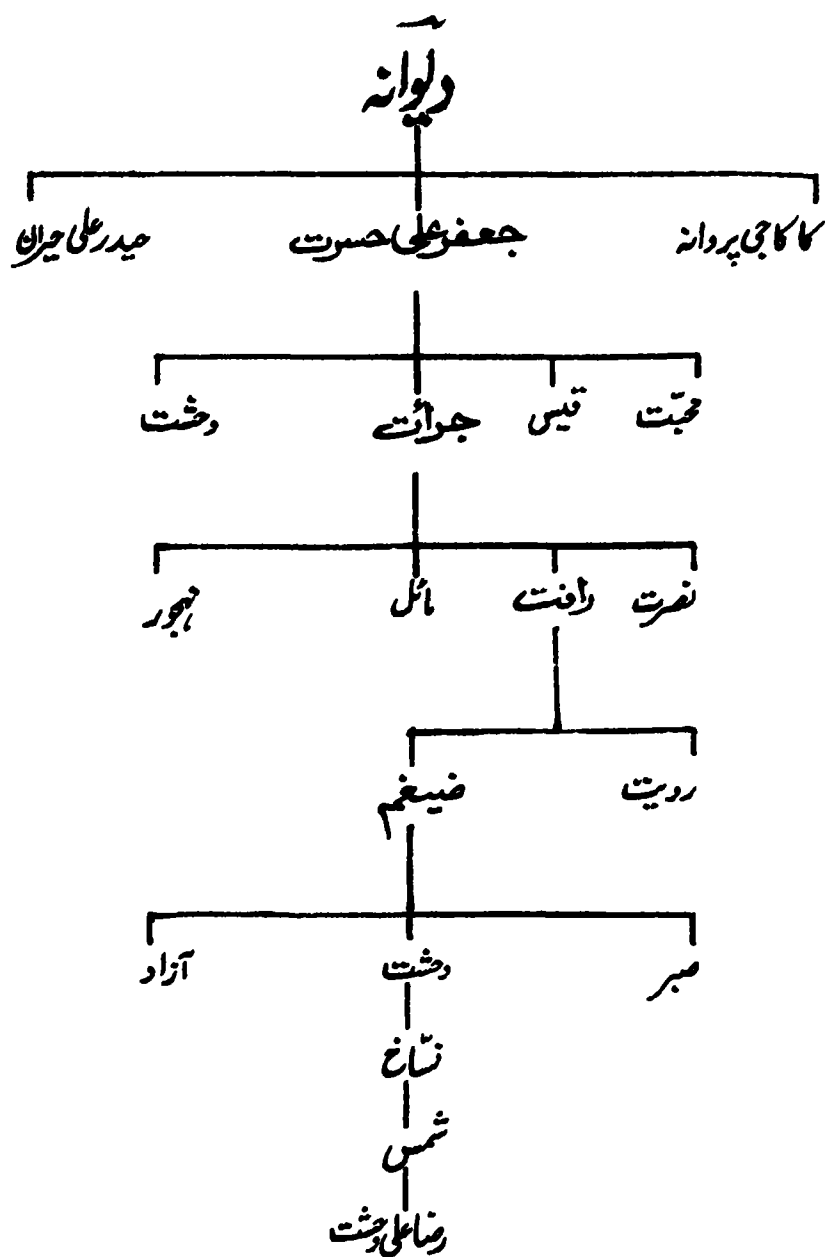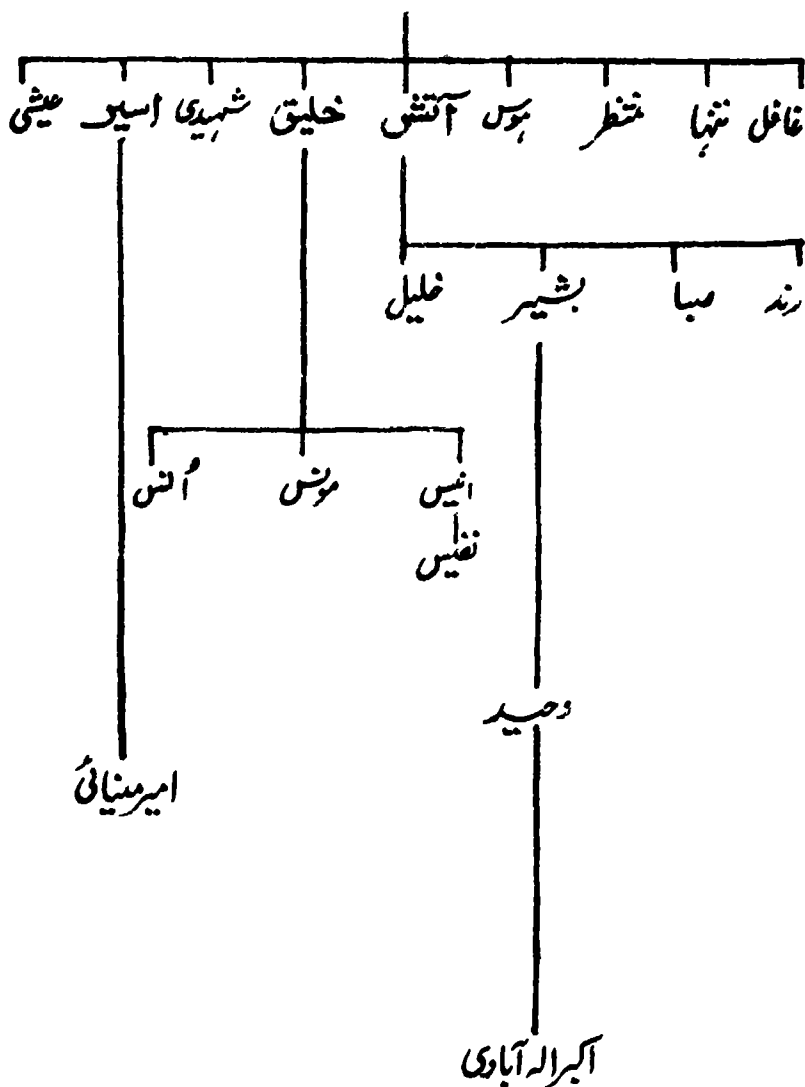
سلسلۂ تلامذۂ مصحفی

سلسلۂ تلامذۂ داغ

سلسلۂ تلامذہ امیر مینائی

غزل کا سفر

ولی سے لیکر ترقی پسند تحریک تک

مرتبہ

جاں نثار اختر

جاں نثار صاحب کے انتخاب میں مَیں نے ہر شاعر کا تعارف اور چند شعراء کی غزلیات کا اضافہ کیا ہے اور حیدر بخش حیدری، آلِ رضا، سیما مجددی، اقبال سہیل، عندلیب شادانی، سلیمان اریب، شاہد صدیقی کی غزلیات اس باب سے نکال کر "انداز بیاں اور" کے باب میں شامل کردی ہیں کیوں کہ ان کے حالاتِ زندگی مہیا نہ ہو سکے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس باب کی خوبصورتی بگڑ جائے کیوں کہ اختر صاحب بذاتِ خود خوبصورتی کے رسیا تھے۔

"مدیر"

اس انتخاب میں اردو کے اُن ایک سو بارہ شاعروں کی غزلیں شامل ہیں جو اُردو غزل کی ابتدا سے لے کر ترقی پسند تحریک تک اپنے اپنے دَور کی نمائندگی کرتے ہیں اور باوجود اپنے دَور کے نمائندہ شاعر ہونے کے اپنا اپنا انفرادی رنگ بھی رکھتے ہیں۔ رہا یہ سوال کہ میں نے ان شاعروں کی انھیں غزلوں کو کیوں منتخب کیا ہے، کیا دوسری غزلیں ان کے بجائے نہیں لی جا سکتی تھیں، تو میں کہوں گا کہ ضرور لی جا سکتی تھیں۔ یہ معاملہ اپنی اپنی نظر کا ہے۔ میں نظر کو محض مانی پسند کے معنوں میں استعمال نہیں کر رہا ہوں۔ شعر کی پرکھ کے لئے ایسی نظر کی ضرورت ہوتی ہے جو صرف ادبی روایات ہی میں اُلجھ کر نہ رہ جائے بلکہ شاعر کے ذہنی اُفتاد اور جمالیاتی مزاج تک پہونچ رکھتی ہو۔ اس میں صرف تنقیدی اصولوں ہی سے سارا کام نہیں چلتا بلکہ ایک خاص قسم کے وجدان کی ضرورت ہوتی ہے جو شعر کی تہوں اور گہرائیوں میں اتر سکے کیونکہ شعر میں الفاظ اور ان کا منطقی مفہوم ہی سب کچھ نہیں ہوتا، اس کی ایک دنیا لفظ و بیان سے ماورا بھی ہوتی ہے۔

غزل کا مزاج بنیادی طور پر داخلیت ہے، اُردو غزل پر ابتدا سے آج تک ایک نظر ڈال لینے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ زندگی میں جو تغیرات اور تبدیلیاں ہوتی آئی ہیں غزل اُن سے اندرونی طور پر اثر پذیر ہوتی رہی ہے۔ یہ اثرات اگرچہ غزل میں نمایاں طور پر سامنے نہیں آتے لیکن نظر رکھنے والے کو عہد بہ عہد سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کا عکس غزل میں جھلکتا ضرور نظر آئے گا۔ یہی غزل کی توانائی اور عظمت ہے، یہی اُس کی وسعت اور ہمہ گیری کا راز ہے۔ عام طور پر غزل عشق کی ترجمان سمجھی جاتی ہے لیکن یہ بات نظر انداز نہ کرنی چاہیئے کہ جہاں غزل نے عشق کی ہزارہا کیفیتوں کی ترجمانی کی ہے، ہر دَور کی نئی اقدار کے ساتھ بدلتے ہوئے عشقیہ تصورات کو اپنایا ہے، وہاں عشق کے وسیع مفہوم سے بھی اُس نے آنکھیں نہیں چرائیں، وطن سے عشق، کائنات سے عشق، انسان سے عشق، زندگی کی جدوجہد سے عشق اس کا موضوع رہے ہیں۔ جس دَور میں صوفیانہ تحریکیں اُبھریں یا فلسفیانہ نظریات سامنے آئے اور اُن اثرات کے ماتحت ماورائی موضوعات کو اہمیت دی گئی، غزل نے اُن رجحانات کے لئے بھی اپنا دل کشادہ رکھا۔ اسی طرح جب سیاسی، سماجی اور انقلابی میلانات نے جنم لیا

تو غزل نے انھیں اس طرح اپنے میں سمویا کہ ان موضوعات اور غزل کے درمیان کسی غیریت کی رعب۔سس تک نہیں ہوئی۔ ولی اور میر سے لے کر ترقی پسند تحریک تک غزل نے ہر دور کے خیالات اور رجحانات اور سماجی حالات کی عکاسی کی ہے اگرچہ یہ سب کچھ اشاریت اور رمزیت کے ذریعہ کیا گیا ہے۔

غزل کی اہم ترین خصوصیت اختصار ہے جو کسی اور صنف کو نصیب نہیں۔ اسی کے ساتھ اشاریت اور رمزیت غزل کے وہ وصف ہیں جن کی وجہ سے غزل میں تصورآفرینی اور تاثیر انگیزی پیدا ہوتی ہے، اشعار میں تہیں اور گہرائیاں بنتی ہیں۔ الفاظ کی تراشش اور تیکھا پن اور معانی کی گہری اشاریت غزل کے اختصار اور جامعیت کے لئے لازمی ہیں۔ یہی وہ تمام اجزا ہیں جو مل جل کر اس صفت کو جنم دیتے ہیں جسے فیض نے "نیم محسوس غنائیت" کہا ہے اور عام طور پر جسے تغزل کہا جاتا ہے۔

آ یئے، اردو غزل کی تاریخ پر عہد بہ عہد ایک نظر ڈالی جائے۔ بعض ادبی مورخوں کی نظر میں خسرو کی مشہور غزل "زحال مسکیں مکن تغافل" اردو کی پہلی غزل ہے، لیکن یہ کسی طرح صحیح نہیں۔ خسرو کی غزل میں فارسی اور مروج بھاشا کا اتحاد پہلی مرتبہ ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ پہلا مصرعہ فارسی میں اور دوسرا مصرعہ مروج بھاشا میں ہے۔ اس میں اردو کہاں ہے؟ یہ زیادہ سے زیادہ دو زبانوں کو قریب لانے کی شعوری کوشش کہی جا سکتی ہے۔ شاہان گولکنڈہ اور بیجاپور کے زمانے میں "دکنی اردو" میں شاعری کا ذوق پیدا ہوا، ان میں کئی خود بھی شاعر ہوئے۔ محمد قلی قطب شاہ جن کی کلیات کو اردو کی پہلی شعری تصنیف مانا جاتا ہے دکنی اردو اور دکنی لہجے سے بہت زیادہ پُر ہے۔ اردو زبان کی ارتقائی تاریخ میں اس کی اہمیت تسلیم کی جائے تو کی جائے، اس شاعری کو یا ان غزلوں کو ہم مکمل کر اردو کی غزلیں نہیں کہہ سکتے۔ اردو غزل ولی دکنی کے ہاں پہلی بار ہمیں ملتی ہے۔ ان کے ابتدائی کلام میں بھی اگرچہ دکنی اثرات ہیں پھر بھی اردو غزل اپنے چہرے سے نقاب الٹتی دکھائی دیتی ہے۔ بعد کی غزلیں تو خیر اردو غزل کی خالص مثالیں ہیں۔ ولی کی ہاں عشق کی دردمندی بھی ہے اور سرشاری بھی۔ ولی کا یہ شعر سنئے جس پر بقول فراق "دنیا کی مہذب سے مہذب شاعری وجد کرے گی":

ولی اس گوہر کان حیا کا واہ کیا کہنا
مرے گھر اس طرح آوے ہے جیوں سینے میں راز آوے

ولی کے دہلی آنے پر ان کا اثر دہلی والوں پر اور دہلی والوں کا اثر ان پر پڑا اور اردو غزل تیزی سے ترقی کے منازل طے کرنے لگی۔ دہلی میں شاہ حاتم اردو شاعری کے میر قافلہ کی حیثیت رکھتے تھے، ان کی غزلیں اپنے دور کے عام عشقیہ رجحان سے الگ کوئی چیز نہیں ہیں۔ صاحب تذکرہ شعرائے اردو نے لکھا ہے کہ ان کی غزلیں ان کے زمانے میں ہر طرف گائی جاتی تھیں اور انھیں

پسند عام کی سند حاصل تھی۔ اس دور میں جو اہم ترین نام ہیں وہ ہیں میر اور سودا کے۔

میر کا زمانہ بڑا پُر آشوب تھا، سارے ملک میں ایک نراج پھیلا ہوا تھا، پھر میر کی اپنی ذاتی اور خانگی زندگی کے حادثات بھی کم نہ تھے۔ ان تمام سماجی اور معاشرتی، شخصی اور ذاتی حوادث نے ایک درد اور کرب اُن کی شاعری میں بھر دیا تھا۔ لیکن میر کی شاعری واویلا کبھی نہیں بنی، ان کا لہجہ شائستہ اور پُر وقار رہا اور چونکہ غزل ہی کی زبان سے سب کچھ کہنا تھا اس لئے عشق اور غمِ عشق ہی کے پردے میں تمام مطالب ادا کرتے رہے۔ میر کا غم حوصلہ شکن نہیں بلکہ بقول مجنوں گورکھپوری "میر نے غمِ عشق اور غمِ زندگی دونوں کو زندہ رہنے اور مقابلہ کرنے کے تازہ دم حوصلے میں تبدیل کر دیا ہے۔" سردار جعفری نے اپنے مضمون "میر تقی میر کی شاعری" میں میر کے ایسے اشعار کی ایک خاصی تعداد ڈھونڈھ نکالی ہے جن میں میر نے "براہ راست سماجی، معاشی اور سیاسی مضامین کو ڈھال دیا ہے۔" یہ حقیقت ہے کہ میر کا زمانہ غم کا زمانہ تھا اور ایک نقاد کے الفاظ میں "اگر وہ غم کے شاعر نہ ہوتے تو اپنے زمانہ کے ساتھ دغا کرتے۔" لیکن میر کی عظمت کا راز اسی میں ہے کہ انہوں نے غم کو ایک ایسا لہجہ دے دیا جس میں صرف تحمل اور تابِ مقاومت ہی نہیں زندگی کی ایک نئی قوت بھی چھپی ہے۔ اس دور کے دوسرے اہم شاعر سودا تھے۔ سودا کے بھی حالات اور ان کی اپنی افتادِ مزاج میر سے مختلف تھی پھر بھی زمانے کے اثرات سے کیسے بچ سکتے تھے۔ سودا کے ہاں اگرچہ داخلیت کا وہ حسن تو نہیں جو میر کے ہاں ملتا ہے البتہ خارجیت کا ایک حسن الگ ہے سودا کی غزلوں میں پایا جاتا ہے جو ایک بیش قیمت عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُن کے ہاں شگفتہ اشعار کی بڑی تعداد ملتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سودا کی غزلوں کا بھی بیشتر حصہ غمِ عشق یا غمِ روزگار ہی کی دین ہے۔

اس دور کے دوسرے ممتاز شاعروں میں مظہر جانِ جاناں، درد، قائم، تاباں، یقین اور میر حسن وغیرہ تھے۔ اِن سب کے کلام میں ایک دردمندی اور اداسی کا احساس ہوتا ہے۔ مظہر اور درد صوفی منش تھے، ان کی غزلوں خصوصاً درد کی غزلوں میں یہ رحجان غالب ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ "تصوف جیسا انہوں نے کہا اردو میں آج تک کسی سے نہ ہوا۔" دراصل قرونِ وسطیٰ میں سب سے بڑی تحریک جسے ہم انسان دوستی کی تحریک کہہ سکتے ہیں تصوف کی صورت میں سامنے آئی تھی، اِس دور میں پہنچتے پہنچتے بھی اُس کی حیثیت ایک فکری نظام کی ضرور رہ گئی تھی۔ اسی فکری نظام کے زیرِ اثر درد کی شاعری میں انسان دوستی کے عناصر موجود ہیں۔ اُن کا دل سماجی حالات پر بھی دُکھتا ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ؎

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

لیکن اکثر وہ اپنے صوفیانہ طرزِ فکر کو غمِ دوراں سے بچنے کے لئے پناہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مظہر جانِ جاناں صوفی طبیعت ہوتے ہوئے بھی سیاسی تغیر و تبدل سے اثر قبول کرتے تھے، اُن

کے بیشتر خطوط میں خاص طور پر نجف خاں کی امیر الامرائی پر طنز ملتا ہے۔ ان کا مشہور شعر ہے:۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

اس میں کنایہ محض سہی لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس شعر کے پس منظر میں نجف خاں کے مظالم کی داستان پوشیدہ ہے۔ قاضی ثناء اللہ محدث پانی پتی نے جو "تفسیر مظہری" لکھی ہے اور جو مظہر کے مرید بھی تھے انھوں نے مظہر جان جاناں کے قتل میں نجف خاں کا ہاتھ بتایا ہے۔ غزل کے کنایوں اور اشاروں کے پیچھے کیا کیا ذاتی، سماجی اور سیاسی حالات چھپے ہوتے ہیں ان تک عام قاری کا پہونچنا آسان کام نہیں۔ قائم، تاباں، یقین اور میر حسن کی شاعری عشق ہی کے پردے میں اپنے دل اور اپنے زمانے کا غم کہتی ہے۔ ان کے کلام میں ہم ان کے مختلف طرز احساس کو پہچان سکتے ہیں جس سے ان کا اپنا اپنا انفرادی لہجہ بنا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دَور اُردو غزل کا زرین دور کہلانے کے قابل ہے۔ اردو غزل نے اس دور میں پوری طرح اپنا رنگ روپ نکھارا اور ہر طرح کے مضامین عاشقانہ، عارفانہ، فلسفیانہ یا انفرادی حسیات اور تاثرات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے جمالیاتی اور وجدانی ذوق کی تسکین کا بھی سامان مہیا کر دیا۔ اس جگہ ایک اور دکنی شاعر سراج اورنگ آبادی کا ذکر ضروری ہے جن کی ایک مشہور غزل اس انتخاب میں شامل ہے اور جو اردو کی صوفیانہ شاعری میں ایک بڑا مقام رکھتی ہے۔

لکھنؤ شاعری کا ابتدائی زمانہ اپنے سیاسی اور معاشرتی حالات میں دہلی سے کچھ مختلف تھا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں ہر طرح سکون اور عافیت کا دور دورہ تھا لیکن دلی اور لکھنؤ کی عام زندگیوں میں فرق ضرور تھا۔ وہاں کے نوابین اور امرا کی قدردانی نے نہ جانے کتنے شاعروں کو کھینچ بلایا۔ حتیٰ کہ میر نے بھی آخری زمانے میں لکھنؤ کا رُخ کیا۔ اس وقت جو شاعری لکھنؤ میں پروان چڑھی اس میں مصحفی کا بڑا ہاتھ تھا۔ جرأت اور انشا بھی اس دور کے اہم شاعر تھے۔ سودا نے اپنی اکثر غزلوں میں جو خارجیت کا حسن بھرا تھا وہ روایت لکھنؤ میں خاصی پھلی پھولی۔ جرأت اور انشا کی معاملہ بندی اسی روایت کی دین ہے البتہ یہ دونوں اس میدان میں بہت کھُل کھیلے۔ نازک مشاہدات اور داخلی قسم کی معاملہ بندی پر انھیں عبور نہ حاصل ہو سکا اور اسی وجہ سے ایک سطحیت ان کے اکثر اشعار میں پیدا ہو گئی۔ معاملہ بندی شاعری کا ایک رجحان ہے، اگر اس میں داخلیت کا امتزاج ہو تو حسین اور اعلیٰ اشعار کی تخلیق ممکن ہے، پھر بھی جرأت کی بعض غزلیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں البتہ انشا کی غزلوں میں سوائے اُس غزل کے جو اس انتخاب میں شامل ہے ایک پھکڑپن کا احساس ہوتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "انشا کو

غزل گو کہنا آن کے ساتھ دل لگی کرنا ہے" اور یہ بڑی حد تک ٹھیک ہے۔ وہ بڑے ذہین اور طباع آدمی تھے لیکن اپنے نجی حالات اور واقعات کے ہاتھوں بقول عبدالروف عروج "چراغ مردہ محفل کا دھواں بن کر رہ گئے تھے"۔ اس دور میں نمایاں ترین حیثیت مصحفی کی ہے۔ مصحفی کے یہاں میر کی لطیف داخلیت اور سودا کی حسین خارجیت کی آمیزش نظر آتی ہے۔ مصحفی کی شاعری کو "انتخابیت" کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا، اس میں جو ایک "داخلی خارجیت" ہے وہ اپنا حسن الگ رکھتی ہے۔ بعض جگہ مصحفی کے اشعار پر میر کی تقلید کا گمان ہوتا ہے لیکن دونوں کے وجدان اور لہجے میں فرق ہے۔ کہیں کہیں سودا سے متاثر نظر آتے ہیں لیکن سودا کی رنگینی اس کسک سے خالی ہے جو مصحفی کے رنگین اشعار میں ملتی ہے وہ لفظوں سے رنگوں کا کام لینا بھی جانتے ہیں اور رنگ کا احساس ان کی شاعری میں واضح طور سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ مصحفی کے کلام میں اگرچہ وہ تہیں اور گہرائیاں تو نہیں جو بڑی شاعری کے لوازمات میں سے ہیں پھر بھی دلوں میں اتر جانے والی کیفیت ان کے اشعار میں ضرور پائی جاتی ہے۔

اس سے پہلے کہ لکھنؤ شاعری کے ناسخ اور آتش پر نظر ڈالی جائے ایک ایسے منفرد شاعر کا تذکرہ ضروری ہے جس نے تمام روایتوں سے بغاوت کر کے ایک ایسی شاعری کی بنیاد ڈالی جو قطعی ارضی ہے۔ نظیر پہلے شاعر ہیں جو زمین پر کھڑے نظر آتے ہیں اور زمین کی چیزوں کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر اگرچہ نظیر نظم کے شاعر ہیں لیکن ان کی غزل بھی اسی رنگ اور اسی لہجے کی پیداوار ہے جو واقعاتی اور زمینی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ خیالات کے نہیں واقعات کے شاعر ہیں۔ نظیر کی غزلوں کے تاثر کو مجنوں گورکھپوری نے جن لفظوں میں بیان کیا ہے وہ پوری طور پر نظیر کے ذہن کی ترجمانی کر دیتے ہیں۔ اپنے مضمون "نظیر اکبرآبادی" میں لکھتے ہیں "ان کا کلام پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ ایک خوش دل اور شگفتہ مزاج رفیق مل گیا ہے جس کو انسان اور انسانی دنیا سے محبت ہے۔ جو انسانی زندگی کی کم مائیگی کا احساس پیدا کر کے دلوں کو افسردہ نہیں کرتا۔ جو ہمیں یہ اطمینان دلاتا ہے کہ زندگی صرف دکھ درد کا نام نہیں، ہنسی خوشی بھی زندگی کی باتیں ہیں، یہاں کانٹے بھی ہیں پھول بھی ہیں۔ کانٹوں کو نظر میں رکھو اور پھولوں سے دل خوش کرو"

ناسخ اور آتش کے دور پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ جس شاعری نے اس دور میں جنم لیا اس پر اس دور کے پر تکلف معاشرے کی چھاپ موجود ہے اور یہی وہ چھاپ ہے جسے ہم "لکھنویت" کے نام سے پکارتے ہیں۔ شاعری کی روح یا آرٹ کی جدلیت کو لکھنؤ کے شاعروں نے نظر انداز کر دیا۔ وہ پر تصنع بیان، رعایات لفظی اور فن کے خارجی محاسن میں ایسا کھو گئے کہ بقول فراق "شاعری کی خاموش گہرائیوں تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔" یہ بات ناسخ اور ان کے مقلدین پر سو فیصدی عائد ہوتی ہے۔ آتش کے ہاں ہمیں نسبتاً کھلی فضا

اس ہوتا ہے لیکن اُن میں بھی خیال آرائی کا عنصر بڑی حد تک موجود ہے۔ پھر
نہ بھولنا چاہیئے کہ اُن وقت ہی سے اودھ کی معاشی ابتری اپنا بھیانک چہرہ
اسنے لگی تھی اور شاعر اور ادیب بھی فکر معیشت کے شکار ہونے لگے تھے۔ ناسخ
اور آتش کی صنعت لفظی کی شاعری تک زمانے کے تلخ تجربوں کو اپنے میں سمیٹنے لگی
تھی۔

ملا جو، اُس کو سمجھے منّ و سلویٰ
توکل پر رہا شام و سحر خرچ
نہ بوریا بھی میسّر ہوا بچھانے کو
ہمیشہ خواب ہی دیکھا کئے چھپرکھٹ کا

زبان کے معاملے میں جو خدمت لکھنؤ اسکول نے انجام دی اُس کو پیش نظر رکھتے
ہوئے لکھنؤ کے کمالات کو اردو غزل کی تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔
دہلی میں ناسخ کے رنگ کا تھوڑا بہت اثر کئی شاعروں نے قبول کیا لیکن وہ
وقتی پرچھائیوں سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ اس رنگ کے اصلی پیرو کار شاہ نصیر ہوئے۔
ہر وہ بات جو لکھنؤ میں ناسخ کے لئے کہی جا سکتی ہے دہلی میں شاہ نصیر پر صادق آتی ہے
بہرحال ایک فن کے طور پر اس کی قدردانی کرنی چاہیئے ورنہ کوئی پُر تصنع شاعری بڑی
شاعری بننے سے رہی۔ اس دور کی اہم ترین شخصیتیں ذوق، مومن، اور غالب کی ہیں۔
ذوق نے شاہ نصیر کو پورے طرح تو خود پر حاوی نہیں کیا جن کے وہ شاگرد تھے پھر بھی اُن کی
شاعری پامال اخلاقی مضامین اور فرسودہ عاشقانہ خیالات سے آگے قدم نہیں بڑھاتی۔ اُن میں
شاعرانہ انداز احساس کی سخت کمی ہے جس کی وجہ سے اُن کا کلام شعریت سے محروم ہو
گیا ہے، اُن کے اشعار میں بول چال کی زبان اور محاورے کے لطف کے سوا کچھ نہیں ملتا۔
کہیں کہیں کوئی چونکا دینے والا شعر آجاتا ہے لیکن وہ تمام کلام کی تلافی نہیں کر سکتا۔ میرا
خیال ہے کہ استادی کے شوق نے اُن کی شاعری کو شدید نقصان پہونچایا۔ البتہ اُن کے معصر
مومن کی شاعری میں حسن و عشق کی نفسیاتی باریکیاں اکثر ہمیں مل جاتی ہیں۔ اُن کا اپنا ایک انداز
بھی ہے اگرچہ وہ طرز بیان کی پیچیدگی سے پیدا ہوا ہے۔
ذوق، مومن، غالب جس دور کی پیداوار ہیں وہ دور سیاسی خلفشار اور انتشار
کا تھا۔ مغلیہ حکومت کے زوال اور انگریزوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ غالب نے غدر کی تباہ
کاریاں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ اس تمام سیاسی اور سماجی بے چینی کا اثر ذوق کی
شاعری میں کوئی واضح نقوش نہ ابھار سکا کیونکہ وہ مرتے دم تک "استادِ شہ" رہے اور
اسی میں مگن۔ مومن کی عشقیہ مزاجی نے اُن کی شاعری کو سماجی سوجھ بوجھ سے قریب نہ آنے
دیا۔ آخری زمانے میں سید احمد بریلوی کی تحریک اصلاح سے متاثر ہوئے لیکن اُن کی غزل

کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوپہنچا۔ غالب البتہ اس دور میں ایک ایسے شاعر نظر آتے ہیں جو عصری حالات سے متاثر ہوئے لیکن اس طرح نہیں کہ کسی قسم کی شکست خوردگی کا شکار ہو جاتے۔ وہ واقعیت پسند اور عمل پسند تھے۔ انھوں نے احتشام حسین کے الفاظ میں "عقل کو جذبے کی ترتیب بخشی اور جذبے کو عقل کے تابع رکھنے کی ضرورت کا احساس بھی کیا۔" جذبے اور فکر کا یہ ربط غالب کی اہم خصوصیت ہے جو اُن کی شاعری کو عظمت دیتا ہے۔ فراق نے بھی غالب کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "غالب کی غزلوں میں دل و دماغ، جذبات اور عقلیت کا مکمل امتزاج ہے، یہ بڑا بھاری راز غالب کی مقبولیت کا ہے۔" جہاں تک فن کا تعلق ہے۔ غالب نے فن نے نئے سانچے ڈھالے، نئی زبان ایجاد کی، یہی نہیں بلکہ مخصوص احساس یا جذبہ اور آواز کے رشتے کو سمجھ کر لفظوں کو نئی فضا، نیا آہنگ اور نئی زندگی دی۔ غالب نے ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ "شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں" جو شیخ محمد اکرام نے غالب کے فن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ "شاہجہاں کا تاج محل اور غالب کی شاعری فن کے دو مختلف اصناف کے شاہکار ہیں۔ لیکن دونوں کی تہہ میں ایک ہی روح کارفرما ہے، تخیل کی بلندی، لطافت، تلاش حسن، فنی پختگی" غالب کی شاعری میں جو کائناتی شعور اور جو آفاقی لہجہ ہے اُس نے عہد بہ عہد اپنا اثر ڈالا ہے۔ اور آج بھی جدید نسل کے نقاد، وزیر آغا، کرامت علی کرامت، شمس الرحمان فاروقی، باقر مہدی، فضیل جعفری، ندا فاضلی وغیرہ اُس کی شاعرانہ عظمت کے معترف نظر آتے ہیں بلکہ اُن میں سے کئی تو غالب کو آج کا شاعر مانتے ہیں۔ غالب نے جو پیش گوئی اپنے لیے کی تھی وہ صحیح ثابت ہوئی۔

میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

اس دور میں، میں نے اور جن شاعروں کو لیا ہے وہ آزردہ، شیفتہ اور بہادر شاہ ظفر ہیں۔ آزردہ اور شیفتہ کے یہاں غالب کی شاعری کی وسعت اور گہرائی تو نہیں، عاشقانہ شاعری کا پُروقار لہجہ ضرور ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی ابتدائی غزلیں نشاطیہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں البتہ بگڑے ہوئے سیاسی حالات کا تاثر اُن کی بعد کی غزلوں میں رچ بس گیا ہے اور اس طرح ان کی شاعری میں ایسا لہجہ آ گیا جس میں بلا کی نشتریت محسوس ہوتی ہے۔ اُن کا غم آفاقی غم تو نہ بن سکا، ذاتی غم ہی رہا، سلطنت کی تباہی، درباری سازشوں اور جلاوطنی کا صدمہ، ملک کی معاشی بدحالی اور ابتری کا رونا کہیں کھلے الفاظ میں کہیں عاشقانہ طرز ادا میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ ظفر کی شاعری ہم کو اداس ضرور کرتی ہے اور انسانی ہمدردی کو جگا دیتی ہے لیکن یہ اثر وقتی ہوتا ہے، البتہ اس طرح متاثر نہیں کرتی کہ ہم زندگی سے مایوس ہو کر بیٹھ جائیں۔

ناسخ اور آتش نے جس لکھنؤ اسکول کی تعمیر کی تھی، اُسے مصحفی، ناسخ اور آتش کے شاگردوں نے اپنایا۔ وہ زیادہ تر تو اُسی طرز سخن کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ پھر بھی زبان اور

بیان زیادہ سمجھا اور سمجھا ہوا ہے۔ لکھنؤ نصیر الدین حیدر کے زمانے ہی سے بڑی تیزی سے تباہی کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ ان کی بڑھتی ہوئی عیاشی نے خزانہ خالی کر دیا تھا۔ محمد علی کا زمانہ ناقدری کا زمانہ تھا۔ اہل کمال کی کوئی پرسش نہ تھی۔ امجد علی شاہ کے دور میں بیچے کچھے شاعروں کی تنخواہیں بند ہو گئیں۔ واجد علی شاہ کا دور لہو و لعب میں ڈوبا ہوا تھا۔ اپنی عیاشی کے لئے عورتوں کے سیکڑوں طائفے بنا ڈالے، رادھا منزل والیاں، شکر والیاں، گھونگھٹ والیاں، رہس والیاں اور چھوتیاں۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس نے اہل قلم کی قدر دانی کی۔ سترہ سو اہل قلم اس کے دربار سے وابستہ تھے، مگر عام آبادی اقتصادی بحران کا شکار تھی۔ آخر کار اودھ کی سلطنت کا تختہ پلٹا اور اودھ کا الحاق ہو گیا۔ اودھ کے ہیچ معاشرت اور تہذیب پر ایک ضرب کاری پڑی اور سارا شیرازہ درہم برہم ہو کے رہ گیا۔ لکھنؤ کا اس دور کے شعراء ان حالات کا تاثر لئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے۔ اسیر، وزیر، قلق، رند صبا، دیا شنکر نسیم، اور منیر شکوہ آبادی اس کے عہد کے اہم شاعروں میں تھے۔ قلق کے یہ شعر سنئے کیا ان کے پیچھے اودھ کی تباہی کی داستان پوشیدہ نہیں ؟۔

بہار آنے ہی کنج قفس نصیب ہوا
ہزار حیف کہ نکلا نہ حوصلہ دل کا
وہ ظلم کرتے ہیں ہم پر تو لوگ کہتے ہیں
خدا برے سے نہ ڈالے معاملہ دل کا

رند اور صبا کے ان شعروں پر غور کیجئے، لکھنؤ کے مٹ جانے کا غم اور انگریزی اقتدار کے خلاف احتجاج کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔

اجاڑا موسم گل ہی میں آشیاں میرا
الہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد
پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے
قفس کو لے کے میں اڑ جاؤں گا کہاں صیاد

اے صبا جب سے ابھی تک ہے خزاں کا دور دور
آئے گی بھی یا نہ آئے گی بہار اب کی برس

منیر شکوہ آبادی نے تو والیان باندہ کی رفاقت کے جرم میں کالے پانی کی سزا بھی بھگتی۔ ان کے ہاں بھی احتجاجی اشعار مل جائیں گے۔ لیکن یہ سب کچھ غزل میں اشارہ اور کنایہ ہی میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ان شاعروں میں لہجہ کا بہت خفیف فرق ملتا ہے ورنہ ایک یکسانیت ہے جو اس دور کی غزل پر طاری ہے۔

اس دور میں دو اور شاعروں کی غزلیں میں نے شامل کی ہیں۔ نظامؔ رامپوری جنھیں خارجی محاکات پر دسترس تھی۔ لکھنؤ شاعری کی معاملہ بندی کے اثرات اُن کی غزلوں میں جھلکتے ہیں۔ دوسرے حیدر بخش حیدری جن کو اردو دنیا ایک نثر نگار کی حیثیت سے جانتی پہچانتی ہے۔ ان کی شاعری کی طرف عام طور پر توجہ نہیں دی گئی۔ حالانکہ دی جانی چاہیے تھی۔ اُن کے ہاں غزل کے روایتی اسلوب کے پیچھے فریاد کی ایک مہذب لے ہے۔ یہ فریاد کی لے سماجی حالات کی گھٹن سے پیدا ہوئی ہے، اگرچہ انداز عاشقانہ ہے جس سے غزل میں نجات ممکن نہ تھی۔

ہے شب تیرہ، ٹک اے شمع شبستاں مدد دے
راہ گم کردہ ہوں، اے خضر بیاباں مدد دے

زبان اور بیان کو نکھارنے کی روایت حاتم سے شروع ہوئی اور ذوق سے ہوتی ہوئی امیر اور داغ تک آئی۔ امیر اور داغ کی شاعری نے اسے معراج پر پہونچا دیا، یہ ان شاعروں کا بڑا کارنامہ ہے۔ عشقیہ معاملات اور واردات کے سوا اُن کی غزلوں میں کوئی جذباتی گہرائی کا احساس نہیں ہوتا۔ داغ کی شاعری پر اکثر اوقات سطحیت اور عیش کوشی کے جذبے کا حکم لگایا جاتا ہے۔ مجنوں کی نظر میں اس دبستان کی خصوصیات ہی "سطحی قسم کی خود آسودگی، لذت پرستی اور نفس پروری" ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ داغ کی شاعری، کھلی کھلی عشقیہ شاعری ہے، اس سے وجدان کے ارتقاء میں کوئی مدد نہیں ملتی، پھر بھی معاملہ بندی اور خارجی محاکات کی پسندیدہ مثالیں داغ کے ہاں کثرت سے ملتی ہیں۔ سرور نے جو بات کہی ہے کہ "داغ بڑے شاعر تھے لیکن اُن کی شاعری بڑی شاعری نہیں ہے" مجھے اس سے اتفاق ہے۔ امیر مینائی نے آخری زمانے میں داغ کے راستے پر چلنے کی کوشش کی لیکن وہ داغ سے پیچھے ہی نظر آتے ہیں۔ اس دور میں اور بھی کئی شاعر مجروح، جلال لکھنوی اور تسلیم لکھنوی نمایاں ہوئے اور اس میں شک نہیں کہ انہوں نے بڑی حد تک ابتذال سے اپنا دامن بچایا اور اکثر و بیشتر اچھے اشعار بھی کہے لیکن ان میں سے کوئی بڑی عشقیہ شاعری تک نہ پہونچ سکا۔ اس دور میں ایک غزل محمد علی تشنہ کی الگ سے نظر آتی ہے۔ اگرچہ یہ ذوق کے شاگرد تھے، لیکن ان کی غزل جس کیفیت سے سرشار ہے وہ ذوق کے بس کی چیز نہیں۔ اب رہے حالی جو اس عہد کی نمایاں ترین شخصیت ہیں۔ اُن کی غزلیں، میری مراد ہے اُن کی ابتدائی غزلوں سے، سچی عشقیہ شاعری کی حسین مثالیں ہیں۔ وہ نکات عشق سے واقف ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو اُن کے سیاسی اور سماجی شعور کا پتہ دیتے ہیں۔

حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

مغلیہ سلطنت کے زوال کے پس منظر میں اس شعر کو دیکھئے تو حالی کے دل کی گہرائیوں تک پہنچ ہو سکے گی۔ لیکن حالی نے سرسید کے اثر میں آکر اپنی شاعری کا رنگ ہی بدل لیا جس کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں:۔

آن دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بُردش بیک نگاہے

اس تبدیلی نے حالی سے اُن کی غزل چھین لی۔ جو کچھ ہاتھ آیا وہ بے حرا شعار تھے یا "مسدس"۔ سرسید کے اثر اور مغربی رجحان کے تحت حالی نے شاعری کو نئے خیالات نئی قدریں اور نیا شعور دینے کی کوشش کی۔ آزاد، حالی اور اسماعیل سے ایک علیحدہ اسکول ہمارے سامنے آتا ہے لیکن یہ بنیادی طور پر نظم کا مبلغ تھا۔ اس دور میں حب الوطنی نیشنل ازم کی تحریک میں نمودار ہوئی لیکن اس کی بنیاد رومانیت پر تھی۔ حالی نے اپنی قومی نظموں میں جذبات اور محسوسات پر تو زور دیا لیکن ان محسوسات کو کسی اصول کے ماتحت "معقول" نہ بنا سکے اور بقول ممتاز حسین "حالی جب معقولات کی طرف آئے تو انھوں نے محسوسات کو اخلاقیات کا پابند کر دیا نہ کہ علوم طبعی کا" بہرحال اس دور میں پہلی بار غزل کے خلاف آواز بلند ہوئی۔ اگرچہ حالی سے پہلے "شیفتہ" اردو کی مروجہ شاعری سے سخت بیزار تھے، لیکن اُن کے پاس نئی اقدار کا کوئی تصور نہ تھا، چنانچہ پہلی آواز حالی ہی کی سنائی دیتی ہے۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ غزل کو ختم کر دینے کی کوئی کوشش کی گئی۔ حالی نے محض غزل کی اصلاح کا نعرہ دیا تھا۔ حالی کے اصلاحی نعرے نے غزل کو کس حد تک متاثر کیا اس کا ذکر آگے آئے گا۔

حالی کے ہمعصر اکبر الہ آبادی جو سرسید کی تحریک کے نمایاں مخالفین میں سے تھے دراصل طنز نگاری کے مسلم استاد ہیں، یہ اور بات ہے کہ ہم ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہ کریں۔ اُن کے نقطہ نظر میں ایک زوال آمادہ تمدن کے بہت سے اجزا تھے لیکن اس وقت اس سے بحث نہیں۔ اکبر نے جو غزل کہی اس میں رسمی تکلفات بھی ہیں اور لکھنؤ کی صناعی کا اثر بھی، پھر بھی ان کی اکثر غزلوں میں حسن بیان اور معنویت کا امتزاج ملتا ہے۔ البتہ چکبست نظم گو ہونے کے باوجود اپنی غزل میں ایک متین اور سنجیدہ لہجہ الگ سے پیدا کر سکے ہیں، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے زندگی اور اس کے پہلوؤں کو فلسفیانہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ مرزا رسوا بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کی ایک غزل اس انتخاب میں شامل ہے، بہت نکھرا اور شستہ انداز ہے، کہتے تو عشقیہ غزل تھے لیکن ڈوب کر کہتے تھے۔ ان کی طبیعت کی وارفتگی نے انھیں کوئی کام جم کے نہ کرنے دیا، پتہ نہیں امراؤ جان ادا اور شریف زادہ

انھوں نے کیسے لکھ ڈالیں۔ ایک اور اہم غزل گو شاد عظیم آبادی ہیں۔ مولانا سلیمان ندوی نے شاد کو اپنے عہد کا میر لکھا تھا۔ شاد دراصل میر، درد اور آتش سبھی سے متاثر ہوئے ہیں۔ اُن کے یہاں دل کی واردات ہی نہیں بلکہ عشق کے رموز سے آگہی جھلکتی ہے جیسے ان کے لہجے اور حزن ادا نے ایک منفرد رنگ دے دیا ہے۔ شاد کو جو مقام اردو غزل کی تاریخ میں ملنا چاہیئے تھا ابھی تک نہیں مل سکا ہے۔

اس کے بعد ہمارے سامنے ایک طویل فہرست امیر اور داغ کے شاگردوں کی آتی ہے۔ یہ بڑے مزے کی بات ہے کہ داغ کے شاگردوں میں کوئی بھی اُن کے رنگ کو نبھا نہ سکا۔ اس کے برخلاف امیر کے شاگردوں نے داغ اسکول کی روایت کو آگے بڑھایا اور اُن میں کئی شاعر ریاض خیرآبادی، مضطر خیرآبادی، جلیل مانک پوری، حفیظ جونپوری وغیرہ اپنے وقت کے استاد سخن مانے گئے۔ ریاض یوں تو داغ ہی سے متاثر تھے لیکن میر اور مصحفی کے اثرات بھی اُن کی غزل میں جھلک جاتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

کچھ کچھ ہے ریاض میر کا رنگ
کچھ شان ہے ہم میں مصحفی کی

ریاض کے کلام میں دو اجزا بہت نمایاں ہیں۔ اور انھیں کی آمیزش اُن کا اپنا رنگ متعین کرتی ہے۔ ایک شوخی، دوسرے خمریات۔ وہ "بے تکلف عشق" کے قائل ہیں اور اس لئے شوخی کا "بڑا فیاضانہ استعمال" کرتے ہیں۔ دوسرا اُن کا پسندیدہ موضوع خمریات کا ہے۔ آل احمد سرور اپنے ایک مضمون "ریاض اور ہم" میں لکھتے ہیں کہ "ریاض میں بادۂ تصوف کی چاشنی بھی کافی ہے" سرور کی یہ رائے قطعاً قابل قبول نہیں۔ یہ رائے محض رسمی اور روایتی ہے۔ البتہ زبان کا لطف ریاض کے ہاں قابل ذکر ہے۔ نیاز فتح پوری نے ایک جگہ لکھا تھا "شاید ریاض کے برابر صحیح شعر کسی اور نے نہیں کہے۔" یہ تو خیر مبالغہ ہے۔ جو غزل داغ سے سب سے زیادہ قریب نظر آتی ہے وہ مضطر خیرآبادی کی ہے جس کا اندازہ اس انتخاب میں شامل کی ہوئی غزل سے باسانی ہو سکتا ہے۔ میں نے اس انتخاب میں اُن کی وہ غزل بھی رکھی ہے جو اُن کے عام رنگ سے ہٹ کر ہے اور بہادر شاہ ظفر کے نام سے عام طور پر منسوب کی جاتی ہے۔ جلیل مانک پوری، حفیظ جونپوری اور داغ کے کئی شاگردوں نے اردو شاعری کو بہت سی اچھی غزلیں دی اس کا اعتراف بیجا نہیں ہے۔ داغ کے شاگردوں میں میں نے نوح ناروی کی ایک غزل شامل کی ہے، جو داغ اسکول کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسی کے متوازی جب لکھنؤ کی طرف نظر اٹھائیں تو ہمیں سب سے

نمایاں شخصیت صفی لکھنوی کی نظر آتی ہے۔ اس دور میں لکھنؤ اسکول کی شاعری میں بڑی حد تک خوشگوار تبدیلیاں محسوس ہوتی ہیں۔ خصوصاً غالب کی تقلید میں جو فلسفہ طرازی کا رجحان یہاں کی غزل میں پیدا ہوا تھا اور جو ابتدا میں رسمی فلسفہ نگاری سے زیادہ کچھ نہ تھا، رفتہ رفتہ فکری عنصر بننے لگا۔ لکھنو شاعری کو نیا رنگ دینے میں صفی مرحوم کا بڑا حصہ ہے۔ سید اختر علی تلہری نے لکھا ہے کہ "صفی کی غزلوں میں غالب کی فلسفیانہ گہرائیاں ہیں نہ میر کی جذبات آشوب سرمستیاں۔ تاہم عمومی حیثیت سے اُن کے اشعار میں جذبات کا نشاط خیز ہڑاؤ پایا جاتا ہے"۔ عزیز لکھنوی انھیں کے شاگرد تھے اور اُن کے شاگرد آثر لکھنوی۔ ان دونوں نے لکھنوی طرز کو بہت کچھ سنوارا اور سجایا ہے۔ سرور کی رائے میں "اگر لکھنؤ اسکول میں کوئی صاحب فکر کہا جا سکتا ہے تو وہ ثاقب لکھنوی ہیں" لیکن جو شعریت اور جمالیاتی حسن آل رضا کی غزلوں میں ملتی ہے وہ میرے خیال میں لکھنو کے اس دور کے کسی شاعر میں موجود نہیں۔ اُن کی غزل عاشقانہ سہی لیکن ان کی نظر نکتہ رس اور ان کا مہذب لہجہ غزل میں ایسا رچاؤ پیدا کر دیتا ہے جو بلا کی کشش رکھتا ہے۔ تلوک چند محروم اور جوش ملسیانی بھی اسی دور کے قادر الکلام شاعر ہیں۔ اور ان کی غزلیں ایک طرف زبان کی صفائی اور بیان کی سادگی کا نمونہ ہیں تو دوسری طرف متانت کی پاکیزگی کا مخزن بھی۔ اس دور کی تمام خوشگوار تبدیلیوں کے باوجود ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ غزل کی عام فضا ایک انحطاطی کیفیت سے برابر دوچار رہی۔ یہی پس منظر تھا جس کی وجہ سے حسرت کی آواز غزل کے لئے ایک نیا مژدہ ثابت ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ حسرت کی غزل سے اردو غزل "نشاۃ الثانیہ" کی ابتدا ہوئی۔ یہ دعویٰ کچھ زیادہ بلند آہنگ معلوم ہوتا ہے۔ حسرت نے روایت سے اپنا رشتہ کبھی نہیں توڑا بلکہ میر، مصحفی، غالب اور مومن اور اپنے استاد تسلیم لکھنوی سبھی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ پرانے ادبی ورثہ کی بڑی قدر کرتے ہیں اور اسی میراث کو لے کر آگے قدم بڑھانے کے قائل ہیں۔ یہ کوئی بُری بات نہیں اچھی بات ہے۔ اُن کا عام رجحان عاشقانہ ہے، جو چیز اُردو غزل میں حسرت کی دین کہی جا سکتی ہے وہ محبوب کے بازاری تصور کو چھوڑ کے متوسط طبقے کے محبوب کی شائستہ مزاجی اور دلبرانہ رکھ رکھاؤ کو اپنانا ہے۔ اُن کے بعض اشعار میں نفسیاتی نظر کا احساس بھی ہوتا ہے۔ سرور کو حسرت "فنا فی الحسن" نظر آتے ہیں، مجنوں کا کہنا ہے کہ حسرت افلاطون کی طرح خیر، حسن اور حقیقت کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ حسرت حسن کو خلاق کائنات ہی کیوں نہ سمجھتے ہوں لیکن "ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں" کے پایہ کی شاعری اُن کے بس کی چیز کبھی نہ بن سکی۔ اس سے انکار نہیں کہ انھوں نے اپنے طرز احساس سے اپنا ایک لہجہ بنا لیا ہے جسے ہم الگ سے پہچانتے ہیں۔

اس دور میں بڑے اہم نام آتے ہیں، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جگر

مراد آبادی، آرزو لکھنوی، یاس یگانہ چنگیزی وغیرہ۔ یہ سب اپنا ایک انفرادی رنگ رکھتے ہیں۔ اصغر، غالب اور مومن دونوں سے ایک حد تک متاثر ہیں۔ غالب سے زیادہ، مومن سے کم۔ اُن کی غزل میں ایک عارفانہ نگاہ کا احساس ہوتا ہے اور اُن کے ذوقِ جمال میں ایک ماورائی کیفیت سموئی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا بیان صرف شگفتہ ترکیبوں تک محدود نہیں رہ جاتا بلکہ ایک گہری معنویت پوری حسن کاری کے ساتھ رچی محسوس ہوتی ہے۔ فانی کی شاعری اپنا ایک مخصوص کردار رکھتی ہے۔ اگرچہ ابتدا میں فانی کے ہاں داغ کا رنگ اور لکھنؤ اسکول کا رنگ سمویا ہوا ملتا ہے۔ لیکن جس چیز نے فانی کو فانی بنایا وہ میر کا سنجیدہ سوز و گداز اور غالب کی حکیمانہ بالغ نظری کا امتزاج ہے۔ البتہ فانی کے غم میں میر کا "نشاطِ غم" نہیں اور نہ غالب کی طرح "عارفانہ پندار اور حکیمانہ بے نیازی" ہے۔ فانی کی غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حیات اور کائنات کے بارے میں اپنا ایک نظریہ ضرور رکھتے ہیں اور یہ دنیا یا یہ زندگی اُن کے لیے غم ہی غم ہے اور موت اس کا مداوا۔ ایک نقاد نے فانی کی شاعری کو "موت کی انجیل" کہا ہے۔ اُن کے الفاظ میں "موت فانی کے لیے ایک مثالی عالم ہے جہاں وہ تمام برکتیں اور فراغتیں موجود ہوں گی جن سے اس دنیا میں ہم محروم رہ گئے۔" فانی کی اس ذہنی کیفیت کے پیچھے صرف ان کی ذاتی زندگی کا دکھ درد اور ناکامی ہی نہیں بلکہ زمانے یا ماحول کے اثرات بھی کارفرما ہیں۔ اسی صورتِ حال نے فانی کی شاعری کو "فراریت" کا رنگ دے دیا، اور وہ موت میں پناہ تلاش کرنے لگے۔ فانی کا فن باوجود اپنی غمناکی کے حسن کارانہ ہے۔ اُن کے اشعار کے فلسفیانہ استدلال نے اُن کے لہجے کو ایک آفاقی حسن دے دیا ہے۔ انھوں نے جو لے چھیڑی تھی وہ انھیں کے ساتھ ختم ہو گئی، اُسے کوئی اور نہ نبھا سکا۔

فانی کے برخلاف جگر کی غزل ایک والہانہ انداز لیے ہوئے نظر آتی ہے۔ کلیم الدین احمد نے اُن کی شاعری کو قدیم و جدید رنگ تغزل کا ایک مضحک نمونہ بتایا ہے۔ سرور کا کہنا ہے کہ جگر کے یہاں جدید رنگ نہیں قدیم رنگ کا نکھار ہے۔" لیکن اگر حسرت کی غزل جدید ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جگر کی غزل کو جدید نہ کہا جائے۔ عشق کا والہانہ پن جگر کے ہاں حسرت سے کہیں زیادہ ہے۔ رہا حسن کا تصور تو جگر نے بھی متوسط طبقے کی محبوبہ کے حسن و ادا کو اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ اس ضمن میں جگر بعض اوقات ایسا رازِ دروں بیان کر جاتے ہیں جو حسرت کے بس میں کبھی نہ آسکا۔

ادھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی، اُن سے آہ بھی نہ ہوئی

جگر کی غزل کی سرشاری یا والہانہ پن اس سے نہیں ناپا جا سکتا کہ انھوں نے شراب پی اور

اور سماجی کشمکش سب کچھ ہے لیکن جس چیز نے فراق کو فراق بنایا وہ اُن کا طرزِ احساس ہے۔ اسی طرزِ احساس میں فراق کی فنکارانہ انفرادیت پوشیدہ ہے۔ اُن کی شاعری میں یہ طرزِ احساس کبھی سپردگی بن جاتا ہے کبھی لمس کی کیفیت۔ سردار جعفری نے "ترقی پسند ادب" میں فراق کو بنیادی طور پر "حسن کی جسمانیت" کا شاعر بتایا ہے لیکن یہ بات کچھ ادھوری ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر محمد حسن نے اس بات کو زیادہ صحیح الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "فراق کے کلام میں جسمانیات اور لمس سے روحانی کیفیت حاصل کرنے اور روحانی کیفیات سے جسمانی اور لمسیاتی انبساط حاصل کرنے کا دوہرا عمل بہت نمایاں ہے"۔ اسی عمل نے اُن کی شاعری میں جنسی جذبہ کو ایک پاکیزگی، رفعت اور طہارت دیدی ہے اور ایک ایسا گہرا جمالیاتی شعور پیدا کر دیا ہے جو اُردو غزل میں اس سے پہلے نہ تھا۔ علاوہ ازیں فراق کی غزل میں اکثر اوقات ہم ایک ایسی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں جو محویت اور حیرت کی ملی جلی کیفیت کہی جا سکتی ہے۔ اُن کے ہاں عشق کی نفسیاتی باریکیاں بھی ہیں اور ہم اکثر محسوس کرتے ہیں کہ یہ بات جس طرح فراق کہہ سکے ہیں کوئی اور نہیں کہہ سکا۔ فراق اس عہد کے بڑے شاعر ہیں، انھوں نے اُردو غزل کو نیا رنگ روپ دیا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی نے فراق کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "فراق کی عظمت اُن غزلوں پر قائم ہے جہاں انھوں نے ان کہی باتوں کو کہنے کی کوشش کی ہے یا جہاں اپنے طلسمی اثر سے زندگی کو فراوانی اور فروغ بخشا ہے اور اُن کے ہاں ایسی غزلوں کی کمی نہیں جو بے پایاں اور بے کراں بن جانا چاہتی ہوں"۔

سیماب اکبرآبادی کہنے کے لئے تو داغ کے شاگرد تھے لیکن انھوں نے اپنا راستہ خود بنانا چاہا اور اس دور کے تمام رجحانات کو غزل میں سمیٹنے کی کوشش کی۔ وہ قادر الکلام شاعر ضرور تھے، انھوں نے صرف عاشقانہ ہی نہیں فلسفیانہ مضامین کی طرف بھی توجہ دی اور زندگی کی ابدی حقیقتوں کو اشعار میں سمویا لیکن یہ ابدی حقیقتیں اُن کے اشعار میں خارجی طور پر سموئی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، جذبہ یا ایمان و ایقان بنکر نہیں اُبھرتیں۔ بیان میں بھی بعض جگہ جدت اور ندرت اجنبیت کی حد تک پہونچ گئی ہے۔ پھر بھی اس دور کے مشاہیر میں ہم اُنھیں کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہی زمانہ حفیظ جالندھری کی شاعری کا بھی ہے۔ حفیظ نے جو نظم نما گیت یا گیت نما نظمیں لکھی ہیں، اُن میں ایک سُریلا پن پایا جاتا ہے اُن کی غزلوں میں بھی یہ سُریلا پن آیا ہے۔ یہ سُریلا پن اُن کی غزل کی سادگی کی جان ہے۔ حفیظ کی سادگی نہ میر درد کی سادگی ہے نہ حالی کی۔ اُن کی سادگی کا راز اس میں ہے کہ وہ لفظوں کو بڑے چاؤ اور ملائمت سے استعمال کرتے ہیں البتہ موضوع کی کوئی گہرائی ان کے ہاں نہیں ملتی۔ غمِ عشق اور غمِ روزگار کے عام موضوعات کے سوا زاہد سے مزے کی چھیڑ چھاڑ کر لیتے ہیں۔ البتہ اقبال سہیل غزل کے رمز و کنایات اور استعارات

میں سیاسی حقائق کو بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے بقول سرور، غزل کے بلیغ اشاروں میں ہماری قومی جد وجہد کی پوری داستان بیان کردی ہے۔" سہیل کے یہاں کیونکہ تغزل کے سارے آداب برقرار ہیں اس لئے اُن کی خصوصیت پر عام نگاہیں نہیں پڑ سکی ہیں۔

اختر شیرانی اس دور کے اہم رومانی شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔ سردار جعفری نے بہت صحیح تجزیہ کیا ہے کہ "اختر کا عشق افلاطونی اور جنسی محبت دونوں کے خمیر سے تیار ہوا ہے۔ اُس کی ابتدا تو جنسی اور جسمانی محبت سے ہوئی ہے لیکن اس کی معراج تخیلی محبت ہے۔" اُن کی دنیا سلمیٰ اور ریحانہ کے عشق کی داستانوں تک محدود ہے۔ انھوں نے بہت سی خوبصورت نظمیں دی ہیں جن میں بے باکی بھی ہے اور والہانہ پن بھی لیکن اُن کی شاعری فلسفیانہ گہرائیوں سے تہی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ہم کوئی فلسفۂ عشق بھی تلاش کرنا چاہیں تو مایوسی ہوگی۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے اُن میں کہیں کہیں چونکا دینے والی بات مل جاتی ہے ورنہ زیادہ تر معمولی اشعار ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اردو نظم ہی کو نہیں اردو کو بھی "عورت" دی ہے۔ ویسے تو اُردو کی ابتدائی دکنی غزلوں میں عورت کا وجود تھا جو فارسی کے اثر سے مٹ کے رہ گیا پھر بھی اختر نے اُسے دوبارہ زندہ کیا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اختر نے عورت کو اُردو نظم میں تو جگہ دلوادی، اُردو غزل میں آج بھی اُس کی جگہ نہیں بن سکی ہے۔

ساغر نظامی بھی بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں اُن کی ابتدائی عمر کی غزلوں میں ایک شگفتگی ضرور ملتی ہے، بعد کی غزلوں میں جہاں انہوں نے مفکرانہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کی ایک قسم کا بوجھل پن آگیا ہے۔ روش صدیقی کی غزلوں میں الفاظ اور تراکیب کا حسن ایک بار اپنی طرف متوجہ کرتا ہے لیکن ان کا موضوع فرسودہ ہے، کہیں کہیں حسنِ بیان سے شعر میں ایک چلبلا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ عندلیب شادانی ایک رچا ہوا کلاسیکی مزاج رکھتے تھے۔ شعر کی ایک مخصوص تہذیب کے دلدادہ تھے اور عشقیہ دائرے سے باہر نکلنا نہیں چاہتے تھے، اُن کی شاعری اپنی نوک پلک کی درستگی سے بھی اپنی جانب نظر کو کھینچتی ہے۔ آنند نرائن ملا نے اس دور میں لکھنؤ اسکول کی زندہ روایات کو اپنی غزل میں جگہ دی ہے۔ اُن کی ابتدائی غزلوں میں تو نہیں بعد کی غزلوں میں ایک فنکارانہ نکھار اور وسیع النظری کا احساس ہوتا ہے۔ احسان دانش کی غزلوں میں غمِ عشق بھی ہے اور غمِ روزگار بھی، ان کی چیدہ غزلوں میں ایک انفرادی لہجہ بھی پایا جاتا ہے بنیادی طور پر چونکہ وہ نظم گوئی کی طرف راغب ہیں اس لئے غزل کو وہ بہت کچھ نہیں دے سکے ہیں۔ عرش ملسیانی، ہری چند اختر، تاثیر اور سیف کی غزلیں اپنے اندازِ بیان کی دلکشی کی وجہ سے ایک تاثیر رکھتی ہیں۔ عرش ملسیانی کی غزلیں متوازن کہی جا سکتی ہیں۔ ہری چند اختر

نے شعروں میں ایک تیکھا پن ہے، تاثیر اور سیف کے ہاں بات کہنے کا ایک انداز ملتا ہے اور سہل و ممتنع کا لطف بھی۔ عدم کی ابتدائی غزلیں ہمیں اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہتیں۔ ان میں جو رچاؤ ہے وہ ان کی بعد کی غزلوں میں نہیں ملتا۔ بعد کی غزلوں کی خصوصیت ایک تیکھا پن اور جرأت مندانہ اظہار بیان ہے جس نے ان کے لہجہ کو ایک بے نیا زانہ بیبا کی دیدی ہے۔ میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اگر عدم کی اس غزلوں کا کڑا انتخاب کیا جائے تو عدم غزل گوئی میں اپنا ایک نمایاں اور مخصوص مقام کر سکیں گے۔ اردو غزل میں ایک نیا تجربہ شاد عارفی کی غزلوں میں ملتا ہے۔ ان کے ہاں زندگی کے گہرے مطالعہ کا احساس تو نہیں ہوتا ایک جھنجھلاہٹ پائی جاتی ہے اور اس جھنجھلاہٹ میں وہ تمام حسن و عشق کے تکلفات اور سماجی تخیلات پر ضرب لگاتے نظر آتے ہیں۔ لیکن جو طرز بیان اور لہجہ انھوں نے اپنایا وہ اس شاعر کا لب و لہجہ نہیں محسوس ہوتا جو رگ و پے میں زہر غم اتر جانے کے بعد لب کشائی کرتا ہے۔ ان کا لب و لہجہ انھیں پر ختم ہو جاتا ہے، ان کی قدر صرف ایک نیا تجربہ کرنے والے کی حیثیت سے کی جا سکتی ہے۔

اس کے بعد جو شاعروں کا گروہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں کا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے ادب میں فراریت، بے مغز روحانیت، ماضی پرستی اور انسانی استحصال کی مخالفت میں آواز اٹھائی اور سائنسی عقل پسندی اور تنقیدی حقیقت نگاری کو لازمی قرار دیا۔ اس تحریک نے ادب کے ہر شعبہ کو متاثر کیا، جہاں تک شاعری کا تعلق ہے زیادہ زور نظموں پر رہا اور اس پر بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس تحریک سے وابستہ شاعروں نے اردو ادب کو متعدد جاندار نظمیں دیں۔ اس تحریک کے اثر سے نظم تو خاصی پھولی پھلی لیکن ترقی پسندی کی اندھی دھن میں بعض کونوں سے غزل کی مخالفت بھی ہونے لگی۔ ان میں جوش ملیح آبادی پیش پیش تھے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ صرف چند ترقی پسند ہی غزل کی مخالفت پر نہیں تلے تھے کلیم الدین احمد بھی اسے "نیم وحشی صنف سخن" کہنے پر اتر آئے تھے۔ ترقی پسند تحریک کا مطلب غزل کی مخالفت سے دراصل ان فرسودہ اور غیر جمہوری اور رسمی صوفیانہ مضامین کی مخالفت تھا جو غزل کو گھن کی طرح چاٹ رہے تھے۔ اس زمانے میں ترقی پسندوں میں کئی نے نہ صرف غزل کی طرف توجہ دی بلکہ اسی کو اپنا فن قرار دیا۔ ان میں خاص طور پر ہم جذبی، فیض اور مجروح کے نام گنوا سکتے ہیں۔ جذبی کا فن غزل ہی کا فن ہے۔ اگرچہ ان کی غزلوں میں ایک یاس اور دردمندی ہے لیکن اسے ہم ان کا اپنا دکھ درد کہہ کر عصری آگہی سے الگ نہیں کر سکتے۔ سرور نے لکھا ہے کہ "ان کے غم میں ایک وسعت اور ان کے ماتم میں سیکڑوں دکھے ہوئے دلوں کی فریاد آجاتی ہے۔" پہلے شاعر غم روزگار سے بھاگ کر غم عشق میں پناہ لے لیتا تھا لیکن سماجی اور سیاسی حالات اور معاشی الجھنوں نے

اس دور کے ذہن کی اس طرح پرداشت کی ہے کہ یہ پناہ ناکامی ہوگئی ہے۔ جذبی ہر غم کو اپنے حیاتی تجربہ میں ڈھال کر اپنی شخصیت کا جزو بنا لیتے ہیں۔ اور بقول محمد حسن "تجمہ کا یہی عمل ان کے تغزل کی جان ہے۔ ان کی جو غزل میں نے اس انتخاب میں لی ہے وہ میرے خیال میں ان کی نمائندہ غزل ہے۔ اس غزل میں ان کا "فاموشی الم" ان کے شاعرانہ خلوص سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ اسی دور میں مجاز نے بھی غزلیں کہیں۔ مجاز کی جو غزل اس انتخاب میں شامل ہے اس میں اس کی مزاجی کیفیت کا پورا اظہار ہے اور ساتھ ہی سماجی حالات کی جبریت کا احساس بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔ سردار جعفری کی غزلیں سے

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا　　اور

شکست شوق کو تکمیل آرزو کہیے

اُن کی غزل سے موجودہ آہنگ کو پوری طرح پیش کرتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کے رچے ہوئے ذوق کی بھی غماز ہیں جس میں کلاسیکی عناصر کی آمیزش ہے اور ساتھ ہی اُن کے سماجی شعور کی عکاسی بھی۔

اس دور میں فیض کی شاعری ایک نئی آواز بن کر اُبھری۔ اس شاعری میں جدید مغربیت اور قدیم مشرقیت ملی جُلی نظر آتی ہے۔ فیض بھی اُن تمام عصری تخیلات اور سماجی میلانات کو لے کر آئے تھے جو ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ لیکن اُن کی غزل پر روایت کے گہرے اثرات ہیں البتہ اس روایت کو انھوں نے ایک نئی زندگی دی ہے اور اس میں اُن کے بصیرت افروز احساس کو بڑا دخل ہے۔ فراق، فیض کی غزل میں نکور احساس کی ایک نئی تکنیک پاتے ہیں جو اُن کے خیال میں اس دور کی ترجمانی کے لئے نہایت موزوں ہے۔ فیض کی اس نئی تکنیک میں ہم کو اُن کی شاعرانہ تشبیہیں اور تصویریں زندگی کی صداقتوں سے متحد نظر آتی ہیں۔ اُن کے لہجے کی جذباتی کش مکش بھی مختلف ذہنی تصویریں بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس تمام حسن، شعریت اور نغمگی کے باوجود فیض کی شاعری یا غزل اتنی متنوع نہیں کہ میر، غالب اور اقبال کی شاعری یا غزل پر سبقت لے جائے۔ مجنوں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ہے کہ "فیض کی اہمیت بھی اسلوبی اجتہادات پر مبنی ہے"۔ یہ صحیح ہے، پھر بھی فیض نے جو کچھ اسلوبی اجتہاد کی صورت میں اُردو غزل کو دیا ہے وہ بالکل نئی چیز ہے۔ زندگی کے عرفان، بہتر زندگی کے لئے جہاد اور حسن کی ادا شناسی کو جس فنکارانہ چابک دستی سے فیض نے سمویا ہے اور جو نغمگی اور شعریت غزل میں بھر دی ہے اس کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔ فیض کی نظموں اور غزلوں نے بہت سے شاعروں پر اپنا اثر ڈالا لیکن آنے والے زمانے میں یہ اثر باقی رہتا نظر نہیں آتا۔ ندیم قاسمی کی نظموں اور غزلوں کے موضوعات تو وہی ہیں جو ترقی پسند ادب میں اُبھرے اور پروان چڑھے البتہ ان کا ایک سیدھا سادا لہجہ ہے جس میں ایک چھپی ہوئی شعریت موجود ہے۔ کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی بھی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں ان کے فن کا کمال نظموں ہی میں اپنا اصل روپ دکھاتا ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ اس انتخاب میں جو

غزل کیفی کی شامل ہے اس میں لہجہ کا وہی آہنگ ڈھل گیا ہے جو اُن کی نظموں کا خاصہ ہے۔ ساحر نے اپنے ابتدائی دور میں کئی رچی ہوئی غزلیں کہیں لیکن یہ دو غزلیں جو اس انتخاب میں ہیں ان کے موجودہ رنگ کی نمائندگی کرتی ہیں جس میں راست اظہار کی تکنیک کے ساتھ طنز کا ایک نشتری رجحان پایا جاتا ہے۔ علی جواد زیدی اور سلیمان اریب کی غزلیں بھی اپنے سلیقے کی بنا پر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ ایک اور اہم نام ترقی پسند غزل کے سلسلے میں مجروح کا ہے۔ مجروح کو نظم سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ انھوں نے غزل ہی میں ترقی پسند خیالات کو نئے انداز اور نئے بانکپن کے ساتھ پیش کیا۔ غزل کی کلاسیکی تیکنیک پر مجروح کو پورا عبور ہے، اور قدیم ادبی ورثے کا گہرا مطالعہ بھی۔ خوبصورت بندشیں اور خوشنما ترکیبیں اُن کی غزل کی معنویت کو ایک ایسا حسن ایک ایسی شعریت اور ایک ایسی فضا دیدیتے ہیں جو مسحور کن ہوتی ہے۔ مجروح کی غزل اور اس کا فن دقت آمیز ہے اس لئے اُن کی تقلید کسی سے نہ ہوسکی۔

اس ترقی پسند تحریک کے زمانے میں اور دو اہم شاعر غلام ربانی تاباں اور پرویز شاہدی ہیں۔ دونوں نے خوبصورت غزلیں کہی ہیں۔ دونوں کا آہنگ کلاسیکی ہے۔ تاباں کی غزل میں، لذتِ جستجو اور ذوقِ سفر سے ہم آشنا ہوتے ہیں لیکن اُن کا بیان خوبصورت ہونے کے باوجود یکسانیت کا شکار ہے۔ اور لہجہ کا اتار چڑھاؤ جو جذباتی کشمکش کا آئینہ دار ہوتا ہے، نہیں ملتا۔ پرویز شاہدی کی غزلوں میں عقیدے کی استواری اور زندگی کے حوصلے کا احساس ہوتا ہے۔ اس دور میں ایسے اور بھی کتنے شاعر نظر آتے ہیں جن میں اکثر ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہ تھے، پھر بھی جن کی غزلوں میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی تاب و تپش سموئی ہوئی ہے۔ سکندر علی وجد کی غزل اپنی سلاست اور کیف آفرینی سے پہچانی جاتی ہے۔ شاہد صدیقی میں عصری آگہی کا حسن ملتا ہے۔ اعجاز صدیقی کی غزل میں روز بہ روز عصری احساسات جگہ پاتے جارہے ہیں جس کی وجہ سے لہجے کی دھار تیز ہوتی جارہی ہے۔ شمیم کرہانی کے طرزِ احساس میں ایک تیکھاپن ہے جو جدید حسیت سے کسی قدر قریب ہے۔ خورشید احمد جامی کی ابتدائی غزلوں میں نئی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ محمد حسن نے اپنے مضمون "نئی غزل کی آہنگ شناسی" میں لکھا ہے کہ "پچھلے دس سال کی غزل کا سب سے بڑا کارنامہ خورشید احمد جامی کی غزل ہے"۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ جامی کی غزل یقیناً قابلِ قدر ہے لیکن اس دور میں اس پائے کی غزلیں دوسروں کے ہاں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ نادشن پرتاب گڈھی کی غزلیں فنی اعتبار سے مکمل ہی نہیں بلکہ انفرادی میلانات کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ نشور واحدی کا انداز رنگین ہے، بہت خوبصورت شعر کہتے ہیں لیکن فکر کی گہرائی محسوس نہیں ہوتی۔ قتیل کی غزل بھی نشور کی طرح خوبصورت غزل ہے۔ مجید امجد اور گوپال متل کی غزلوں میں فکر کے زاویے ملتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ایک شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ میکش اکبرآبادی کے ہاں ایک ندرتِ احساس پائی جاتی ہے۔ آل احمد سرور کی یہ غزل جو اس انتخاب میں شامل ہے نئی حسیت سے بھرپور ہے۔ جگن ناتھ آزاد کی غزل عشقیہ

خیالات تک محدود نہیں اُن کے ہاں عصری رجحانات کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں۔ سلام مچھلی
شہری نے شاعری میں بڑے تجربات کئے ہیں۔ نظموں میں بھی اور غزلوں میں بھی، لیکن وہ کسی
تجربے کو فن کے درجہ تک پہونچانے سے پہلے دوسرے تجربے کی طرف ملتفت ہوتے رہے ہیں۔
اُن کی جو غزل اس انتخاب میں شامل ہے وہ اُن کی ابتدائی غزلوں سے لی گئی ہے جس
میں ایک کلاسیکی طرزِ ادا موجود ہے۔

مخدوم ویسے تو نظم ہی کے شاعر تھے لیکن آخری زمانے میں غزلوں کی طرف متوجہ
ہوئے اور اسی لئے مخدوم کا ذکر میں آخر میں کر رہا ہوں۔ مخدوم کا کہنا تھا کہ غزل چالیس سال کے بعد
ہی کہی جا سکتی ہے۔ مراد یہ تھی کہ غزل کے لئے جو فنی پختگی درکار ہے وہ بڑے ریاض کی چیز ہے
مخدوم کی غزلوں میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا ایک حسین توازن ملتا ہے۔ اُن کا یہ شعر غزل کی شاعری
پر ایک تنقیدی بصیرت کی حیثیت رکھتا ہے اور خود اُن کی شاعری پر صادق آتا ہے۔

دلوں کی تشنگی جتنی، دلوں کا غم جتنا
اُسی قدر ہے زمانے میں حسنِ یار کی بات

احسن علی مرزا نے لکھا ہے کہ "اُن کی غزل تہذیبی انقلاب کی ضرورت کا احساس پیدا کرتی ہے"
ڈاکٹر محمد حسن کی رائے میں "مخدوم کی غزلیں تاب و مقاومت کے صحیفے ہیں جو تیرگی میں تیشے کی
چمک سے مشابہ ہیں" یہ دونوں رائیں مخدوم کی غزل کے شایاں ہیں۔ مخدوم کی ان غزلوں میں اُن
کے طرزِ احساس کی بنا پر ایک ایسا حسن پیدا ہوگیا ہے جو فیض اور مجروح کی غزلوں سے مختلف ہے۔

آخر میں اپنی غزل کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا میری بالکل ابتدائی غزلیں جو میں نے
۳۴ء، ۳۵ء میں کہی تھیں۔ اپنی سادگی اور لہجے سے الگ پہچانی جاتی تھیں۔ درمیانی دور میں میری غزل
نظم کے زیر اثر آ گئی، لیکن اس طرف جو غزلیں میں نے کہی ہیں اُن میں کلاسیکی رنگ کے ساتھ جدید حسیت
پائی جاتی ہے۔ وہ نہ صرف اپنے طرزِ احساس کے لحاظ سے نئی کہلانے کی مستحق ہیں بلکہ فنی طور پر بھی ایک
نئے رخ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں غزل کو آج کا ذہن اور آج کا فن دے سکا ہوں۔

اُردو غزل آج کس سمت جا رہی ہے، اس کا مستقبل روشن ہے یا تاریک، یہ سوالات
بہت اہم ہیں۔ ہمارے سامنے آج شعراء کی ایک نئی نسل ہے جو غزل ہی کو نہیں پوری اُردو شاعری کو
ایک نیا موڑ دے رہی ہے اور ایک الگ انتخاب کی مستحق ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ انسانیت
کی مشترک قدروں کو ادب کی بنیاد بنانا چاہتے ہیں، کسی خاص نظریئے کو زندگی پر لادنا نہیں چاہتے۔ وہ
مادی اور ارضی حقیقتوں کے تجزیئے پر زور دیتے ہیں اور موجودہ انسان کے ذہنی کرب کو دیانت کے
ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔ آج کا انسان جذباتی متضادات کا بُری طرح
شکار ہے، وہ ہر لمحہ اپنے اندر ٹوٹتا اور بنتا رہتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جدید شاعری یا جدید غزل کے نام پر
جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ سب کا سب بڑا قیمتی سرمایہ ہے، پھر بھی یہ کہنے میں سچائی ہے کہ ایک نئی نظم
اور ایک نئی غزل نے جنم لینا شروع کر دیا ہے، ایک نیا طرزِ احساس پیدا ہو رہا ہے جو فن کو ایک

نیا روپ اور نیا جمال دے رہا ہے۔ نئی شاعری یا نئی غزل کے خالقوں کو البتہ یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے، چاہے جو بھی ادبی تجربہ کریں، کہ وہ تجربہ ادب کے پورے سرمایہ کے کردار اور مزاج کے مطابق ہو، تاکہ وہ اجتماعی آہنگ کا جزو بن سکے یہ نہ ہو کہ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ بن کر رہ جائے۔ جہاں تک زبان اور بیان کا تعلق ہے جدید غزل کا لہجہ یگانہ چنگیزی کے لہجے سے ایک حد تک متاثر نظر آتا ہے وہ نئی علامتیں اور نئی پیکر تراشی، نئی طرز فکر اپنے ساتھ لائی ہے اور مجھے یقین ہے کہ غزل روز بروز زیادہ تہیں اور گہرائیاں اپنے میں پیدا کرتی جائے گی، درمیانی منزلیں کٹھن سہی لیکن جدید شاعر ان کٹھن منزلوں سے گذرنے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔

جاں نثار اختر
۱۰ جون ۱۹۷۱ء
بمبئی

پہلا باب

ولی دکنی

۱۶۶۸ — ۱۷۴۴

ولی دکنی

شمس الدین محمد ولی اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ تعلیم احمد آباد میں پائی۔ ابتدائی کلام اس زمانہ کی دکنی زبان اور انداز میں ہے مگر دہلی گئے تو دہلی والوں پر اثرانداز ہوئے اور خود دہلی والوں سے بھی بڑی حد تک متاثر ہوئے۔ اس وقت دہلی میں تعلیم یافتہ طبقہ کی تحریری سرگرمی فارسی کی حد تک تھی۔ لیکن ولی کے کلام نے ان کے ہمعصروں کو اردو میں غزلیں کہنے پر مائل کیا۔ اس طرح خود ولی نے بھی دہلی کے صاحب کمال افراد سے کسب فیض کیا۔ ان کی ابتدائی اور آخری زمانہ کی غزلوں میں نمایاں فرق تھا۔ بعض اشعار تو آج کا کلام جان پڑتے ہیں۔ ؎

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

اردو شاعری کے باوا آدم ولی کے بارے میں میر تقی میر "نکات الشعراء" میں لکھتے ہیں۔
"از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد"

ولی دکنی

○

کیا مجھ عشق کوں ظالم نے آب آہستہ آہستہ
کہ آتش گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل رو سوں
خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

مرے دل کوں کیا بے خود تری انکھیاں نے آخر کوں
کہ جیوں بیہوش کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

ادا و ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سوں
کہ جیوں مشرق سوں نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

ولی مجھ دل میں آتا ہے خیال یار بے پروا
کہ جیوں انکھیاں میں در آتا ہے خواب آہستہ آہستہ

○

سرود عشق گاویں ہم، اگر وہ عشوہ ساز آوے
بجاویں طبل شادی کے، اگر وہ دلنواز آوے

خمار ہجر نے جس کے دیا ہے درد سر مجھ کوں
رکھوں نشہ نمن انکھیاں میں گر وہ مست ناز آوے

جنون عشق میں مجھ کوں نہیں زنجیر کی حاجت
اگر میری خبر لینے کوں وہ زلف دراز آوے

ولی اُس گوہر کان حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آتا ہے جوں سینے میں راز آوے

○

شراب شوق سے سرشار ہیں ہم
کبھی بے خود، کبھی ہشیار ہیں ہم

صنم تیرے نین کی آرزو میں !
کبھی سالم، کبھی بیمار ہیں ہم

ولی وصل و جدائی سوں سجن کی
کبھی صحرا، کبھی گلزار ہیں ہم

ولی دکنی

یاد کرنا ہر گھڑی اُس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

عاقبت کیا ہووے گا معلوم نئیں
دل ہوا ہے مبتلا دلدار کا

کیا کہے تعریف دل ہے بے نظیر
حرف حرف اُس مخزنِ اسرار کا

گر ہوا ہے طالبِ آزادگی
بندہ مت ہو سبحہ و زنّار کا

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

اے ولی ہونا سری جن پر نثار
مدعا ہے چشمِ گوہر بار کا

میں تجھے آیا ہوں ایماں بوجھ کر
باعثِ جمعیتِ جاں بوجھ کر

بلبلِ شیراز کوں کرتا ہوں یاد
حسن کوں تیرے گلستاں بوجھ کر

دل چلا ہے عشق کا ہو جوہری
لب ترے لعلِ بدخشاں بوجھ کر

ہر نگہ کرتی ہے نقاشے کی مشق
خط کو تیرے خطِ ریحاں بوجھ کر

اے سجن آیا ہوں ہو بے اختیار
تجھ کوں اپنا راحتِ جاں بوجھ کر

زلف تیری کیوں نہ کھاوے پیچ و تاب
حال مجھ دل کا پریشاں بوجھ کر

رحم کر اُس پر کہ آیا ہے ولی
دردِ دل کا تجھ کوں درماں بوجھ کر

شہ کرے

ولی دکنی

○

فدائے دلبر رنگیں ادا ہوں
شہید شاہدِ گل گوں قبا ہوں

ہر اک مہ رو کے ملنے کا نہیں ذوق
سخن کے آشنا کا آشنا ہوں

کیا ہوں ترک نرگس کا تماشا
طلب گارِ نگاہِ باحیا ہوں

نہ کہہ شمشاد کی تعریف مجھ پاس
کہ میں اُس سرو قد کا مبتلا ہوں

کیا میں عرض اس خورشید رو سوں
تو شاہِ حسن میں تیرا گدا ہوں

سدا رکھتا ہوں شوق اس کے سخن کا
ہمیشہ تشنۂ آبِ بقا ہوں

قدم پر اس کے رکھتا ہوں سدا سر
ولی ہم مشربِ رنگِ حنا ہوں

○

خوب رو خوب کام کرتے ہیں
یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

دیکھ خوباں کو وقت ملنے کے
کس ادا سوں سلام کرتے ہیں

کیا وفادار ہیں کہ ملنے میں
دل سوں سب رام رام کرتے ہیں

کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں و لے
کام اپنا تمام کرتے ہیں

کھولتے ہیں جب اپنی زلفاں کو
صبحِ عاشق کوں شام کرتے ہیں

صاحبِ لفظ اس کو کہہ سکیے
جس سوں خوباں کلام کرتے ہیں

دل لجاتے ہیں اے ولی میرا
سرو قد جب خرام کرتے ہیں

دوسرا باب

شاہ حاتم	۱۶۹۹ - ۱۷۹۱
مظہر جان جاناں	۱۶۹۸ - ۱۷۸۱
میر تقی میر	۱۷۱۰ - ۱۸۱۰
سودا	۱۷۱۳ - ۱۷۸۱
درد	۱۷۲۰ - ۱۷۸۴
قائم	۱۷۳۰ - ۱۷۹۴
تاباں	؟ - ۱۷۵۴
یقین	۱۷۲۷ - ۱۷۵۵
میر حسن	۱۷۲۷ - ۱۷۸۶
سراج اورنگ آبادی	۱۷۱۰ - ۱۷۶۶

شاہ حاتم نہ صرف دہلی کی شاعری کے بانی کہے جاتے ہیں بلکہ استادی شاگردی کے سلسلے کی بنا بھی ان ہی سے پڑی اور وہ کہنا چاہیئے کہ اپنے کلام سے زیادہ شاگردوں کے لئے مشہور ہوئے جن میں سے سوداؔ۔ تاباںؔ، بقاؔ، اثرؔ اور رنگیںؔ کو خصوصیت حاصل ہے۔ ان کا سلسلۂ تلمذ اقبالؔ اور حسرتؔ موہانی تک پہونچتا ہے، شاہ حاتم نے زبان کی اصلاح بھی کی اور بے شمار بھونڈے و نامانوس الفاظ کو حذف کر کے ان کو وہ شکل دی جو آج تک معمولی تبدیلیوں کے ساتھ مروج ہیں۔ ان کا مکمل دیوان نایاب ہے البتہ ایک مختصر دیوان" بنام" دیوان زادہ "کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کی زینت ہے۔ انتخاب کلام حسرتؔ موہانی نے شائع کیا تھا ؎

ہم سیہ بختوں سے اتنا کیلئے ناحق پیچ و تاب
نام لیں ہم زلف کا عشق سن کے بل کھاتے ہیں آپ

حاتم

جب سے تری ادائیں عالم کو بھائیاں ہیں ۱
تب سے جہاں میں تو نے دھومیں مچائیاں ہیں
ٹک اک سرک سرک کر آ بیٹھنا بغل میں
کیا اچپلائیاں ہیں اور کیا ڈھٹائیاں ہیں
زلفوں کا بل بناتے آنکھیں چرا کے چلنا
کیا کم نگاہیاں ہیں، کیا کج ادائیاں ہیں!
آئینہ روبرو رکھ اور اپنی سج بنانا
کیا خود پسندیاں ہیں، کیا خود نمائیاں ہیں

ابر بھی یادِ یار آوے ہے — گریہ بے اختیار آوے ہے
اے صبا کس طرف کو گزری تھی — تجھ سے بوئے نگار آوے ہے

زندگی دردِ سر ہوئی حاتم — کب ملے گا مجھے پیا میرا

ہماری سیر کو گلشن سے کوئے یار بہتر تھا
نفیرِ بلبلاں سے نالہائے زار بہتر تھا

کبھی بیمار سن کر وہ عیادت کو تو آتا تھا
ہمیں اپنے بھلے ہونے سے وہ آزار بہتر تھا

ہماری عقل میں گھر کی گرفتاری سے حاتم کو
کہو دیوانہ پھرے، کوچہ و بازار بہتر تھا

مظہر

تیموری خاندان کے مرزا مظہر جانِ جاناں کے کلام میں رنگِ تصوف غالب ہے، عالم و فاضل اور صوفی تھے اور شاعر تو تھے ہی لیکن اپنے دَور اور زمانہ کے عام رنگ سے منفرد و علیحدہ اندازِ شاعری تھا۔ ایہام کے طرز کو ترک کرکے فارسی بندشوں اور بلند مضامین کو شاعری میں داخل کرنے میں ان کا خاص حصہ تھا۔

میر تقی میرؔ نکات الشعرا میں لکھتے ہیں:۔

"مردیست مقدس۔ مظہرؔ، درویش، عالم، صاحب کمال، شہرۂ عالم، بے نظیر، معزز، مکرم۔ اکثر اوقات در یادِ الٰہی صرف میکنند۔ خوش تقریر بمرتبہ است کہ در تحریر نمی گنجد۔" ہے

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے، لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

مرزا مظہر جانجاناں

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی
مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشقِ بدگماں اپنا

جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں کرتا ہے دشمن سے
غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو اے ظالم
کہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جانِ جاں اپنا

○

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

لوگ کہتے ہیں موا مظہرِ بیکس افسوس
کیا ہوا اس کو، وہ اتنا بھی تو بیمار نہ تھا

○

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

میر محمد تقی اردو غزل کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ خود استادانِ سخن ان کے رتبہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس عقیدتمندی کی وجہ یہ ہے کہ میر کے یہاں سچے اور حقیقی جذبات مناسب الفاظ میں اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اور یہ صفات غزل کی شاعری کی جان ہیں۔ میر تقی میر ان نازک طبع لوگوں میں سے تھے جو دنیا اور دنیا والوں سے نباہ نہیں کرپاتے۔ ان کی شاعری میں ہر جگہ اس کیفیت کا اثر اور جھلک موجود ہے۔ اکبر آباد میں پیدا ہوئے مگر عمر کا بڑا حصہ دہلی اور لکھنؤ میں گزرا۔ اس عظیم شاعر کی پوری زندگی پریشاں حالی سے معتبر رہی۔

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخمِ خواہشِ دل میں تو بوتا ہے کیا

میر تقی میر

ہاتھ سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا
سب کہیں گے یہ کہ کیا اک نیم جاں مارا گیا

اک نگہ کے بیش کچھ نقصاں نہ آیا اُسکے تئیں
اور میں بے چارا تو اے مہرباں مارا گیا

وصل و ہجراں یہ جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

جس نے سر کھینچا دیارِ عشق میں اے بوالہوس
وہ سراپا آرزو آخر جواں مارا گیا

کب نیازِ عشق، نازِ حسن سے کھینچے ہے ہاتھ
آخر آخر میرؔ سر بر آستاں مارا گیا

اب دو تو جام خالی ہی دو، میں نشے میں ہوں
یارو مجھے معاف کرو، میں نشے میں ہوں

مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ
جو چاہو تم بھی مجھکو کہو، میں نشے میں ہوں

یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانندِ جامِ مے
یا تھوڑی دُور ساتھ چلو، میں نشے میں ہوں

معذور ہوں جو پاؤں مرا بے طرح پڑے
تم سرگراں تو مجھ سے نہ ہو، میں نشے میں ہوں

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میرؔ جی
جوں شیشہ میرے منھ نہ لگو، میں نشے میں ہوں

دل پُر خوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

جی ڈھا جائے ہے سحر سے آہ
رات گزرے گی کس خرابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

بُرقع اُٹھتے ہی چاند سا نکلا
داغ ہوں اُس کی بے حجابی سے

کام تھے عشق میں بہت سے میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش شراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز!
اسی خانہ خراب کی سی ہے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

میر تقی میر

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا! اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت جاگے تھے، صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی!
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے، پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے، سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا، یا دن کو جوں توں شام کیا

صبحِ چمن میں اس کو کہیں تکلیفِ ہوا لے آئی تھی
رخ سے گل کو مول لیا، قامت سے سرو غلام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو، ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

میر تقی میرؔ

○

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جلنے کا نہایت غم رہا

حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا

سنتے ہیں لیلیٰ کے خیمہ کو سیاہ
اس میں مجنوں کا ولے ماتم رہا

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

زلفیں کھولے تو تو ٹک آیا نظر
عمر بھر یاں کام دل برہم رہا

اس کے لب سے تلخ ہم سنتے رہے
اپنے حق میں آبِ حیواں سم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ چیتا، یاں بہت دن کم رہا!

○

فقیرانہ آئے، صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی
کہ مقدور تک تو دوا کر چلے

وہ کیا چیز ہے آہ! جس کے لیے
ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے

کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے

بہت آرزو تھی گلی کی تری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

ق

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی
حق بندگی ہم ادا کر چلے

پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

○

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہر گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشم مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے

آگے اس متکبر کے ہم خدا خدا کیا کرتے ہیں
کب موجود خدا کو وہ مغرور خود آرا جانے ہے

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے

چارہ گری بیماری دل کی رسم شہر حسن نہیں
ورنہ دلبر ناداں بھی اس درد کا چارا جانے ہے

کیا ہی شکار فریبی پر مغرور ہے وہ صیاد بچہ
طائر اڑتے ہوا میں سارے اپنا اتارا جانے ہے

مہر و وفا و لطف و عنایت اک سے نہ واقف ان میں سے
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارا جانے ہے

عاشق تو مردہ ہے ہمیشہ اٹھتا ہے دیکھے سے اسکے
یار کے آجانے کو یکایک عمر دوبارا جانے ہے

کیا کیا آفتیں سر پر اس کے لاتا ہے معشوق اپنا
جس بے دل بے تاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے

رخنوں سے دیوار چمن کے منہ کو لے ہے چھپا یعنی
ان سوراخوں کے ٹک رہنے کو سو کا نظارا جانے ہے

تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میرؔ بھی ناداں تلخی کش
دم دار آب تیغ کو اس کے آب گوارا جانے ہے

سودا

مرزا محمد رفیع سودا کو آبائی وطن دہلی اس وقت
چھوڑنا پڑا جب وہ ساٹھ سال کے ہو گئے۔ فرخ
آباد، فیض آباد سے شجاع الدولہ، بادشاہ اودھ
کے دربار کے ساتھ لکھنؤ منتقل ہوئے اور وہیں سے
عدم آباد انتقال کیا۔ حاتم کے شاگرد تھے۔
استاد کے فیض سے زیادہ اپنی ذہانت اور
قابلیت کے باعث شاعری کے وہ تمام مدارج طے
کئے جس کے لئے بہت سے شاعر ترستے ہیں۔
قصائد، فارسی کے اعلیٰ شعراء سے کم نہیں۔
قطعات، پہیلیاں، ہجویں اور مثنویاں سب کچھ
لکھ گئے ہیں۔ اردو میں مسدس کی شکل میں مرثیہ
لکھنے والے غالباً پہلے شاعر سودا ہی تھے۔

کب سے اے سودا شراب اس بزم میں پیتے ہیں یار
تو نے اے کم ظرف کی پہلے ہی پیمانے میں دھوم

مرزا رفیع سودا

غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں
جلوہ گر یار مرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں

مہر ہر ذرے میں مجھ کو ہی نظر آتا ہے
تم بھی ٹک دیکھیو صاحب نظراں ہے کہ نہیں

پاس ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل
ورنہ یاں کون سا اندازِ فغاں ہے کہ نہیں

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

جُرم ہے اُس کی جفا کا کہ وفا کی تقصیر
کوئی تو بولو میاں، منہ میں زباں ہے کہ نہیں

پوچھا اک روز میں سودا سے کہ اے آوارہ
تیرے رہنے کا معیّن بھی مکاں ہے کہ نہیں

یک بیک ہو کے برآشفتہ لگا یوں کہنے
کچھ تجھے عقل سے بہرہ بھی میاں ہے کہ نہیں

دل کو جن کے ہے تعلق یہ مکاں کیا جانے
عدم و ہستی اُنھوں کے یکساں ہے کہ نہیں

دیکھا میں قصر فریدوں کے در اوپر اک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

مرزا رفیع سودا

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانئے ورنہ
کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی

اے ابر قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے
تجھ چشم سے ٹپکا ہے کبھو لخت جگر بھی

کس ہستیٔ موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار
کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی

تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش!
رہتا ہے سدا چاک گریبان سحر بھی

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

بہار بے سپر جام و یار گزرے ہے
نسیم تیر سی سینے کے پار گزرے ہے

شراب حلق سے ہوتی نہیں فرو تجھ بن
گلوئے خشک سے تیغ آبدار گزرے ہے

گزر مرا ترے کوچے میں گر نہیں تو نہ ہو!
مرے خیال میں تو لاکھ بار گزرے ہے

میں وہ نہیں کہ کوئی مجھ سے مل کے ہو بدنام
نہ جانے کیا تری خاطر پہ بار گزرے ہے

مجھے تو دیکھ کے جوش و خروش سودا کا
اسی ہی سوچ میں لیل و نہار گزرے ہے

یہ آدمی ہے کہ سر مارتا پھرے ہے بسنگ
کہ باد تند سوئے کوہسار گزرے ہے

سودا

نہ غنچے گل کے کھلتے ہیں نہ نرگس کی کھلیں کلیاں
چمن میں لے کے خمیازہ کسی نے انگڑیاں ملیاں

کسو مہتاب نے دیکھا ہے تجھ خورشید تاباں کو!
پھرے ہے ڈھونڈتا ہر شب جہان آباد کی گلیاں

تبسم یوں نمایاں ہے مسی آلودہ دنداں سے
نہ ہوا بر سیہ میں اس طرح بجلی کی اچپلیاں

لب لہجہ ترا سا ہے کہیں خوبانِ عالم میں
غلط ہے یہ زبانوں پر کہ سب مصری کی ہیں ڈلیاں

دوانہ ہو گیا سودا تو آخر ریختہ پڑھ پڑھ
نہ میں کہتا تھا اسے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں!
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے
سو یک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں!

یہ رنجش میں ہم کو ہے بے اختیاری
تجھے تیری کھا کر قسم دیکھتے ہیں

غرض کفر سے کچھ، نہ دیں سے ہے مطلب
تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں

حباب لبِ جو ہیں اے باغباں ہم
چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں

مٹا جائے ہے حرف حرف آنسوؤں سے
جو نامہ اسے کر رقم دیکھتے ہیں

اکڑ سے نہیں کام سنبل کے ہم کو
کسی زلف کا پیچ و خم دیکھتے ہیں

مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سودا
اسے تیرے کوچے میں کم دیکھتے ہیں

دردؔ

فلسفہ، اخلاق اور تصوف میں کامل دستگاہ
رکھتے تھے اسی باعث کلام میں یہی رنگ جھلکتا
ہے۔ دہلی میں پیدا ہونے والے اس شاعر کی قابلیت
کا ثبوت زبان کی سادگی ہے لیکن مضامین اور انداز
بیان کی سادگی کے ساتھ لطافت کلام لاجواب ہے
۲۹ برس کی عمر تھی جب اپنے والد کی جگہ سجادہ
نشینی اختیار کی اور دنیا کو ترک کر دیا تصوف
کے فلسفے کی کئی تصنیفات ہیں۔ شاگردوں میں قائم
چاندپوری سب سے زیادہ مشہور ہوئے۔ ؎

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

خواجہ میر درد

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لیے آئے تھے، ہم کیا کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے اِدھر، اودھر چلے

دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو اب، ہم تو اپنے گھر چلے

آہ! بس جی مت جلا، تب جانیئے
جب کوئی افسوں ترا اُس پر چلے

ایک میں دل ریش ہوں ویسا ہی دوست
زخم کتنوں کے سُنا ہے بھر چلے

ڈھونڈتے ہیں آپ سے اُس کو پرے
شیخ صاحب چھوڑ گھر، باہر چلے

ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے
وہ ہی آڑے آ گیا، جیدھر چلے

جوں شرر اے ہستیِ بے بود یاں
بارے، ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے، کیدھر چلے

خواجہ میر درد

○

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً، لیکن
میں جو پہنچا تو کہا خیر! یہ مذکور نہ تھا

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

محتسب! آج تو مے خانے میں تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی جو شیشے کی طرح چور نہ تھا

درد کے ملنے سے اے یار! برا کیوں مانا
اس کو کچھ اور، سوا دید کے، منظور نہ تھا

○

آرام سے کبھو بھی نہ یک بار سو گئے
ایسے ہمارے طالع بیدار سو گئے

خواب عدم سے چونکے تھے ہم تیرے واسطے
آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے

اٹھتی نہیں ہے خانۂ زنجیر سے صدا
دیکھو تو کیا سبھی یہ گرفتار سو گئے

وہ مر چکے جو رونق بزم جہان تھے
اب اٹھئے دردؔ یاں سے کہ سب یار سو گئے

قائم

بہت خوب اہل جہاں دیکھے، اور جہاں دیکھا
پر آشنا کوئی دیکھا نہ مہرباں دیکھا

ہمیشہ منع تو کرتا تھا باغ سے ہم کو
سو حال اب گل و گلشن کا باغباں دیکھا

نہ جانے کون سی ساعت چمن سے بچھڑے تھے
کہ آنکھ بھر کے نہ پھر سوئے گلستاں دیکھا

طلب کمال کی کوئی نہ کیجیو زنہار
کہ میں یہ کر کے فضولی بہت زیاں دیکھا

برنگ غنچہ بہار اس چمن کی سنتے تھے
پہ جوں ہی آنکھ کھلی موسم خزاں دیکھا

نہ کہتے تھے تجھے قائم کہ دل کسی کو نہ دے
مزا کچھ اس کا بھلا، تو نے اے میاں دیکھا

تاباںؔ

میر عبدالحئی تاباںؔ کے مفصل حالات کی دستیابی ناممکنات میں سے ہے لیکن تذکروں سے پتہ چلتا ہے رنگا رنگ شخصیت کے حامل تھے۔ دہلی کے بیشتر معاصر کمال کو بہت عزیز تھے۔ کہتے ہیں کہ بے اعتدالیوں، خصوصاً کثرتِ شراب نوشی کے نتیجے میں جوانی ہی میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ میر تقی میرؔ نے نکات الشعراء میں ان کے تذکرے میں اظہار افسوس کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ مرنے سے کچھ عرصہ پہلے اس قدر شراب نوشی کرنے لگے تھے کہ لوگوں سے ملنا جلنا تک ترک ہو چکا تھا۔ ؎

تمنا تری ٹھوکروں کی ہے لیکن
رکھوں پاؤں پر سر یہ جرأت کہاں ہے

تاباں

عشق کیا شے ہے کسی کامل سے پوچھا چاہیے
کس طرح جاتا ہے دل، بے دل سے پوچھا چاہیے

کیا تڑپنے میں مزا ہے قتل ہو پیارے کے ہاتھ
اس کی لذت کو کسی بسمل سے پوچھا چاہیے

جس نے اس کا زخم کھایا ہو اسے معلوم ہو
تیغِ ابرو کی صفت گھائل سے پوچھا چاہیے

یار سے ملنے کی کوئی طرح آتی ہی نہیں
طرح ملنے کی کسی واصل سے پوچھا چاہیے

آہ و نالہ کی حقیقت پوچھتا ہوں ہجر میں
کیا گزرتی ہوگی تاباں، دل سے پوچھا چاہیے

○

جوں برگِ گل سے باغ میں شبنم ڈھلک پڑے
کیا ہو کہ برگِ ناک سے یوں مئے ٹپک پڑے

محفل کے بیچ سُن کے مرے سوزِ دل کا حال
بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک پڑے

○

کہتے ہیں اثر ہوگا رونے میں، یہ ہیں باتیں
اک دن بھی نہ یار آیا، روتے ہی کٹیں راتیں

سودا میں گزرتی ہے کیا خوب طرح تاباں
دو چار گھڑی رونا، دو چار گھڑی باتیں

اگر زندہ رہتے تو صفِ اساتذہ میں شمار ہوتے۔ عین شباب کے زمانہ میں یعنی لگ بھگ ۱۷۵۴ء میں انعام اللہ خان یقین کا قتل گویا اردو شاعری کی عین جوانی میں موت کے مترادف ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاں کے عزیز شاگرد تھے۔ اپنے زمانے کے عام رنگ سے علیحدہ یقین کے کلام میں ایک انوکھی شوخی اور نرالا بانکپن پایا جاتا ہے۔

مجھے زنجیر کر رکھا ہے ان شہری غزالوں نے
نہیں معلوم میرے بعد ویرانے پہ کیا گزری

یقین

ہمیں یہ سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا
ہمیں ظلِ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

مجھے زنجیر کرنا کیا مناسب تھا بہاراں میں
کہ گل ہاتھوں میں اور پاؤں میں میرے خار بہتر تھا

ہموں نے ہجر سے کچھ وصل میں ڈر کے بہت دیکھے
ہمارے حق میں اس راحت سے وہ آزار بہتر تھا

مرا دل مر گیا جس دن سے نظارے سے باز آیا
یقیں پرہیز اگر کرنا، تو وہ بیمار بہتر تھا

○

نہیں معلوم اب کے سال مے خانے پہ کیا گزری
ہمارے توبہ کر لینے سے پیمانے پہ کیا گزری

برہمن سر کو اپنے پیٹتا تھا دیر کے آگے
خدا جانے تری صورت سے بت خانے پہ کیا گزری

مجھے زنجیر کر رکھا ہے ان شہری غزالوں نے
نہیں معلوم میرے بعد ویرانے پہ کیا گزری

یقیں کب یار میرا سوزِ دل کی داد کو پہنچے!
کہاں ہے شمع کو پروا، کہ پروانے پہ کیا گزری

○

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے
نرا برا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے

اس اشک و آہ سے سودا بگڑ نہ جائے
یہ دل کچھ آب رسیدہ ہے کچھ جلا بھی ہے

یہ آرزو ہے کہ اس بے وفا سے یہ پوچھ
کہ میرے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزا بھی ہے

یہ کون ڈھب ہے سجن خاک میں ملانے
کسو کا دل کبھو پاؤں تلے ملا بھی ہے

یقیں کا شور جنوں سن کے یار نے پوچھ
کوئی قبیلۂ مجنوں میں کیا رہا بھی ہے

حسن

دلی کی تباہی کے بعد دربار اودھ میں پہنچنے والے
میر حسن کے والد میر ضاحک بھی اچھے شاعر تھے
دلی میں پیدا ہوئے۔ فیض آباد پھر لکھنؤ میں رہے
ان کی مثنوی "سحر البیان" اسم بامسمی ہے۔ اس
میں واقعات اور جذبات کی جو تصویر ہے وہ کسی
اور مثنوی میں ہے ہی نہیں۔ اردو زبان پر اس خاندان
کے بڑے احسانات ہیں ان کے پوتے میر انیس
نے اپنے مرثیوں کے ذریعہ اردو شاعری کو جو بلندی
اور مقام دیا وہ محتاج بیان نہیں۔ میر حسن کی
غزلیں بھی استادانہ رنگ کی حامل ہیں۔ ؎

طوفان ہے زلفوں پہ، بہتان ہے کاکُل پہ
ہے رشتۂ الفت ہی یہ دام مرے دل کا

مجھ کو عاشق کہہ کے اُس کے روبرو مت کیجیو
دوستاں! اگر دوست ہو تو یہ کبھو مت کیجیو

جس ادا کا کشتہ ہوں میں وہ رہے میرے ہی ساتھ
اس ادا کو مبتذل اے خوب رو مت کیجیو

وقتِ رخصت دل نے اتنا ہی کہا رو کر کہ بس
اب پھر آنے کی مرے تو آرزو مت کیجیو

میں تو یونہی تم سے دیوانہ سا بکتا ہوں کہیں
اس کے آگے دوستاں! یہ گفتگو مت کیجیو

کل کے جھگڑے میں خطا ہے کس کی یارو حق بطرف
واجبی جو ہو سو کہیو، میری رُو مت کیجیو

واں حسن ہرگز نہیں ہے ڈھیل پھر جانے میں کچھ
آشنائی پر بھروسہ اُس کی تو مت کیجیو

میر حسن

○

عشق کا راز گر نہ کھل جاتا
اس قدر تو نہ ہم سے شرماتا

آ کے تب بیٹھتا ہے وہ ہم پاس
آپ میں جب ہمیں نہیں پاتا

زندگی نے وفا نہ کی، ورنہ
میں تماشا وفا کا دکھلاتا

مر گئے ہم تو کہتے کہتے حال
کچھ تو تو بھی زباں سے فرماتا

سب یہ باتیں ہیں چاہ کی ورنہ
اس قدر تو نہ ہم پہ جھنجھلاتا

میں نہ سنتا کسی کی بات حسنؔ
دل جو باتیں نہ مجھ کو سنواتا

○

جاتا تھا اس کے کھوج میں، میں بے خبر چلا
بارے اسی نے ٹوک کے پوچھا، کدھر چلا

جس اشتیاق سے کہ میں آتا ہوں تیرے پاس
کیا ہو، جو آوے تو بھی یوں ہی بے خبر چلا

غیروں میں اس نے منہ تو چھپایا تھا مجھ کو دیکھ
پر میں بھی اس کی چھیڑ سے منہ ڈھانپ کر چلا

کس میں رکھوں گا اب مئے حسرت کو میں بھلا
شیشہ تو دل کا خونِ جگر ہی سے بھر چلا

لکھنے کی یاں نہ تاب، نہ پڑھنے کا واں دماغ
کہہ دیں گے کچھ زبانی، اگر نامہ بر چلا

میر حسن

○

غم خانۂ دل عیش کا گھر ہووے گا یارب!
آباد کبھی یہ بھی نگر ہووے گا یارب

جب دیکھوں ہوں اس کو تو یہ آتا ہے مجھے رشک
مَیں کس کا یہ منظورِ نظر ہووے گا یارب

بگڑی تو ہے غیروں سے اور اب ہم سے ولیکن
کیا جانیے! وہ شوخ کدھر ہووے گا یارب

جان و دل و دیں کھوئے اک اس کی نظر پر
ایسا بھی کوئی اور بشر ہووے گا یارب

سنتے ہیں مرے سنگ تلک گھل گئے پانی!
دل میں کبھی اس کے بھی اثر ہووے گا یارب

داغوں کو ترے غم کے جو رکھے ہے تر و تازہ
یہ میرے سوا کس کا جگر ہووے گا یارب

رو رو کے ہی گزرتی ہے شب و روز حسن کو
اور اس سے تو کیا حال بتر ہووے گا یارب

○

دل غم سے ترے لگا گئے ہم!
کس آگ سے گھر جلا گئے ہم!

ماتم کدۂ جہاں میں جوں شمع
رو رو کے جگر بہا گئے ہم

مانندِ حباب اس جہاں میں
کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم

کھویا گیا اس میں گو دل اپنا
پہ یار! تجھے تو پا گئے ہم

تھا ہم میں اور اس میں وہ جو پردہ
سو اس کو حسن اٹھا گئے ہم

سراج

اورنگ آباد کے اردو شعراء میں اپنی قدرے منفرد شاعری کی بدولت سید سراج الدین سراجؔ نے ولیؔ کے بعد سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ دیوانِ فارسی اور مجموعۂ غزلیات اردو کے علاوہ ایک مثنوی بوستانِ خیال مشہور ہے۔ ؎

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

سراج اورنگ آبادی

خبرِ تحیّرِ عشق سُن نہ جنوں رہا نہ پری رہی !
نہ تو تُو رہا نہ تو مَیں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بے خودی نے عطا کیا، مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سے بیاں کروں
کہ شرابِ حسرت و آرزو خُمِ دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وہ دھری رہی

ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سے یہاں ہوا
کہ نہ آئینے میں جِلا رہی، نہ پری میں جلوہ گری رہی !

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کو
نہ خطر رہا، نہ حذر رہا جو رہی سو بے خبری رہی !

تیسرا باب

مصحفی ۱۷۴۹ - ۱۸۲۴

جرأت ۱۷۴۵ - ۱۸۳۰

انشا ۱۷۵۳ - ۱۸۱۷

نظیر ۱۷۳۵ - ۱۸۳۰

شیخ غلام ہمدانی مصحفی نہایت پرگو شاعر تھے
اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بھرتی کے اشعار
کی بہتات ہے۔ تاہم ان کی منتخب غزلیں صفِ
اول کے اساتذہ کے کلام سے ٹکر لیتی ہیں اور
ان کی استادی مسلم الثبوت ہے۔ امروہہ کے
رہنے والے تھے۔ لڑکے ہی تھے جب دلی آ گئے
اور وہاں سے کچھ عرصہ بعد دوسرے شعراء کے ساتھ
لکھنؤ منتقل ہونے والوں میں یہ بھی شامل تھے
اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ایک
"تذکرۂ شعرائے اردو" مرتب کیا تھا جس میں تین
سو سے زیادہ شاعروں کا حال ہے ان کے بہت
سارے شاگردوں میں آتش۔ خلیق۔ ضمیر۔ اسیر۔
شہیدی۔ ہوس اور غافل کو شہرت ملی۔

؎

درد و غم کو بھی ہے نصیبہ شرط
یہ بھی، قسمت سوا نہیں ملتا

مصحفی

○

دیکھ اُس کو اک آہ ہم نے کر لی
حسرت سے نگاہ ہم نے کر لی

کیا جانے کوئی کہ گھر میں بیٹھے
اُس شوخ سے راہ ہم نے کر لی

جب اُس نے چلائی تیغ ہم پر
ہاتھوں کی پناہ ہم نے کر لی

نخوت سے جو کوئی پیش آیا
کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی

دی ضبط ہی جب، مصحفیؔ، جان
شرم اس کی گواہ ہم نے کر لی

○

اور سب تم سے ورے بیٹھے رہے
ایک ہم ہیں کہ پرے بیٹھے ہیں

چھٹ چکا جب سے گریباں اپنا
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

شیشۂ مے کی طرح اے ساقی
چھیڑ مت ہم کو بھرے بیٹھے ہیں

مصحفیؔ یار کے گھر کے آگے
ہم سے کتنے نگھرے بیٹھے ہیں

مصحفی

○

زلف سرکی تو ہوا جلوہ نمایوں عارض
جس طرح ابر کے ٹکڑے سے قمر نکلے ہے

چاک پیراہنِ ساقی پہ پڑھوں کیوں نہ درود
اس کے سینے سے تو اک لطفِ سحر نکلے ہے

کوچۂ عشق میں جاتے ہیں چلے ہم کو
نہیں معلوم کہ یہ کوچہ کدھر نکلے ہے

کون سے گل کا تو عاشق ہے بتا اے بلبل
تیرے نالے سے جو اک بوئے اثر نکلے ہے

جام بھر بھر کے پیالے تو مجھے دے ساقی
اک پیالے سے کوئی دل کا کدر نکلے ہے

ابرِ تر نے تو کیا کوہ و بیاباں سیراب
کام کچھ تم سے بھی اے دیدۂ تر نکلے ہے

سوزشِ سینہ کی تاثیر نہ پوچھ اے ہمدم
سنگِ تربت سے مری اب بھی شرر نکلے ہے

○

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

جو سیر کرنی ہے کر لے کہ جب خزاں آئی
نہ گل رہے گا چمن میں نہ خار ٹھہرے گا

خدنگ خوردہ دل آگے سے اس کے جاتا ہے
خبر نہیں کہ کہاں یہ شکار ٹھہرے گا

مصحفی

○

سرِ شام اس نے منہ سے جو رخِ نقاب اٹھا
نہ غروب ہونے پایا وہیں آفتاب الٹا

میں حسابِ بوسہ جی میں کہیں اپنے کر رہا تھا
وہ لگا مجھی سے کرنے طلب اور حساب الٹا

مہِ چار دہ کا عالم میں دکھاؤں گا فلک کو
اگر اس نے پردہ منہ سے شبِ ماہتاب الٹا

جو خفا ہوا میں تجھ سے کبھی بات پر شبِ وصل
سحر اٹھ کے میرے آگے وہی اس نے خواب الٹا

بہ سوالِ بوسہ اس نے مجھے جھڑکے دی جو گالی
میں ادب کے مارے اس کو نہ دیا جواب الٹا

یہ عجیب رسم دیکھی کہ بروزِ عیدِ قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے حساب الٹا

نہیں جائے شکوہ اس میں ہمیں مصحفی ہمیشہ!
یہ زمانے کا رہا ہے یونہی انقلاب الٹا

○

آج کچھ سینے میں دل ہے خود بخود بے تاب سا
کر رہا ہے بے قراری پارۂ سیماب سا

جوں گلِ تر کیا ہی اس سے جھلکے ہے اس کا بدن
وہ جو پیراہن گلے میں اس کے ہے اک آب سا

میں ہوں اور خلوت ہے اور پیشِ نظر معشوق ہے
سچ ہے تو بیداری میں کچھ دیکھتا ہوں خواب سا

کل شبِ تاریک میں جونہی ہوا وہ بے نقاب
جلوہ گر روئے زمیں پر ہو گیا مہتاب سا

کیا کہوں تن کی لطافت جامۂ شبنم سے ہائے
نکلا ہی پڑتا ہے وہ گورا بدن مہتاب سا

مصحفی کیوں لختِ دل رونے کا کھاتا ہے قسم
ہے نمایاں کچھ تو آنکھوں میں تری خوناب سا

جرأت

دہلی میں وجود میں آئے تھے۔ شیخ قلندر بخش جرأت بچپن ہی میں فیض آباد چلے گئے۔ وہاں سے لکھنؤ۔ دربار اودھ کے زیر سایہ زندگی بسر کی۔ اپنے عاشقانہ کلام اور کلام میں چٹخارے کے باعث اپنے استاد جعفر علی حسرت سے زیادہ شہرت پائی۔ ویسے کلام میں سنجیدگی بھی کہیں کہیں ملتی ہے جو شاید میر، سودا، میر درد اور مصحفی جیسے شعرا کے کلام کے باعث فروغ نہ پا سکی۔ ایک مکمل قلمی دیوان برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ ان کی جو غزلیں مشہور ہوئیں وہ شوخ عاشقانہ رنگ میں ہیں لیکن ان کے سنجیدہ کلام میں بھی بڑی جان تھی۔ ؎

موت ہی اب تو زیست ہے کہ بہت
درد دل کا علاج کر دیکھا

جرأت

لگ جا گلے سے، تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

فرصت جو پا کے کہیے کبھو دردِ دل سو ہائے
وہ بدگماں ہے ہے کہ ہم کو یقیں نہیں

آتش سی پھنک رہی ہے مرے تن بدن میں آہ!
جب سے کہ روبرو وہ رخِ آتشیں نہیں

اُس بن جہان کچھ نظر آتا ہے اور ہی!
گویا وہ آسماں نہیں، وہ زمیں نہیں

کیا جانے کیا وہ اس میں ہے، لوٹے ہو جس پہ دل
یوں اور کیا جہان میں کوئی حسیں نہیں!

سُنتا ہے کون کس سے کہوں دردِ بیکسی
ہمدم نہیں ہے کوئی مرا ہم نشیں نہیں

حیرت ہے مجھکو کیونکہ وہ جرأت ہے چین سے
جس بن قرار جی کو ہمارے کہیں نہیں

جرأت

ہمیں دیکھے سے وہ جیتا تھا اور ہم اس پہ مرتے تھے
یہی راتیں تھیں اور باتیں تھیں وہ دن کیا گزرتے تھے

وہ سوزِ دل سے بھر لاتا تھا اشکِ سرخ آنکھوں میں
اگر ہم جی کی بے چینی سے آہِ سرد بھرتے تھے

بیاں ہم وصل میں کرتے جو دردِ ہجر سے مرنا!
تو وہ کہتا خدا شاہد ہے اس کا ہم بھی مرتے تھے

کسی دھڑکے سے رو دیتے تھے جو باہم وصل کی شب کو
وہ ہم کو منع کرتا تھا ہم اس کو منع کرتے تھے

ملی رہتی تھیں نظریں غلبۂ الفت سے آپس میں
نہ خوف اوس کو کسی کا تھا نہ ہم لوگوں سے ڈرتے تھے

سو اب صد حیف اوس خورشید رو کے ہجر میں جرأت
یہیں راتیں ہیں اور باتیں ہیں وہ دن کیا گزرتے تھے

سنا ہے وہ خفا ناکردہ ہے بیمار کیا کیجے
عیادت کو بھی جانا ہے ہمیں دشوار کیا کیجے

خیال اس کی جو بے خوابی کا گزرے ہے تو ہم شب بھر
لگا کے چھت سے آنکھیں رہتے ہیں بیدار کیا کیجے

کسی کو بھیج بھی سکتے نہیں احوال پرسی کو
مگر یہ چپکے چپکے کہتے ہیں ہر بار کیا کیجے

کفِ افسوس ملتے ہیں کہ جرأت ہم نہیں اس جا
نہیں تلوے تو سہلاتے گھڑی دو چار کیا کیجے

غزل نمبر

○

خیالِ وصل میں اُس سے عجب باتیں بناتا ہوں — مگر بیٹھا ہے وہ گویا اور اُس کو میں مناتا ہوں

گلی میں اُس کی جب جاتا ہوں، میں تب اُن اک چرچا — کچھ ایسا ہی سُن آتا ہوں کہ بس اُن سے سُن آتا ہوں

گلے لگتا نہیں گر عیدِ قرباں کو بھی تو میرے — تو لے خنجر ہی کو اپنے گلے سے میں لگاتا ہوں

تماشا ہے کہ ہے مدہوش وہ تو نشۂ مے سے — پھر اس محفل سے میں اوٹھتے ہوئے کیوں لڑکھڑاتا ہوں

کہے ہے کس کے رنجیدہ ہوئے ایسے یہ بنتے سے — ذرا سمجھو تو صاحب میں تو آپ ہی کا کہاتا ہوں

کہے گر کوئی وہ ناگن نہیں پر دل کو ڈستی ہے — تو اُس کی زلف کی میں یہ پہیلی بوجھ جاتا ہوں

کہوں کیا دردِ ہجراں سے مری کیا شکل ہے جرأت — کسی صورت نہیں آرام، کیا ایذا اُٹھاتا ہوں!

کبھی جو یاد آتا ہے وہ ہنسنا بولنا اُس کا — تو پھر رو رو کے دریا اپنی آنکھوں سے بہاتا ہوں

کبھی اُس کا جو بلوانا وہ مجھ کو یاد آتا ہے — تو بیٹھے بیٹھے کیا جانوں کہ کیدھر کو میں جاتا ہوں

کبھی گھبرا کے سر اپنا پٹکتا ہوں میں بالیں سے — کبھی بستر پہ بے تابی کے مارے تلملاتا ہوں!

کبھی آواز اُس کی سی جو آجاتی ہے کانوں میں — تو دل پر ہاتھ رکھ کر دھیان اودھر کا لگاتا ہوں

پھر اُس میں گر تسلی کو کوئی پاس آن بیٹھے ہے — تو مطلع پڑھ کے یہ روتا ہوں اور اُس کو رُلاتا ہوں

تو اُس شعلہ رُو کے ہجر میں کیا خاک پاتا ہوں!
نظر آتی ہے اک آتش جدھر کو آنکھ اُٹھاتا ہوں

انشاء

سید انشاء اللہ خاں انشاء کا ایک نمایاں کارنامہ "دریائے لطافت" ہے جو قواعد اردو، محاورات اور بول چال پر اردو زبان کی پہلی محققانہ تصنیف ہے۔ نثر میں رانی کیتکی کی کہانی لکھی جسے ہندی تصنیف ہی کہیں گے کیونکہ اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ سرے سے استعمال ہی نہیں کئے گئے۔ انشاء اور رنگین نے مل کر ریختی ایجاد کی جس میں عورتوں کی بول چال میں اشعار لکھے ہیں مگر فن کے اعتبار سے یہ بہت پست ہے۔ تاہم مستورات کے مخصوص محاورات کا خزانہ اسے خصوصی درجہ دیتا ہے۔ مرشد آباد میں پیدا ہوئے لیکن بچپن میں ہی دلی آ گئے۔ ان کی ہمہ گیر ذہانت کچھ کچھ امیر خسرو کی یاد دلاتی ہے۔ مگر تلوّن مزاجی نے کسی فن میں کمال تک پہنچنے نہ دیا۔ ویسے قدرتِ کلام ضرب المثل ہے۔ ایک دیوان بے نقط لکھ ڈالا۔ سیکڑوں پہیلیاں، چیستاں، شعبدے نظم کر ڈالے۔

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

انشاء اللہ خاں انشا

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی مے خوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل، آہ ننگ و نام کیا شے ہے
یہاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم اک بار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بے کار بیٹھے ہیں

نئی یہ وضع شرمانے کی سیکھی آج ہے تم نے
ہمارے پاس صاحب ورنہ یوں سو بار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

انشاؔ

اے عشق! مجھے شاہدِ اصلی کو دکھا لا!
تم! خُذ بیدی وفقک اللہ تعالیٰ

ہے تجھ کو جنوں کی قسم اے جذبِ محبت
اس نورِ تجلّی کی جھلک مجھ کو دکھا لا

سوجھے ہے مجھے عالمِ اطلاق کی منزل
الفت نے جو تقلید کے جھگڑے سے نکالا

ہر چند کہ عاصی ہوں پہ اُمّت میں ہوں اس کی
جس کا ہے قدم عرشِ معلّیٰ سے بھی بالا!

مولائے جہاں، رہبرِ عشاق: محمدؐ
صد عقدۂ مشکل کا مرے کھولنے والا

جوں صبا اُڑ جائیں اور تیری بہاریں لوٹ جائیں
تجھکو جو گھوریں الٰہی! ان کے دیدے پھوٹ جائیں

ان سے کیا کوئی برآوے، جو ذرا سی بات پر!
آگ ہی ہو کر اٹھیں اور اپنے ماتھے کوٹ جائیں

"در بلا بودن بہ از بیم بلا" مشہور ہے
کاش! جو ہونی ہو، جلدی ہو، بلا سے چھوٹ جائیں

بزمِ خوباں میں نہ انشا ایک سے آنکھیں لڑا
خاطریں نازک بہت ان کی ہیں، شاید ٹوٹ جائیں

انشاء

○

ضعف آتا ہے، دل کو تھام تو لو
بولیو مت، مگر سلام تو لو!

کون کہتا ہے بولو، مت بولو
ہاتھ سے میرے ایک جام تو لو

انھیں باتوں پہ لوٹتا ہوں میں
گالی پھر دے کے میرا نام تو لو

یک نگہ پر بکے ہے انشاؔ آج
مفت میں مول اک غلام تو لو

○

چھیڑنے کا تو مزہ تب ہے کہو اور سنو
بات میں تم تو خفا ہو گئے، لو اور سنو

تم کہو گے جسے کچھ کیوں نہ کہے گا تم کو
چھوڑ دیوے گا بھلا دیکھیو تو لو اور سنو

یہی انصاف ہے، کچھ سوچو تو دل میں اپنے
تم تو سو کہہ لو، مری اک نہ سنو اور سنو

آفریں تم پہ، یہی چاہیے شاباش تمھیں
دیکھ رونا مجھے یوں ہنسنے لگو اور سنو

بات میری نہیں سنتے، جو اکیلے مل گئے
ایسے ہی ڈھب سے سناؤں کہ سنو اور سنو

نظیر

لڑکوں کو پڑھانے کا پیشہ اختیار کیا اور قلندروں کے انداز میں قناعت کے ساتھ عمر گزار دینے والے ولی محمد نظیر اکبر آبادی دلی میں پیدا ہوئے لیکن شہرت آگرہ میں پائی جہاں عمر کا زیادہ حصہ انہوں نے گزارا۔ عاشقانہ اشعار شوخی و شرارت سے پُر ہیں۔ غالباً اپنی افتاد طبیعت اور بے پروائی کی وجہ سے ان کے اشعار میں زبان اور محاوروں کی غلطیاں پائی جاتی ہیں اسی لئے پرانے تذکرہ نویسوں نے ان کو وہ جگہ نہ دی جس کے جدید نقطۂ نظر سے یہ مستحق تھے۔ نظیرؔ غزل کے میدان کے مرد نہ تھے لیکن ان کے مسدس اور قطعات نیز مثنویوں میں ان کا جو رنگ ہے۔ وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوا۔ ؎

تفاوت کچھ نہیں گلچیں میں اور بیدردِ خوباں میں
جو اس کے ہاتھ گل ٹوٹے، تو ان کے ہاتھ دل ٹوٹے

نظیر اکبر آبادی

نہ سرخی غنچۂ گل میں ترے دہن کی سی
نہ یاسمن میں صفائی ترے بدن کی سی

نہیں ہوا میں یہ بُو نافۂ ختن کی سی
لپٹ ہے یہ تو کسی زلفِ پُر شکن کی سی

گلوں کے رنگ کو کیا دیکھتے ہو اے خوباں
یہ رنگتیں ہیں تمہارے ہی پیرہن کی سی

یہ برق ابر میں دیکھے سے یاد آتی ہے
جھلک کسی کے دوپٹے میں نورتن کی سی

تو اپنے تن کو نہ دے نسترن سے اب تشبیہ
بھلا تو دیکھ یہ نرمی ہے تیرے تن کی سی

ہزار تن کے چلیں بانکے خوبرو، لیکن
کسی میں آن نہیں تیرے بانکپن کی سی

کہاں تو اور کہاں اُس پری کا وصل نظیر
میاں تو چھوڑ یہ باتیں دوانے پن کی سی

تیرے بھی منہ کی روشنی، رات گئی تھی مہ سے مل
تاب سے تاب، مہ سے رخ، نور سے نور، ظل سے ظل

یوسفِ مصر سے مگر ملتے ہیں سب ترے نشاں
زلف سے زلف، لب سے لب، چشم سے چشم، تل سے تل

جتنے ہیں کشتگانِ عشق، اُن کے ازل سے ہیں ملے
اشک سے اشک، نم سے نم، خون سے خون، گل سے گل

جب سے موا ہے کوہکن، کرتے ہیں اُس کا غم سدا
کوہ سے کوہ، جو سے جو، سنگ سے سنگ، سل سے سل

یار ملا جب اے نظیر میرے گلے تو مل گئے
جسم سے جسم، جاں سے جاں، روح سے روح، دل سے دل

فن اور شخصیت

نظیر اکبرآبادی

نظر پڑا اک بت پری وش، نرالی سج دھج نئی ادا کا
جو عمر دیکھو، تو دس برس کی پہ قہر و آفت غضب خدا کا

جو شکل دیکھو تو بھولی بھالی جو باتیں سنئے تو میٹھی میٹھی
پہ دل وہ پتھر کہ سر اڑا دے جو نام لیجے کبھی وفا کا

جو گھر سے نکلے تو یہ قیامت کہ چلتے چلتے قدم قدم پہ
کسی کو ٹھوکر، کسی کو جھڑکی، کسی کو گالی، نپٹ لڑاکا

یہ راہ چلتے میں چلبلاہٹ کہ دل کہیں ہے، نظر کہیں ہے
کہاں کا اونچا کہاں کا نیچا خیال کس کو، قدم کی جا کا

لڑاوے آنکھیں وہ بے حجابی کہ پھر پلک سے پلک نہ مارے
نظر جو نیچی کرے، تو گویا کھلا سراپا چمن حیا کا

یہ چنچلاہٹ، یہ چلبلاہٹ، خبر نہ سر کی، نہ تن کی سدھ بدھ
جو چیرا بکھرا، بلا سے بکھرا، نہ بند باندھا کبھو قبا کا

گلے لپٹنے میں یہ شتابی کہ مثل بجلی کے اضطرابی!
کہیں جو چمکا، چمک کر، کہیں جو لپکا، تو پھر چھپا کا

نہ وہ سنبھالا کسی کے سنبھلے، نہ وہ منایا منے کسی کے
جو قتل عاشق پہ آ کے مچلے، تو غیر کا پھر نہ آشنا کا

نظیر ہٹ جا، پرے سرک جا، بدل لے صورت، چھپا لے منہ کو
جو دیکھ لیوے گا وہ ستمگر، تو یار ہوگا ابھی حبرا کا

○

کلال گردوں اگر جہاں میں، جو خاک میری کو جام کرتا
تو میں صنم کے لبوں سے مل کر عجب یہ عیشِ مدام کرتا

جو پاتا لذت بہ سانِ مستانِ مئے محبت تری زاہد
تو صومعے سے نکل کے اپنے وہ میکدے میں قیام کرتا

وہ بزم اپنی تھی مے کشی کی، وہ سیر ہو جاتے مست بیخود
جو شیخ جی وہاں سے بچ کے آتے تو میں بھی جھک کے سلام کرتا

جو زلفیں مکھڑے پہ کھول دیتا صنم ہمارا، تو پھر یہ گردوں
نہ دن دکھاتا، نہ شب بتاتا، نہ صبح لاتا، نہ شام کرتا

نظیر آخر کو ہار کر میں گلی میں اس کی گیا تھا بکنے
تماشا ہوتا جو مجھ کو لے کر وہ شوخ اپنا غلام کرتا

○

دور سے آئے تھے ساقی، سن کے میخانے کو ہم!
بس ترستے ہی چلے افسوس! پیمانے کو ہم

مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں
دل میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانے کو ہم

ہم کو پھنسنا تھا قفس میں، کیا گلہ صیاد کا
بس ترستے ہی رہے ہیں آب اور دانے کو ہم

طاقِ ابرو میں صنم کے، کیا خدائی رہ گئی؟
اب تو پوجیں گے اسی کافر کے بتخانے کو ہم

باغ میں لگتا نہیں، صحرا سے گھبراتا ہے دل!
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

کیا ہوئی تقصیر ہم سے، تو بتا دے اے نظیر
تاکہ شادی مرگ سمجھیں، ایسے مر جانے کو ہم!

چوتھا باب

ناسخ ۱۸۳۸-۱۷۷۲

آتش ۱۸۴۷-۱۷۶۷

ناسخ

شیخ امام بخش ناسخ، لاہور کے رہنے والے بتائے جاتے ہیں۔ ابتدائے عمر میں لکھنؤ چلے آئے تھے اور کہتے ہیں کہ تعلیم علمائے فرنگی محل سے حاصل کی تھی۔ اردو شاعری کو فن کی حیثیت سے ترقی دی۔ زبان کی صحت اور اسے بامحاورہ بنانے میں بھی بڑا کام کیا۔ جذباتیت پر خیال کی نزاکت کو شاعری میں ترجیح دی۔ شیخ ناسخ طرزِ لکھنؤ کے موجد ہیں۔ کلام قواعدِ زبان کے لحاظ سے بے عیب ہے۔ دہلی کے شعراء غالب، مومن اور ذوق، طرزِ کلام میں اختلاف کے باوجود ان کی استادی کو تسلیم کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ ابتدا میں انھوں نے ان کا تتبع کرنے کی کوشش کی۔ غالب کے ابتدائی کلام کے پیشِ نظر یہ روایت خارج از امکان نہیں۔

ہو گیا زرد، پڑی جس پہ حسینوں کی نظر
یہ عجب گل ہیں کہ تاثیرِ خزاں رکھتے ہیں

ناسخ

○

مجھکو اب ساقیٔ گلفام سے کچھ کام نہیں
مے سے کچھ کام نہیں، جام سے کچھ کام نہیں

دل کو خوش آئی ہیں صحرا کے ببولیں پرُخار
اب کسی سروِ گل اندام سے کچھ کام نہیں

اپنے آرام سے ہوں دشت جنوں میں تنہا
کسی محبوبِ دل آرام سے کچھ کام نہیں

خانہ برباد ہوں صحرا میں، بگولوں کی طرح
سقف و دیوار و در و بام سے کچھ کام نہیں

طائرِ روحِ رمیدہ کی طرح چھوٹا ہوں
اب تو صیّاد ترے دام سے کچھ کام نہیں

اتنی مدّت سے ہوں غربت میں وطن بھول گیا
مجھکو اب نامہ و پیغام سے کچھ کام نہیں

○

جنوں، پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

اگرچہ آئی ہے برسات، پھول پھولے ہیں
ہوئی شگفتہ طبیعت نہ ہم ملولوں کی

○

اس ابر میں یار سے جدا ہوں
بجلی کی طرح تڑپ رہا ہوں

امیدِ وصال اب کہاں ہے
اُس گل سے، برنگِ بو جدا ہوں

آئینہ دل میں ہے ترا عکس
دن رات میں تجھکو دیکھتا ہوں

ہے مہر و وفا سراسر اُس میں
ناسخ کیوں کر اُسے نہ چاہوں!

○

تو مجھ سے ہو ہم کنار قاصد
کروں میں تجھ کو پیار قاصد

بر آئی ترے قدم کی دولت
امیدِ امیدوار قاصد

آنکھوں سے نکالوں، پاؤں پھیلا
گر کوئی چبھا ہو خار قاصد

گر جان بھی دوں تجھے تو کم ہے
ہوں سخت میں شرمسار قاصد

ناسخ یہی تجھ سے پوچھتا ہے
کیسا ہے مزاجِ یار قاصد

○

ساتھ اپنے جو مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر مجھ کو دلِ زار نے سونے نہ دیا

خواب ہی میں نظر آتا وہ شبِ ہجر کہیں
سو مجھے حسرتِ دیدار نے سونے نہ دیا

خفتگی بخت کی کیا کہیئے کہ جز خوابِ عدم
عمر بھر دیدۂ بیدار نے سونے نہ دیا

یہی صیاد گلا کرتا ہے میرا، ہر صبح
نالۂ مرغِ گرفتار نے سونے نہ دیا

سمجھے تھے بعد فنا پائیں گے راحت ناسخ
حشر تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

غزل نمبر

ص در شخصیت

تصحیح

روز ہے گرمیٔ بازار ترے کوچے میں
جمع ہیں تیرے خریدار ترے کوچے میں

دیکھ کر تجھ کو، قدم اٹھ نہیں سکتا اپنا
بن گئے صورتِ دیوار ترے کوچے میں

دیر ویراں ہے ترے عہد میں، کعبہ ہے خراب
جمع ہیں کافر دیں دار ترے کوچے میں!

روز ہی عشق نے یہ تفرقہ پردازی کی
ہم ہیں زنداں میں، دلِ زار ترے کوچے میں

آرزو ہے جو مروں میں، تو یہاں مدفن ہو
ہے جگہ تھوڑی سی درکار ترے کوچے میں!

حالِ دل کہنے کا ناسخ جو نہیں پاتا بار!
پھینک جاتا ہے وہ اشعار ترے کوچے میں

سب ہمارے لئے زنجیر لئے پھرتے ہیں
ہم سرِ زلفِ گرہ گیر لئے پھرتے ہیں!

کون تھا صید وفادار کہ اب تک صیّاد
بال و پر اس کے ترے تیر لئے پھرتے ہیں

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

جو ہے مرتا ہے بھلا کس کو عداوت ہوگی
آپ کیوں ہاتھ میں شمشیر لئے پھرتے ہیں!

خواجہ حیدر علی آتش نہ صرف مزاج کے اعتبار سے سپاہیانہ اور فقیرانہ طبیعت کے مالک تھے بلکہ ان کی شاعری میں بھی وہی رنگ ہے۔ ان کے والد لکھنؤ آگئے تھے مگر اصلی وطن دہلی ہی تھا۔ جاہ و اقتدار عیش و آرام سے کوسوں دور اور تنگدستی کے ہمیشہ قریب رہے۔ کلام میں ناسخ کے مقابل کو صحت اور استادی کم ہے لیکن شوخی، رنگینی اور گرمی بہت ہے۔ ان کے دور میں دونوں اساتذہ اور ان کے شاگردوں میں اکثر سر مشاعرہ ٹھنی رہتی تھی۔ عاشقانہ صوفیانہ اور اخلاقی مضامین کو باندھنے میں برجستگی کو معنی خیز کیا ہے۔ شاعری اور مصوری کی مشابہت بیان کرنے میں انہوں نے ہی پہل کی تھی۔

یہ شاعر ہیں الٰہی، یا مصور پیشہ ہیں کوئی
نئے نقشے، نرالی صورتیں، ایجاد کرتے ہیں

آتش

تار تار پیرہن میں بھر گئی ہے بوئے دوست
مثل تصویر نہالی میں ہوں یا پہلوئے دوست

ہجر کی شب ہو چکی روز قیامت سے دراز
دوش سے نیچے نہیں اترے ابھی گیسوئے دوست

داغ دل پر خیر گزری تو غنیمت جانئے
دشمن جاں ہیں جو آنکھیں دیکھتی ہیں سوئے دوست

فرش گل بستر تھا اپنا، خاک پر سوتے ہیں اب
خشت زیر سر نہیں یا تکیہ تھا زانوئے دوست

یاد کر کے اپنی بربادی کو رو دیتے ہیں ہم
جب اڑاتی ہے ہوائے تند خاک کوئے دوست

اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر نبھے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

اب کے بہار میں جو ہمیں لے چلے جنوں
چن چن کے داغِ لالۂ صحرا اٹھائیے

مفلس ہوں لاکھ، پر یہی دل کو بندھی ہے دھن
یوسف کو قرض لے کے، تقاضا اٹھائیے

سختیِ راہ کھینچئے منزل کے شوق میں
آرام کی تلاش میں ایذا اٹھائیے

قدسی نگاہِ لطف کے امیدوار ہیں
آنکھیں تو سوئے عالمِ بالا اٹھائیے

فصلِ بہار آئی پیو صوفیو شراب
بس ہو چکی نماز مصلّا اٹھائیے

عنابِ لب کا اپنے مزا کچھ نہ پوچھئے
کس درد کی ہیں آپ دوا کچھ نہ پوچھئے

ناز و نیازِ عاشق و معشوق کیا کہوں
عجز و غرورِ شاہ و گدا کچھ نہ پوچھئے

آئینہ لے کے کیجیے اپنا مشاہدہ
ہم سے سلوکِ شرم و حیا کچھ نہ پوچھئے

ناگفتنی ہے عشقِ بتاں کا معاملہ
ہر حال میں ہے شکرِ خدا کچھ نہ پوچھئے

آتش گناہِ عشق کی تعزیر کیا کہوں
مشفق جو کچھ ہے اس سزا کچھ نہ پوچھئے

آتش

یہ آرزو تھی، تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بیتاب گفتگو کرتے

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا!
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ، جو باراں کی آرزو کرتے

اے صنم! جس نے تجھے چاند سی صورت دی ہے
اسی اللہ نے مجھ کو بھی محبت دی ہے

تیغ بے آب ہے نے بازوئے قاتل کمزور
کچھ گراں جانی ہے، کچھ موت نے فرصت دی ہے

کوئی اکسیر غنی دل نہیں رکھتی ایسا!
خاکساری نہیں دی ہے، مجھے دولت دی ہے

فرقتِ یار میں رو رو کے بسر کرتا ہوں
زندگانی مجھے کیا دی ہے، مصیبت دی ہے

یادِ محبوب فراموش نہ ہووے اے دل!
حسنِ نیت نے مجھے عشق سی نعمت دی ہے

گوش پیدا کئے سننے کو ترا ذکرِ جمال
دیکھنے کو ترے آنکھوں میں بصارت دی ہے

لطفِ دل بستگیٔ عاشقِ شیدا کو نہ پوچھ
دو جہاں سے اس اسیری نے فراغت دی ہے

کمرِ یار کے مضمون کو باندھو آتش!
زلفِ خوباں سی مرے تم کو طبیعت دی ہے

پانچواں باب

شاہ نصیر	۱۷۶۵ - ۱۸۴۰
ذوق	۱۷۸۹ - ۱۸۵۴
غالب	۱۷۹۶ - ۱۸۶۹
مومن	۱۸۰۰ - ۱۸۵۱
آزردہ	۱۷۸۹ - ۱۸۶۸
شیفتہ	۱۸۰۶ - ۱۸۶۹
بہادر شاہ ظفر	۱۷۷۵ - ۱۸۶۲

شاہ نصیر

شہرت کی بلندیوں کو چھو لینے والے ذوق اور مومن کے
استاد شاہ نصیر الدین (دہلی) شاہ محمدی مائل کے شاگرد
تھے جو قائم چاندپوری کے تلامذہ میں سے تھے۔ شاگردوں کی
فوج تھی۔ بڑے مشاق شاعر تھے۔ قدرت کلام ان کی غزلوں
سے ثابت ہے جن میں سے بیشتر سنگلاخ زمینوں میں جدید
استعارات و تشبیہات میں جدت طبع دکھائی ہے
دہلی میں تھے مگر رنگ ناسخ سے بہت حد تک ملتا
جلتا ہے۔

یہ درمیاں سے اٹھا دے حجاب کا پردہ
بلا سے تیری اگر ہم رہے رہے نہ رہے

شاہ نصیر

○

خاک سے دیکھ مری چشمِ نگار آلودہ
چشمِ قاتل ہوئی سرمے سے غبار آلودہ

سانپ چھاتی پہ مری کیونکہ نہ لوٹے رہ رہاں
عرقِ سینہ سے پھولوں کا ہے ہار آلودہ

خوب اوصاف ہیں ہر چند بظاہر لیکن
دل تو جوں شیشۂ ساعت ہے غبار آلودہ

○

گرمیٔ بازارِ آہ دیکھ دلا اور ہے
گل کی ہوا اور تھی، آج ہوا اور ہے

اے ستم ایجاد ہم تجھ سے کہاں تک کہیں
طرزِ جفا اور ہے رسمِ وفا اور ہے

دامنِ گل تو نے گو چلتے ہوئے چھو لیا
بات لگاوٹ کی پر، بادِ صبا اور ہے

○

تو وہ چمن آرا ہے کہ ہر دستۂ نرگس
دیکھے ہے ترا بن کے تماشا ہمہ تن چشم

برقع کو اُلٹ مجھ سے جو کرتا ہے وہ باتیں
اب میں ہمہ تن گوش بنوں، یا ہمہ تن چشم

آنکھوں کے تصور میں نصیرؔ اس کے شب و روز
دل صورتِ آئینہ ہے اپنا ہمہ تن چشم

ذوق

شیخ محمد ابراہیم ـ دلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں شاہ
نصیر سے اصلاح لی۔ لیکن جلد ہی علیحدہ ہو گئے
اور ادبی حلقوں میں ان کی انفرادی استادی مان
لی گئی۔ دربار میں رسائی ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر
شاگرد بنے۔ ان کے قصائد سودا کی طرح فارسی
اساتذہ سے آنکھیں چار کرتے ہیں۔ برمحل محاورات
خوبصورت بندشیں، غزلوں کی خصوصیات ہیں۔
انگریزی کے شاعر پوپ کی طرح ذوق کے بھی متعدد
اشعار ضرب المثل ہو گئے۔

رکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بُو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

ذوق

○

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

کم ہوں گے اس بساط پہ ہم ایسے بدقمار
جو چال ہم چلے وہ نہایت بری چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو ہو معلوم وقتِ مرگ
کیا ہم رہے یہاں، ابھی آئے ابھی چلے

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جبتک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

○

بے یار روزِ عید شبِ غم سے کم نہیں
جامِ شراب دیدۂ پُرنم سے کم نہیں

دیتا ہے دورِ چرخ کسے فرصتِ نشاط
ہو جس کے پاس جام وہ آبِ جم سے کم نہیں

زیبا ہے روئے زرد پہ کیا اشکِ لالہ گوں
اپنی خزاں بہار کے موسم سے کم نہیں

اے ذوق کس کو چشمِ حقارت سے دیکھیے
سب ہم سے ہیں زیادہ، کوئی ہم سے کم نہیں

○

دشنام ہو کے وہ ترش ابرو ہزار دے
یاں وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

بے فیض گر ہے چشمۂ آبِ بقا تو کیا
مانگو تو ایک قطرہ نہ آئینہ وار دے

اس جبر پر تو ذوق بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

○

آنکھ اُس پُر جفا سے لڑتی ہے
جان کشتی قضا سے لڑتی ہے

شعلہ بھڑکے نہ کیونکہ محفل میں
شمع تجھ بن، ہوا سے لڑتی ہے

دیکھو اُس چشم مست کی شوخی
جب کسی پارسا سے لڑتی ہے

○

عہدِ پیری شباب کی باتیں !
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

اُس کے گھر لے چلا مجھے دیکھو
دلِ خانہ خراب کی باتیں

سنتے ہیں اُس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم
کس مزے سے عتاب کی باتیں

ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوق
ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

ذوق

○

کیا آئے، تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینے میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

کیا روکا اپنے گریہ کو ہم نے کہ لگ گئی!
پھر وہی آنسوؤں کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

کوئی گھڑی اگر وہ ملائم ہوئے تو کیا
کہہ بیٹھیں گے پھر ایک کڑی دو گھڑی کے بعد

کہتا رہا کچھ ان سے عدو دو گھڑی تلک
غماز نے پھر اور جڑی دو گھڑی کے بعد

تھے دو گھڑی سے شیخ جی شیخی بگھارتے
ساری وہ شیخی ان کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

○

ہاں! تامل دم ناوک فگنی خوب نہیں!
ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں

گل پریشان ہوا ہنس کے چمن میں آخر!
دیکھ اے غنچہ یہاں خندہ زنی خوب نہیں

یہ نہیں شیشۂ مے، ہے کسی میخوار کا دل
محتسب! دیکھ، نہ کر دل شکنی خوب نہیں

بات تو ہم نے بنائی تھی وہاں خوب، مگر!
تھی جو بگڑی ہوئی قسمت تو بنی خوب نہیں

خلش خار کا کھٹکا ہے بغل میں موجود
دیکھ! گل؟ دعوئے نازک بدنی خوب نہیں

غالبؔ

ابتدا میں اسدؔ اور پھر غالبؔ تخلص اپنانے والے
مرزا اسد اللہ خاں ۔ نہ فنِ شاعری میں کسی کے
شاگرد ہی کی اور نہ کسی کی پیروی کی ۔ اپنا ایسا نیا
انداز نکالا جو انہیں پر ختم ہو گیا۔ جیسے میر تقی میرؔ
کے بعد کسی دوسرے کو وہ درجہ نصیب نہ ہوا جو
غالبؔ کو میسر آیا۔ مرزا اپنے ماحول سے بالکل علیحدہ
اور اس سے کہیں بالاتر نظر آتے ہیں۔ غزلیں پڑھئے
تو معلوم ہو کسی اعلیٰ و جدید یونیورسٹی کو پابونی کا
شرف بخشنے آئے ہیں۔ اہلِ ذوق ان کے فارسی
کلام کو اردو شاعری سے بلند تر سمجھتے ہیں۔ ان کے
ابتدائی اردو کلام میں آپ فارسی کا غلبہ پائیں گے۔
خیالات اتنے بلند تھے کہ "نئی زبان" رسائی کو
ترس جاتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ راہ نکلی۔ آخر کی اکثر
غزلیں نہایت صاف اور سلیس ہیں۔ مرزا غالبؔ
کے کلام کو یہ امتیاز و فخر بھی حاصل ہے کہ پہلی بار ان
کلام کی شرح ایک دو نہیں سات شرحیں لکھی گئیں

رات پی زمزم پہ مے، اور صبحدم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

غالب

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ
شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں
یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

○

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن!
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو اُن کے جی میں کیا آیا کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہے ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

جانفزا بادہ ہے جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج!
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا اِن بستیوں کو تم، کہ ویراں ہو گئیں

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کئے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدّت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق!
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں، بخونِ دل!
سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کو طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کئے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

مومن

حکیم مومن خاں، اصلاً کشمیری تھے۔ دادا دہلی میں آکر بس گئے تھے اور شاہی طبیبوں میں تھے۔ خود بھی اچھے طبیب اور منجم تھے۔ شاعر تو خیر بہت اچھے تھے ہی شطرنج کے بھی ماہر تھے۔ ان کے کلام میں کہیں کہیں طب اور نجوم کی جانب اشارے بھی ملتے ہیں۔ ان کی نازک خیالی، رنگینی و شیریں بیانی مشہور ہے۔ حسن پرستی، عاشقانہ شاعری سے جھلکتی ہے۔ تشبیہات اور استعارات کے دلفریب استعمال کے باعث مومن اردو کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز شعراء میں سے ہیں اور تخلص کا استعمال تو کوئی ان سے سیکھے۔ شیفتہ، تسکین اور نسیم دہلوی قابلِ ذکر شاگرد تھے۔

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

حکیم مومن خاں مومن

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

نارسائی سے دم رکے تو رکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حال دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو
دست عاشق رسا نہیں ہوتا

کس کو ہے ذوقِ تلخ کامی لیک
جنگ بن کچھ مزا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرضِ مضطر اے مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

حکیم مومن خاں مومن

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھا پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو، تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلۂ ملامت اقربا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی ایسی بات اگر ہوئی کہ تمہارے دل کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا، نہ وہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

الٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بےطاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے
اٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

دستِ جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا
الجھا ہے ان سے شوخ کے بندِ قبا کے ساتھ

وہ لالہ رو گیا نہ ہو گل گشتِ باغ کو !
کچھ رنگِ بوئے گل کے عوض ہے صبا کے ساتھ

اس کی گلی کہاں یہ تو کچھ باغِ خلد ہے
کس جائے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

آتی ہے بوئے داغ شبِ تارِ ہجر میں
سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ

اللہ رے سوزِ آتشِ غم بعدِ مرگ بھی
! اٹھتے ہیں مری خاک سے شعلے ہوا کے ساتھ

تھے وعدے سے پھر آنے کے خوش، یہ خبر نہ تھی
ہے اپنی زندگانی اسی بے وفا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی ! بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے، کئی بے جاں ہوں گے

تابِ نظّارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں، شبِ ہجراں ہوں گے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے، کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں
گر وہ ہوں گے بھی تو بے وقت پشیماں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ہم نکالیں گے سن اے موجِ ہوا بل تیرا
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

صبر یارب مری وحشت کا پڑے گا کہ نہیں
چارہ فرما بھی کبھی قیدیٔ زنداں ہوں گے

منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہوں گے

داغِ دل نکلیں گے تربت سے مری جوں لالہ
یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہوں گے

○

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح !
اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

مر چک کہیں کہ اس غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے
کہتے تو ہیں بھلے کی و لیکن بری طرح !

نے تابِ ہجر میں ہے، نہ آرام وصل میں
کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے منہ سے کیا بھلی
قربان تیرے ! پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

پامال ہم نہ ہوتے فقط جورِ چرخ سے
آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح

نے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے
کیا کیجیے ! ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح،

ہوں جاں بلب بتانِ ستمگر کے ہاتھ سے
کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومن اسی طرح !

○

چاکِ پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں !
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

— (ق) —

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں، وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

سنگ اور ہاتھ وہی، وہ ہی سر و داغِ جنوں
وہ ہی ہم ہوں گے وہی دشت و بیاباں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن !
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

آزردہ

اپنے زمانہ کے علماء میں شمار کئے جانے والے مفتی صدر الدین آزردہ تخلص فرمانے کے باوجود کبھی آزردہ خاطر نہ ہوئے۔ شعر و سخن میں مشورہ میر نظام الدین ممنون سے کرتے تھے۔ وہ کس پایہ کے عالم تھے اس کا اشارہ فرحت اللہ بیگ نے اس جملے سے ہوتا ہے کہ اس مرتبہ کے عالم، شاعر نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو استاد ہوجاتے ہیں۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

مفتی صدرالدین آزردہ

نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں
کب آسماں زمیں و زمیں آسماں نہیں

اے بلبلانِ شعلہ دم اک نالہ اور بھی
گم کردہ راہ باغ ہوں، یادِ آشیاں نہیں

اس بزم میں نہیں کوئی آگاہ، ورنہ کب
واں خندہ زیرِ لب، ادھر اشکِ نہاں نہیں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

ملنا ترا یہ غیر سے ہو بہرِ مصلحت
ہم کو تو سادگی سے تری، یہ گماں نہیں

افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں

کہتا ہوں اس سے کچھ میں، نکلتا ہے منہ سے کچھ
کہنے کو یوں تو ہے گی زباں، اور زباں نہیں

کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شبِ فراق
شاید کہ گردشِ آج تجھے آسماں نہیں

آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اس کے روبرو
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

شیفتہ

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ دہلی کے ادبی حلقوں میں
ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ مومن اور غالب سے
مشورہ سخن ہوتا تھا اور حالی کے احباب خاص میں
سے تھے۔ ایک تذکرۂ شعراء بنام "گلشن بے خار"
مرتب کیا تھا جس میں تنقید نگاروں کی ان گنت
تعداد نے استفادہ کیا

کس لیے لطف کی باتیں ہیں پھر
کیا کوئی اور ستم یاد آیا!

○

بچتے ہیں اس قدر جو اُدھر کی ہوا سے ہم
واقف ہیں شیوۂ دلِ شورش ادا سے ہم

ہے جامہ پارا پارا، دل و سینہ چاک چاک
دیوانہ ہو گئے گلِ جیبِ قبا سے ہم

کیا جانتے تھے صبح وہ محشر قد آئے گا
شامِ شبِ فراق نہ مرنے بلا سے ہم

کم التفات ہم سے، سمجھتے ہیں اہلِ بزم
شرمندہ ہو گئے تری شرم و حیا سے ہم

○

کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں
کچھ آگ بھری ہوئی ہے نے میں

کچھ زہر اُگل رہی ہے بلبل!
کچھ زہر ملا ہوا ہے مے میں!

بدمست جہان ہو رہا ہے
ہے یار کی بو ہر ایک شے میں

مے خانہ نشین قدم نہ رکھیں
بزمِ جم و بارگاہ کے میں

کچھ شیفتہ یہ غزل ہے آفت
کچھ درد ہے مطربوں کی نے میں

مت چھیڑ کہ یار سے جدا ہوں
اے مرگ! میں آپ مر رہا ہوں

ممکن نہیں بن ملے، نبا ہوں
بیگانہ آشنا نما ہوں!

لیلیٰ کہے سے بگڑ گئے تھے
دیوانہ میں جان کر بنا ہوں

کہتا ہوں جو غیر سے نہ ملیے
کہتا ہے کہ کیا میں بے وفا ہوں

روشن ہے مری سیاہ بختی!
منت کش سایۂ ہما ہوں!

بیگانہ وشی ستم ہے ان کی!
غیروں کو بھی یار جانتا ہوں

اس غیرت گل سے ربط معلوم
ہر چند کہ میں ہمدم صبا ہوں

ہمدم! نہ سہی محبت اس کو!
اس بات پہ کیا اسے نہ چاہوں

مکشوف ہوا فروغ مے سے
ذرہ میں کس آفتاب کا ہوں

میں شیفتہ ہوں عزیز دل ہا
شیریں گفتار خوش نوا ہوں

ہے گونہ گونہ شک ابھی عفوِ گناہ میں
جو ہے زبان پر، وہ نہیں ہے نگاہ میں

تمکینِ اضطراب ہے، بیدادِ التفات
کیا شوخئ اثر ہے سراسیمہ آہ میں

ہر خار و خس ہے وجد میں، ہر سنگ و خشت مست
کیا مے کشوں نے آکے کہا خانقاہ میں؟

دشمن سے بھی زیادہ ہے، گو دوست کیوں نہ ہو
مل جائے جو کوئی ترے کوچے کی راہ میں

صیاد دلفریب کا اللہ رے لطفِ عام
بے زخم ایک صید نہیں، صید گاہ میں

دن رات جلوے دیکھتے ہیں مہر و ماہ کے
یہ روشنی نہ مہر میں دیکھی، نہ ماہ میں

تجھ کو نظر نہ آئے، تو اپنا علاج کر!
ہے مرغزار جلوہ نما برگِ کاہ میں

دھوکا مجھی کو صرف نہیں میلِ یار کا
دیکھا بڑے بڑوں کو اسی اشتباہ میں

ہر شیوہ اس کا اپنی جگہ میں تمام ہے
اعجاز بات میں ہے، تو جادو نگاہ میں

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزہ ہے، نہ لذت گناہ میں

فن اور شخصیت

شیفتہ

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں!
جلوے نے تیرے آگ لگائی نقاب میں

سو مہر کا فروغ ہے واں جلوہ گاہ میں
سو باغ کی شمیم ہے واں رختِ خواب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا!
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

سالک کی یہ مراد کہ مجھ سا ہو نفس بھی
رہزن کو یہ خیال کہ رہرو ہو خواب میں

اس صوتِ جاں نواز کا ثانی بنا نہیں
کیا ڈھونڈتے ہو بربط و عود و رباب میں

اے وائے! روزِ حشر اگر ہم سے ہو سوال!
جو کچھ کیا ہے ہم نے شبِ ماہتاب میں

شرمِ گنہ، نہ بیمِ عقوبت، یہ رنج ہے
ہے ہے اٹھائی اس نے اذیت عتاب میں

لڑتی نہ جائے آنکھ جو ساقی سے شیفتہ
ہم کو تو خاک لطف نہ آئے شراب میں

کیوں کر سے مجھے خط رقم کریں گے
کیا غیر کا سر قلم کریں گے

ہم پیشہ ہے اضطراب و شوخی
کس واسطے مجھ سے رم کریں گ

اتنی بھی بری ہے بے قرار
اب آپ سے اُنس کم کریں

مرنے کا مرے نہ ذکر کر
قاصد! وہ بہت الم کریں

آرام کی فکر اب ہوئی
تم سے نہ ہوا، وہ ہم کریں

دلی میں تو شیفتہ ہے ا
ہم قصدِ سوئے عجم کریں

خاندان مغلیہ کے آخری بادشاہ، سراج الدین محمد بہادر شاہ بد نصیبوں میں سرفہرست ہوئے۔ ان پر اور ان کے خاندان پر جو مصائب گذرے وہ اپنی نوعیت کی ایک عجیب عبرت انگیز داستان ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد معزول کرکے رنگون بھیجدیئے گئے تو پھر خون بھی رگوں میں پلٹ کر نہ آیا۔ فن لطیف کی طرف جھکاؤ نے موسیقی سے زیادہ شاعری کی طرف مائل کیا۔ پہلے شاہ نصیر پھر ذوق اور ان کے بعد غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ کلام پر اثر۔ تصوف کا رنگ چھلکا پڑتا ہے۔ زبان و ادائیگی ایک دلکش سادگی سے لپٹی ہوئی ہے۔

کتنا ہے بد نصیب ظفرؔ دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

بہادر شاہ ظفر

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بیقراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

تیری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

عکسِ رخسار نے کس کے ہے تجھے چمکایا
تاب تجھ میں مہِ کامل کبھی ایسی تو نہ تھی

لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

کہدو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

ظفر

بہار آئی ہے، بھر دے بادۂ گل گوں سے پیمانہ
رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد میخانہ

اسی رشکِ پری پر جان دیتا ہوں میں دیوانہ
ادا جس کی ہے بانکی، ترچھی چتون، چال مستانہ

مجھے کیوں کر مرے اور اس پری پیکر کے یارانہ
وہ بے پروا ہیں سودائی، وہ سنگیں دل میں دیوانہ

مجھے آنا ملے کیوں کر تری محفل میں جانانہ
مری صورت فقیرانہ، ترا دربار شاہانہ

غزالِ وحشت لوٹے دیکھ کر مجنوں کی میت کو
یہ وحشی مر گیا بس ہو چکا آباد ویرانہ

ہمارے اور تمہارے عشق کا چرچا ہے شہروں میں
کوئی سنتا نہیں اب لیلیٰ و مجنوں کا افسانہ

گزر یارب! گلستاں میں ہوا ہے کس شرابی کا
کہ شاخیں جھومتی ہیں، نالۂ بلبل ہے مستانہ

ظفر وہ زاہدِ بے درد کی ہو حق سے بہتر ہے
کرے گر رندِ دردِ دل سے ہائے و ہوئے مستانہ

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا
کوئی یاں تک اسے لایا تو ہوتا

مزا رکھتا ہے زخمِ خنجرِ عشق
کبھی اے بوالہوس کھایا تو ہوتا

یہ نخلِ آہ ہوتا بید ہی کاش
نہ ہوتا گو ثمر، سایا تو ہوتا

جو کچھ ہوتا سو ہوتا تو نے تقدیر
وہاں تک مجھ کو پہنچایا تو ہوتا

کیا کس جرم پر تو نے مجھے قتل
ذرا تو دل میں شرمایا تو ہوتا

دل اس کی زلف میں الجھا ہے کب سے
ظفر اک روز سلجھایا تو ہوتا

ظفر

○

جلایا آپ ہم نے ضبط کر کے آہِ سوزاں کو
جگر کو، سینے کو، پہلو کو، دل کو، جسم کو، جاں کو

ہمیشہ کنجِ تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں
الم کو، یاس کو، حسرت کو، بیتابی کو، حرماں کو

ترے اندام و روی و قد و زلف و خط سے ہے خجلت
سمن کو، ارغواں کو، سرو کو، سنبل کو، ریحاں کو

جگہ کن کن کو دوں دل میں ترے ہاتھوں کے اے قاتل
کٹاری کو، چھری کو، بانک کو، خنجر کو، پیکاں کو

ترے دندان و لب نے کر دیا بے قدر عالم میں
گہر کو، لعل کو، یاقوت کو، ہیرے کو، مرجاں کو

لڑا کر آنکھ اُس سے ہم نے دشمن کر لیا اپنا
نگہ کو، ناز کو، انداز کو، ابرو کو، مژگاں کو

نہیں قلقل، دعا دیتا ہے شیشہ دم بدم ساقی
سبو کو، خم کو، مے کو، میکدہ کو، مے پرستاں کو

نہ موجب تو ہی اے ساقی! بھلا پھر کیا کرے کوئی
ہوا کو، ابر کو، گل کو، چمن کو، صحنِ بستاں کو

بنایا اے ظفر خالق نے کب انسان سے بہتر
ملک کو، دیو کو، جن کو، پری کو، حور و غلماں کو

○

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامنِ بادِ سرِ شام ہی سے بجھا دیا

مجھے دفن کرنا تو جس گھڑی، تو یہ اس سے کہنا کہ اے پری
وہ جو تیرا عاشقِ زار تھا، تہِ خاک اُس کو دبا دیا

دمِ غسل سے مرے پیشتر اسے ہمدموں نے یہ سوچ کر!
کہیں جائے اُس کا نہ دل دہل، مری لاش پہ سے ہٹا دیا

مری آنکھ جھپکی تھی ایک پل، مرے دل نے چاہا کہ اٹھ کے چل
دلِ بیقرار نے او میاں! وہیں چٹکی لے کے جگا دیا

میں نے دل دیا، میں نے جان دی، مگر آہ تو نے نہ قدر کی
کسی بات کو جو کبھی کہا، اسے چٹکیوں میں اڑا دیا

چھٹا باب

اسیر	۱۸۱۴ - ۱۸۸۲
وزیر	۱۷۹۵ - ۱۸۵۳
قلق	؟ - ۱۸۸۰
صبا	۱۷۹۳ - ۱۸۵۵
رند	۱۷۹۷ - ۱۸۵۵
دیا شنکر نسیم	۱۸۱۱ - ۱۸۴۳
منیر شکوہ آبادی	۱۸۱۸ - ۱۸۸۱
نظام رامپوری	؟ - ۱۸۷۲

سید مظفر علی نام، دبیر الدولہ خطاب اور اسیر تخلص تھا۔ علامہ سید مدد علی کے فرزند تھے اور (۱۸۰۰ء) میں قصبہ امیٹھی (نواح لکھنؤ) میں پیدا ہوئے۔ دس برس کے ہوئے تو لکھنؤ چلے آئے۔ تحصیل علوم متداولہ کے بعد شاعری کا شوق پیدا ہوا تو اسیر تخلص رکھ کر مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں سرکاری ملازم ہوئے۔ واجد علی کا ناک کا بال بنے ہوئے تھے اور ۲۴ گھنٹے خدمت میں حاضر رہتے تھے جس نے ان کو جیل خانوں کا افسر اعلیٰ اور خلاصہ نویس تمام کچہریات سرکاری کا بنا دیا تھا۔ جب واجد علی شاہ معزول ہو گئے تو یہ رام پور چلے گئے اور وہاں عزت کے ساتھ رہے ۱۸۸۲ء میں بعمر ، سال انتقال کیا۔ شاعری کے علاوہ فن عروض سے ماہر تھے۔ معیار الاشعار کا نہایت قابلیت سے ترجمہ کیا۔ شعر العروض اور کئی رسالے فن عروض پر لکھے۔ اردو کے چار اور فارسی کے دو دیوان یادگار چھوڑے۔ ان کے علاوہ مراثی اور مثنویاں بھی بہت سی لکھیں۔

فن شعر میں ان کی وقعت کا اندازہ لگاؤ کہ منشی امیر مینائی، مہدی حسن ماہر، احمد علی شوق قدوائی، سلیمان خاں اسد، ظہور الحسن ظہور، ریاض خیرآبادی، نواب سید یوسف حسن طباطبائی اور پنڈت رتن ناتھ سرشار جیسے مشاہیر ادب ان کے شاگرد تھے۔

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے لیکن وہی رونق ہے مجلس کی

اسیر

○

نبضِ بیمار جو اے رشکِ مسیحا دیکھی
آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

○

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے لیکن وہی رونق ہے مجلس کی

○

آہ کب لب پر نہیں ہے داغ کب دل میں نہیں
کون سی شب ہے کہ گرمی اپنی محفل میں نہیں

خونِ ناحق کا ہمارے، داغ مٹنے کا نہیں
تیغ میں ہوگا اگر دامانِ قاتل میں نہیں

پردہ دارِ چہرۂ یوسف نہیں ہے ہر نقاب
حسنِ لیلیٰ جلوہ گر ہر ایک محمل میں نہیں

خواجہ محمد وزیر شیخ ناسخ کے شاگرد لکھنو کے ایک معزز خاندان سے تھے۔ آزاد منش اور قناعت پسند طبیعت نے درباری جبہ سائی سے محفوظ رکھا کلام میں استاد کا رنگ ہے اور زبان و محاورہ کی صحت کے لحاظ سے بہت خوب ہے۔

اسی باعث تو قتل عاشقاں کو منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو، یوسفِ بے کارواں ہو کر

وزیر

○

چلا ہے او دلِ راحت طلب، کیا شادماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

ادا سے جھک کے ملتے ہو، نگہ سے قتل کرتے ہو
ستم ایجاد ہو، ناوک لگاتے ہو کماں ہو کر

کیا غیروں کو قتل اُس نے، موئے ہم رشک کے مارے
اجل بھی، دوستو، آئی نصیبِ دشمناں ہو کر

○

ذرا تو دیکھ لے وہ ہم کو آکر
کوئی دن اور بھی اے دم وفا کر

اگر پوچھے وہ بربادی ہماری
صبا، کہہ دیجیو کچھ خاک اڑا کر

ہزاروں ہو گئے ٹکڑے گریباں
چلے اس ناز سے دامن اٹھا کر

وزیر اب تا کجا یہ بت پرستی
کسی دن تو بھلا یادِ خدا کر

آخری تاجدار اودھ، واجد علی شاہ کے مصاحبین میں شامل خواجہ ارشد علی خاں قلق، دربار سے حاصل نواب آفتاب الدولہ کا خطاب بھی رکھتے تھے۔ خواجہ وزیر کے شاگرد تھے۔ کلام میں بھی انہیں کا رنگ ہے۔ ان کی غزلیں لکھنؤ کے آخری دور کی شاعری کا پرتو ہیں۔ ایک مثنوی "طلسم الفت" بہت مشہور ہوئی۔

ادا سے دیکھ لو، جاتا رہے گلہ دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

قلق لکھنوی

ادا سے دیکھ لو، جاتا رہے گلہ دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

بہار آتے ہی کنج قفس نصیب ہوا
ہزار حیف کہ نکلا نہ حوصلہ دل کا !

چلا ہے چھوڑ کے تنہا کدھر، تصور یار
شبِ فراق میں تھا تجھ سے مشغلہ دل کا

وہ ظلم کرتے ہیں ہم پر تو لوگ کہتے ہیں
خدا بُرے سے نہ ڈالے معاملہ دل کا

ہزار فصلِ گل آئے مگر وہ جوش کہاں
گیا شباب کے ہمراہ ولولہ دل کا !

خدا کے ہاتھ ہے اپنا اب اے قلق انصاف
بتوں سے حشر میں ہوگا معاملہ دل کا

صبا

میر وزیر علی صبا۔ لکھنؤ کے باشندے اور خواجہ آتش کے شاگرد تھے۔ ان کے دیوان میں اس زمانہ کے مروج طرز و انداز کی غزلوں کے ساتھ ساتھ بہت سے اشعار آتش کے رنگ میں پائے جاتے ہیں۔ اور جو غزلیں اس انداز کی ہیں، بہت خوب ہیں۔

باقی رہے نہ فرق زمین آسماں میں
اپنا قدم اٹھالیں اگر درمیاں سے ہم

صبا لکھنوی

لوٹے ہیں صحنِ چمن پہ بادہ خوار اب کی برس
خوب سبزہ ہے کنارِ جوئے بار اب کی برس

قدرتِ حق ہے تماشائے بہار اب کی برس
اے جنوں کس رنگ پر ہے لالہ زار اب کی برس

سرو بھی دینے لگے، شمشاد بھی دینے لگے
باڑھ پر آیا جو نخلِ قدِ یار اب کی برس

ٹوٹی جاتی ہیں گلوں کے بار سے سب ڈالیاں
پھٹ پڑی ہے باغ میں کیسی بہار اب کی برس

اے صبا جب سے ابھی تک ہے خزاں کا دور دورہ
آئے گی بھی یا نہ آئے گی بہار اب کی برس

رِندؔ

نواب سید محمد خاں رندؔ۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں عمر بتادی۔ آتشؔ کے شاگرد تھے اور انھیں کا طرزِ سخن اختیار کیا۔ عاشقانہ اور صوفیانہ دونوں مضامین کو اس خوبی سے باندھا ہے کہ امتیاز کرنا دشوار ہے کہ کون سا رنگ غالب ہے۔ کلام سادہ بھی ہے اور متاثر کرنے والا بھی۔ ؎

الٰہی دیکھیے کیونکر نباہ ہوتا ہے
زباں دراز ہوں میں اور بد زباں صیاد

رند

کھلی ہے کنجِ قفس میں مری زباں صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد

اُجاڑا موسمِ گل ہی میں آشیاں میرا
الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد

اُداس دیکھ کے مجھ کو، چمن دکھاتا ہے
کئی برس میں ہوا ہے مزاج داں صیاد

دکھایا کنجِ قفس مجھ کو آب و دانہ نے
وگرنہ دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیاد

پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے
قفس کو لیکے میں اڑ جاؤں گا کہاں صیاد

قفس پہ رکھنے لگا اب تو ہار پھولوں کے
ہزار شکر، ہوا مجھ پہ مہرباں صیاد

فریبِ دانہ نہ کھاتا میں زینہار اے رند
نہ کرتا دام اگر خاک میں نہاں صیاد

دیا شنکر نسیم

پنڈت دیا شنکر کول ایک معزز کشمیری خاندان کے رکن تھے۔ فارسی اور اردو کی علمی استعداد بہت اچھی تھی، شاعری کی خاطر خواجہ آتش کو استاد بنایا۔ ان کی مشہور تصنیف۔ مثنوی گلزارِ نسیم" اپنے زمانے کے مخصوص رنگ میں، استعارے، تشبیہات اور خوبصورت مناسبات لفظی سے مزیّن اور بے حد درجہ دلآویز ہے۔ اس کا مقابلہ لوگ مثنوی میر حسن سے کرتے ہیں لیکن یہ مقابلہ عبث ہے کہ دونوں کا رنگ بالکل الگ ہے۔

جب ملے دو دل، محفل پھر کون ہے
بیٹھا رہ جائے، خود حیا اٹھ جائے گی

دیا شنکر نسیم

جب ہو چکی شراب تو میں مست ہو گیا
شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

نے قاصدِ خیال، نہ پیکِ نظر گیا
اُن تک میں اپنی آپ ہی لے کر خبر گیا

سمجھا ہے حق کو اپنے ہی جانب ہر ایک شخص
یہ چاند اس کے ساتھ چلا جو جدھر گیا

طوفانِ نوح اس میں ہو یا شورِ حشر ہو
ہونا جو کچھ ہے ہوگا، ہو گزرا، گزر گیا!

میں نے بھی آنکھیں دیکھی ہیں پریوں کی جاؤ بھی
تم نے دکھائی آنکھ مجھے، اور میں ڈر گیا

گزرا جہاں سے میں تو کہا سُن کے یار نے
قصّہ گیا، فساد گیا، دردِ سر گیا!

کاغذ سیاہ کرتے ہو کس کے لیے نسیم
آیا جوابِ خط نہیں اور نامہ بر گیا!

عشق میں دل بن کے دیوانہ چلا
آشنا سے ہو کے بیگانہ چلا

قُلقُلِ مینا سے آتی ہے صدا
بھر چکا جس وقت پیمانہ چلا

شب جو آیا بزم میں وہ شعلہ رو
شمع گل کرنے کو پروانہ چلا

بوئے گل غنچے سے کہتی ہے نسیم
بات نکلی منہ سے، افسانہ چلا

منیر شکوہ آبادی

سید اسمٰعیل حسین منیر۔ مین پوری کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ پہلے ناسخ پھر رشک سے اصلاح لی۔ آخر عمر دربار رامپور کے زیر سایہ بسر کی۔ منیر نے بڑی مشکل سنگلاخ زمینوں میں طوفانی غزلیں رقم کی ہیں۔ مناسبتِ لفظی پر بہت زور دیتے تھے۔

موسیٰ سے کہدو طور پہ جایا کریں نہ روز
اچھے نہیں ہیں برق جمالوں کے سامنے

منیر شکوہ آبادی

سرخی شفق کی زرد ہو گالوں کے سامنے
پانی بھرے گھٹا ترے بالوں کے سامنے

موسیٰ سے عہد و طور پہ جایا کریں نہ روز!
اچھے نہیں ہیں برق جمالوں کے سامنے

آنکھیں کھلی ہیں کاکل پیچاں کی یاد میں
دیکھو چراغ جلتے ہیں شالوں کے سامنے

جنس سخن کا کوئی نہیں قدرداں منیر
شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے

اک بار تیر مار کے اب تک خبر نہ لی
یارب نگاہِ مست یہ کس بے خبر کی ہے
پھر بھی نگاہ کرم ہو گی اس طرف
امید آج تک اسی پہلی نظر کی ہے

نظامؔ رامپوری

ان کے بارے میں تفصیلات کا حاصل کرنا جوئے
شیر لانے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ بس سید
نظام علی شاہ۔ مصحفیؔ کے شاگرد یار سے اصلاح
لیتے تھے اور ۱۸۷۲ء میں رامپور میں انتقال کر گئے۔
بس اتنا ہی معلوم ہوا ہے۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ
دینا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظامؔ
منہ پھیر کے ادھر کو، ادھر کو بڑھا کے ہاتھ!

نظام رامپوری

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مِل گئیں
کیا منہ پہ اُس نے رکھ لئے آنکھیں چرا کے ہاتھ

قاصد ترے بیاں سے دل ایسا ٹھہر گیا
گویا کسی نے رکھ دیا سینے پہ آ کے ہاتھ

کوچے سے تیرے اُٹھیں تو پھر جائیں ہم کہاں
بیٹھے ہیں یاں تو دونوں جہاں سے اُٹھا کے ہاتھ

دینا وہ اُس کا ساغرِ مے یاد ہے نظامؔ
منہ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

ساتواں باب

امیر مینائی ۱۸۳۲–۱۹۰۱

داغ دہلوی ۱۸۳۱–۱۹۰۵

مجروح ۱۸۳۵–۱۹۰۲

جلال لکھنوی ۱۸۳۴–۱۹۰۹

تسلیم لکھنوی ۱۸۲۰–۱۹۱۱

تشنہ – –

حالی ۱۸۳۷–۱۹۱۴

امیر مینائی

میر مظفر علی اسیر کے شاگرد منشی امیر احمد، لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ درسیات علمائے فرنگی محل سے پڑھیں۔ مگر عمر کا بڑا حصہ امیر مینائی نے رامپور کے دربار میں گزارا۔ یہاں ان کی بڑی قدر و منزلت بھی ہوئی۔ عمر کے آخری حصے میں حیدرآباد گئے اور وہیں انتقال کیا۔ زبان کی تحقیقات سے بھی بڑی دلچسپی تھی مگر افسوس کہ ان کی مشہور تصنیف "امیر اللغات" ادھوری رہ گئی۔ قادر الکلامی کے باعث انھیں اپنے زمانے کا مصحفی کہتے تھے۔ ہر رنگ و صنف کے اس شاعر کے شاگردوں کی بڑی تعداد میں جلیل، ریاض خیرآبادی، محسن کاکوروی اور مضطر کو شہرت ملی۔

شبیہہ مد نظر ہے کس کی کہ پوری پوری نہیں اترتی
مٹا دئے صانع ازل نے ہزاروں نقشے بنا بنا کر

امیرؔ مینائی

○

ناوکِ ناز سے مشکل ہے بچانا دل کا
درد اٹھ اٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانہ دل کا

آج اس شوق سے پیکاں مرے دل میں آیا
آگیا یاد کسی شوخ پہ آنا دل کا

ہائے! وہ پہلی ملاقات میں میرا رکنا
اور اس کا وہ لگاوٹ سے بڑھانا دل کا

متصل آہ کی پہلو سے صدا آتی ہے
اب وہ ہے درد کا گھر، تھا جو ٹھکانہ دل کا

جی لگے آپ کا ایسا کہ کبھی جی نہ بھرے
دل لگا کر جو سنیں آپ فسانہ دل کا

تیر پر تیر لگا کر وہ کہا کرتے ہیں!
کیوں جی تم کھیل سمجھتے تھے لگانا دل کا

پھیر کر منہ، مجھے تڑپاتے ہیں اور کہتے ہیں
رخ بدل کر ہم اڑاتے ہیں نشانہ دل کا

ہر نگہ وصل میں اس شوخ کی کہتی ہے امیرؔ
ہو جسے حکم اڑا دے وہ نشانہ دل کا

○

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں

نگاہ گرم سے مجھ کو نہ دیکھ اے دوزخ
خبر نہیں تجھے کس کا گناہ گار ہوں میں

پھر اس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے
گناہ گار یہ کہہ دے، گناہ گار ہوں میں!

بڑے مزے میں گزرتی ہے بے خودی میں امیرؔ
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

○

رہے تصویرِ حیرانی ہم اُن کے روبرو برسوں
لبِ خاموش سے کی دردِ دل کی گفتگو برسوں

نہ کر، اے یاس یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

کہاں ہوں گی امیرؔ ایسی ادائیں حور و غلماں میں
رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

امیر مینائی

رہے ہے تصویرِ حیرانی ہم ان کے روبرو برسوں
لبِ خاموش سے کی دردِ دل کی گفتگو برسوں

نہیں مٹتی ہے دل سے مر کے ان کی آرزو برسوں
یہ وہ گل ہے کہ مرجھائے پہ بھی دیتا ہے بُو برسوں

فنا کے بعد ایسے بےکسوں کو کون پوچھے گا
مگر اے بےکسی رویا کرے گی مجھ کو تو برسوں

نہ کر اے یاس یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

سراپا جرم ہوں لیکن وہ رندِ پاک طینت ہوں
کیا نامہ نے میرے آبِ خجلت سے وضو برسوں

تمہاری اک نگاہِ ناز نے توڑا اشارے میں
بنایا چشم و دل نے جو طلسمِ آرزو برسوں

کہاں ہوں گی امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں
رہے گا خلد میں بھی یادِ ہم کو لکھنؤ برسوں

اس کی حسرت ہے، جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں
ڈھونڈنے اس کو چلا ہوں، جسے پا بھی نہ سکوں

ان کے غصے کے مٹانے کی ہیں سو تدبیریں
لاگ کی آگ نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں

چٹکیاں لینے سے دل میں وہ کریں انکار !
داغ کچھ درد نہیں ہے کہ دکھا بھی نہ سکوں

میں اگر گھر سے نکلتا ہوں، تو گھر کیوں ہو اداس
کیا دمِ بازپسیں ہے کہ پھر آ بھی نہ سکوں

کوئی پوچھے تو محبت سے، یہ کیا ہے انصاف
وہ مجھے دل سے بھلا دے میں بھلا بھی نہ سکوں

نقشِ ہستی، میں ابھی محو کئے دیتا ہوں !
خطِ تقدیر نہیں ہے کہ مٹا بھی نہ سکوں

امیر مینائی

غزل نمبر

○

یہ تو میں کیوں کر کہوں تیرے خریداروں میں ہوں
تو سراپا ناز ہے، میں ناز برداروں میں ہوں

جان پر صدمہ، جگر میں درد، دل کا حالِ زار
گھر کا گھر بیمار کس کس کے پرستاروں میں ہوں

وہ کرشمے شانِ رحمت نے دکھائے روزِ حشر
چیخ اٹھا ہر بے گنہ میں بھی گنہ گاروں میں ہوں

صبح سے مطلب نہ گل سے کام کیا جانوں انھیں
میں تمہارے سینہ چاکوں میں دل افگاروں میں ہوں

چھیڑ دیکھو! میری میت پر جو آئے، یہ کہا
تم وفاداروں میں ہو، یا میں وفاداروں میں ہوں

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ
اے اسیرانِ قفس! میں نو گرفتاروں میں ہوں

بے گناہوں میں چلا زاہد جو اس کو ڈھونڈنے
مغفرت بولی ادھر آ، میں گنہ گاروں میں ہوں

بے گناہوں کا تو دعویٰ ان کے آگے کیا مجال
ڈرتے ڈرتے منہ سے نکلا میں گنہگاروں میں ہوں

آج کا تھا رحم اس کو سن کے میری بے کسی
دردِ ظالم بول اٹھا میں اسکے غمخواروں میں ہوں

○

صورتِ غنچہ کہاں تابِ تکلم مجھ کو!
منہ کے سو ٹکڑے ہوں آئے جو تبسم مجھ کو

وقتِ فرصت تھا میں عبرت کدہ ہستی میں
کفِ افسوس ملے جس نے کیا گم مجھ کو

ایک کو ایک سے بڑھ کر ترے جلوے کا ہے شوق
آنکھ کہتی ہے نگہ پر ہو تقدم مجھ کو

واہ رے بیخودیٔ شوق کیا خوب سلوک
اس کو جب ڈھونڈھ نکالا تو کیا گم مجھ کو

خلوتِ وصل میں کچھ کام نہیں ساقی کے
جامِ مے بھر کے پلاؤں میں تمہیں، تم مجھ کو

میں تو کیا، عکس سے وہ آئینہ رو کہتا ہے
پیار کی آنکھ سے دیکھا نہ کرو تم مجھ کو

میں ترا عکس تھا اس آئینۂ ہستی میں
تو نے کیا پھیر لیا منہ کہ کیا گم مجھ کو!

دیکھتا ہوں کبھی آئینہ تو روتا ہوں امیر
اپنی صورت پہ خود آتا ہے ترحم مجھ کو

داغ دہلوی

نواب مرزا خاں، دہلی میں پیدا ہوئے۔ نواب
لوہارو کے خاندان سے تھے۔ ماں نے ان کے والد کے
انتقال کے بعد شہزادہ مرزا فخرو کے ساتھ شادی رچالی
ان کے ساتھ شاہی محل میں قیام نے زبان کی چاشنی
میں اضافہ کیا۔ داغ ایک عرصہ تک رامپور میں رہے
عمر کا آخری حصہ حیدرآباد میں گزرا۔ اکثر شعرا
کے مقابلے میں داغ نے بڑی فراغت سے بسر کی۔
اس کی وجہ یہ تھی کہ شوخیٔ طبع، لطیفہ سنجی اور کلام کی
شیرینی ان کو ہر جگہ ہر دلعزیز بناتی تھی۔ داغ کے
سیکڑوں شاگردوں میں علامہ اقبال، جگر
مرادآبادی، سائل و نوح ناروی نے شہرت پائی۔

بُت کو بُت اور خدا کو جو خدا کہتے ہیں
ہم بھی دیکھیں تو اسے دیکھ کے کیا کہتے ہیں

داغ دہلوی

لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
رنج بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

مسکراتے ہوئے وہ مجمع اغیار کے ساتھ
آج یوں بزم میں آئے ہیں کہ جی جانتا ہے

کعبہ و دیر میں پتھرا گئیں دونوں آنکھیں
ایسے جلوے نظر آئے ہیں کہ جی جانتا ہے

دوستی میں تری درپردہ ہمارے دشمن
اس قدر اپنے پرائے ہیں کہ جی جانتا ہے

انہی قدموں نے تمہارے، انہی قدموں کی قسم
خاک میں اتنے ملائے ہیں کہ جی جانتا ہے

داغ وارفتہ کو ہم آج ترے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

دل مفت لے کے کہتے ہیں، کچھ کام کا نہیں
الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا

افشائے راز عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اسے جتا تو دیا، جان تو گیا

ہوش و حواس، تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے ۔۔۔ دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے

ہم نکمے ہوئے زمانے کے ۔۔۔ کام ایسا سکھا دیا تو نے

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے ۔۔۔ دلِ بے مدّعا دیا تو نے

بے طلب جو ملا، ملا مجھ کو ۔۔۔ بے غرض جو دیا، دیا تو نے

عمرِ جاوید، خضرؑ کو بخشی ۔۔۔ آبِ حیواں پلا دیا تو نے

نارِ نمرود کو، کیا گلزار ۔۔۔ دوست کو یوں بچا لیا تو نے

کہیں مشتاق سے حجاب ہوا ۔۔۔ کہیں پردہ اُٹھا دیا تو نے

جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی ۔۔۔ مجھ کو اس سے سوا دیا تو نے

مٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب ۔۔۔ نقش اپنا جما دیا تو نے

مجھ گنہ گار کو جو بخش دیا ۔۔۔ تو جہنم کو کیا دیا تو نے

داغ کو، کون دینے والا تھا

جو دیا، اے خدا! دیا تو نے

داغ

چاک ہو پردۂ وحشت، مجھے منظور نہیں
ورنہ یہ ہاتھ، گریبان سے کچھ دور نہیں

وصل سے یاس ہو، ایسا دلِ رنجور نہیں
بت اگر دُور رہے مجھ سے، تو خدا دور نہیں

چھین لیں دل کو اگر وہ، تو یہ مجبوری ہے
میں کہے جاؤں گا، محتاج ہوں، مقدور نہیں

لب تک آئی تھی شکایت کہ محبت نے کہا
دیکھ! پچھتائے گا، خاموش! یہ دستور نہیں

رات دن نامہ و پیغام کہاں تک ہوں گے
صاف کہہ دیجیے، ملنا ہمیں منظور نہیں

کیا کرے داغ کوئی اس کی محبت کا علاج
وہ کلیجا ہی نہیں، جس میں یہ ناسور نہیں

تو ہے مشہور دل آزار یہ کیا!
تجھ پہ آتا ہے مجھے پیار یہ کیا

تیری آنکھیں تو بہت اچھی ہیں
سب انھیں کہتے ہیں بیمار یہ کیا

ہاتھ آتے ہی متاعِ الفت!
ہاتھ ملتے ہیں خریدار یہ کیا!

جانتا ہوں کہ مری جان ہے تو
اور میں جان سے بیزار یہ کیا

باتیں سنیے تو بھڑک جائیے گا
گرم ہیں داغ کے اشعار یہ کیا

مجروح

میر حسین فگار کے فرزند ارجمند میر مہدی مجروح دہلی کے باشندے تھے۔ ۸۰ سال کی عمر پائی اور اس کا بڑا حصہ الور اور رامپور میں گزرا۔ والد کے تخلص فگار کے لحاظ سے ہی مجروح کہلائے۔ مرزا غالب کے شاگرد رشید بھی تھے اور دوست بھی۔ استاد کے اکثر خطوط ان کے نام اردوئے معلی میں موجود ہیں۔ کلام میں اگرچہ کہ سادگی ہے مگر پر اثر ہے۔

یہ جو چپکے سے آئے بیٹھے ہیں
لاکھ فتنے اٹھائے بیٹھے ہیں

فن اور شخصیت

میر مہدی مجروح

غیر دل کو جدا سمجھے اور رشک سے تو بُرا جانا
سمجھے بھی تو کیا سمجھے، جانا بھی تو کیا جانا

اے عمر یہ جو بلے ہوتے ہیں فراغت سے
اے غلغلۂ محشر، ہم کو نہ جگا جانا

کچھ عرضِ تمنا میں شکوہ نہ ستم جانا
میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا

چتوں کا الٹ جانا، ظاہر کا بہانہ ہے
اُن کو تو بہر صورت اک جلوہ دکھا جانا

ہے حق بہ طرف اُس کے، چاہے سو ستم کر لے
اُس نے دلِ عاشق کو مجبورِ وفا جانا

انجام ہوا اپنا آغازِ محبت میں
اس شغل کو جاں فرسا ایسا تو نہ تھا جانا

مجروح ہوئے مائل کس آفتِ دوراں پر
اے حضرتِ من، تم نے دل بھی نہ لگا جانا

جلال لکھنوی

نام حکیم سیّد ضامن علی۔ رشک کے شاگرد تھے
ان کو زبان کی تحقیق سے کافی دلچسپی تھی اور لغات،
قواعدِ اردو اور فنِ عروض و قافیہ پر کئی مستند
کتابیں لکھی ہیں۔ کلام میں ناسخ اور رشک کا
رنگ جھلکتا ہے۔ شاگردوں میں آرزو لکھنوی
نے شہرت پائی۔

گئی تھی کہہ کے، مَیں لاتی ہوں زلفِ یار کی بُو
پھری تو بادِ صبا کا دماغ ہی نہ ملا

فن اور شخصیت

جلالؔ لکھنوی

○

نہ ٹھہری جب کوئی تسکین دل کی شکل یاروں میں
تو آ نکلے تڑپ کر ہم تمہارے بے قراروں میں

کسی کے عشق میں درد جگر سے دل یہ کہتا ہے
ادھر بھی آ نکلنا، ہم بھی ہیں امیدواروں میں

وہ ماتم بزم شادی ہے، تمہاری جس میں شرکت ہو
وہ مرنا، زندگی ہے، تم جہاں ہو سوگواروں میں

تعلّی سے یہ نفرت ہے کہ بعد مرگ خاک اپنی
اگر اٹھتی بھی ہے، جا بیٹھتی ہے خاکساروں میں

ہمارے دل نے ہم سے بے وفائی کر کے کیا پایا؟
وہاں بھی جا کے ٹھہرایا گیا بے اعتباروں میں

وہ کھینچوں گا جلالؔ، آہیں کہ اس کی خاک اڑا دیں گی
فلک نے پیس ڈالا ہے سمجھ کر خاکساروں میں

○

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا
ملا وہ غم کدہ جس کو چراغ بھی نہ ملا

گئی تھی کہہ کے، میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بو
پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

اسیر کر کے ہمیں کیوں رہا کیا صیّاد
وہ ہم صفیر بھی چھوٹے وہ باغ بھی نہ ملا

بھر آئے محفلِ ساقی میں کیوں نہ آنکھ اپنی
وہ بے نصیب ہیں خالی ایاغ بھی نہ ملا

جلالؔ باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم
چمن کو پھول ملے، ہم کو داغ بھی نہ ملا

اگرچہ منشی امیر اللہ تسلیم نے ضلع فیض آباد میں ولادت پائی لیکن عمر کا زیادہ حصہ لکھنؤ میں گذرنے کے باعث لکھنوی کہلائے۔ نسیم دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ تسلیم کا رنگ اس زمانے کے لکھنؤ کے شعراء سے مختلف نہ تھا۔ البتہ ان کے شاگرد حسرت موہانی نے مومن اور نسیم دہلوی کے رنگ کو چمکایا۔

کس قدر زود فراموش ہے یادِ محبوب
رات بھر سیکڑوں وعدے تھے سحر کچھ بھی نہیں

تسلیم لکھنوی

ن مرا تھا، آج وہ بت غیر کا ہونے لگا
ے قسمت وہی دن ہیں کیا سے کیا ہونے لگا

د میری آ گئی منہ پھیر کر رونے لگے
مجمن میں ان کی جب ذکرِ وفا ہونے لگا

اسے کب اس نے نکالے اپنے پیکاں کھینچ کر
رو کی لذت سے جب دل آشنا ہونے لگا

اہ نے اتنی تو کی تاثیر پیدا، شکر ہے
بام پہ آنے لگے وہ، سامنا ہونے لگا

خوب رویا بیٹھ کر واماندگی کی جان کو
جب مری نظروں سے پنہاں قافلہ ہونے لگا

یہ بھی اے تسلیم ہے برگشتہ بختی کا اثر
جب دوا کی ہم نے دردِ دل سوا ہونے لگا

جلوہ گر زیرِ زمیں شمس و قمر کچھ بھی نہیں
یہ وہ عالم ہے جہاں شام و سحر کچھ بھی نہیں

کسقدر زود فراموش ہے یادِ محبوب
رات بھر سینکڑوں وعدے تھے سحر کچھ بھی نہیں

نکہتِ گل ہوں کہ ہوں نشۂ صہبا، پرکیا
یوں تو کہنے کو میں سب کچھ ہوں، مگر کچھ بھی نہیں

جیتے جی سب تھے مری جان کے دشمن تسلیم
مرتے ہی، کاہشِ دل، سوزِ جگر کچھ بھی نہیں

تشنہ

مجذوبانہ کیفیت میں مست و الست بے نیازانہ
شان سے ہر دور اور ہر ماحول سے گزر جانے والے
محمد علی تشنہ کی زندگی کے بہت سارے پہلوؤں پر
آج بھی دبیز پردہ ہے۔ ذوق کے شاگرد تھے اور ان
کی صرف ایک غزل نے بہت شہرت پائی جس کا
مطلع ہے ؎

کیا کہا، پھر تو کہو، دل کی خبر کچھ بھی نہیں
پھر یہ کیا ہے، خم گیسو میں اگر کچھ بھی نہیں

محمد علی تشنہ

کیا کہا، پھر تو کہو، دل کی خبر کچھ بھی نہیں
پھر یہ کیا ہے، خمِ گیسو میں اگر کچھ بھی نہیں

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر، اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع ہے، گل بھی ہے، بلبل بھی ہے پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے، سحر کچھ بھی نہیں

حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش
سیر کرتا ہوں اُدھر کی، کہ جدھر کچھ بھی نہیں

شمع مغرور نہ ہو بزم فروزی پہ بہت
رات بھر کی یہ تجلی ہے سحر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ
فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

حالیؔ

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالیؔ۔ پیدائش پانی پت کی ہے۔ ۱۷ برس کے تھے کہ دہلی آگئے اور پھر شاعری کے شوق نے جنم لیا۔ شیفتہ کی صحبت کا اثر گہرا تھا۔ شاگردی غالبؔ کی اختیار کی۔ لاہور میں اور دہلی میں محکمۂ تعلیم میں ملازم رہے۔ سر سید کی فرمائش پر "مسدس مد و جزر اسلام" لکھا جو ادبی اور تاریخی حیثیت سے ایک یادگار کارنامہ ہے۔ مسدس نظموں اور مثنویوں کے علاوہ حالیؔ غزل کے بھی بلند پایہ شاعر ہیں۔ ابتدائی غزلیں..... استعارات اور تشبیہات سے مزین ہیں اور اپنے طرز میں خوب ہیں۔ کلیاتِ حالیؔ کے ساتھ ان کا مقدمۂ شعر و شاعری بہت ہی مشہور ہوا۔

دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل
اگر تیر اس کا خطا ہوگیا

الطاف حسین حالیؔ

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

ہیں دورِ جامِ اوّلِ شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں

یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اُس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق !
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی !
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالیؔ نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں

وحشت میں تھا خیالِ گل و یاسمن کہاں
لائی ہے بوئے اُنس، نسیمِ چمن کہاں

ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوقِ دید بھی
جائے گا دیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں

فصلِ خزاں کمیں میں ہے، صیاد گھات میں
مرغِ چمن کو فرصتِ سیرِ چمن کہاں

لاتا ہے دل کو وجد میں اک حرفِ آشنا
لے جائے ہم کو دیکھیے ذوقِ سخن کہاں

جی ڈھونڈتا ہے بزمِ طرب میں اُنھیں مگر
وہ آئے انجمن میں، تو پھر انجمن کہاں

دل ہو گیا ہے لذتِ غربت سے آشنا
اب ہم کہاں، ہوائے نشاطِ وطن کہاں

کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے
شکوے کو لے گیا ہے وہ بیداد فن کہاں

روکا بہت کل آپ کو حالی نے واں مگر
جاتا ہے محوِ شوق کا دیوانہ پن کہاں!

الطاف حسین حالی

رنج اور رنج بھی تنہائی کا !
وقت آیا مری رسوائی کا !

عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

ایک دن راہ پہ جا پہنچے ہم
شوق تھا بادیہ پیمائی کا !

اُس سے ناداں ہی بنکر ملیے
کچھ اجارہ نہیں دانائی کا !

اُس کو چھوڑا تو ہے لیکن اے دل
مجھکو ڈر ہے تری خود رائی کا

بزمِ دشمن میں نہ جی سے اترا
پوچھنا کیا تری زیبائی کا !

ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا !

آٹھواں باب

اکبر الہ آبادی	۱۸۴۶-۱۹۲۱
چکبست	۱۸۸۲-۱۹۲۶
شاد عظیم آبادی	۱۸۴۶-۱۹۲۷
مرزا رسوا	۱۸۵۷-۱۹۲۱
ریاض خیرآبادی	۱۸۵۳-۱۹۳۵
مضطر خیر آبادی	۱۸۶۵-۱۹۲۷
جلیل مانکپوری	۱۸۶۵-۱۹۴۶
حفیظ جونپوری	- -
نوح ناروی	۱۸۷۸-۱۹۶۳
صفی لکھنوی	۱۸۶۲-۱۹۵۰
عزیز لکھنوی	۱۸۸۲-۱۹۳۵
ثاقب لکھنوی	۱۸۶۹-۱۹۴۹
تلوک چند محروم	۱۸۸۷-
جوش ملسیانی	۱۸۸۳
اثر لکھنوی	۱۸۸۵

اکبر الہ آبادی

سیّد اکبر حسین رضوی۔ الہ آباد میں پیدا ہوئے۔
وحید سے تلمذ رکھتے تھے۔ باوجود سرکاری ملازمت
کی بندشوں کے قوم کی اصلاح اور ترقی کے لئے
اپنا کلام وقف کر رکھا تھا۔ یہ پہلے شاعر تھے جنھوں
نے انگریزی تہذیب کے عیوب و نقائص کی نہ صرف
نشاندہی کی بلکہ اس کی بے جا نقالی کے برے
اثرات کی جانب متوجہ بھی کیا۔ اکبر نے غزل کی شاعری
کا دامن بہت وسیع کر دیا ہے۔ فلسفہ، اخلاقیات
سیاست اور سماجیات نے عاشقانہ رنگ کی شاعری
جیسا چمکا دیا ہے۔ اسی سے ان کی قادر الکلامی ثابت
ہے۔ ذوق کا رنگ ابتدائی غزلوں تک محدود ہے

جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا
بلبل گُلِ تصویر کا شیدا نہیں ہوتا

اکبر الہ آبادی

ماہِ نو بھی نہیں چمکا ترے ابرو کی طرح
نکہتِ گل بھی نہ نکلی تری خوشبو کی طرح

کون سی تیغ ہے تیغِ خمِ ابرو کی طرح
کہ اشاروں ہی میں چل جاتی ہے جادو کی طرح

وہ ادا کی کہ قضا آ گئی خودداری کی!
وہ نظر کی کہ اثر کر گئی جادو کی طرح

گل میں وہ شوخیِ رنگِ رُخِ محبوب کہاں
سرو میں لوچ کہاں اُس قدِ دلجو کی طرح

حسن میں کب ہو قمر کو ترے مانند ثبات
کبھی عارض کی طرح ہے کبھی ابرو کی طرح

خالی از حسن نہیں آنکھ چرانا اُن کا!
فرحت افزائے نظر ہے رمِ آہو کی طرح

فرحت انگیز تو ہے ولولہ انگیز نہیں
نکہتِ گل بھی نہیں ہے تری خوشبو کی طرح

جامِ مے غیر کو دو، میں نہ کروں گا شکوہ
رنج کی بات ہے، پی جاؤں گا آنسو کی طرح

گلشنِ دہر میں اکبر کا کلام رنگیں!
کھِل گیا گل کی طرح، پھیل گیا بو کی طرح

اکبر الٰہ آبادی

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں ڈالا چوری تو نہیں کی ہے

ناتجربہ کاری سے واعظ کی یہ باتیں ہیں
اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے؟

اس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اس مے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

اے شوق وہی مے پی اے ہوش ذرا سو جا
مہمانِ نظر اس دم اک برقِ تجلّی ہے

واں دل میں کہ صدمے دو، یاں جی میں کہ سب سہہ لو
ان کا بھی عجب دل ہے میرا بھی عجب جی ہے

ہر ذرّہ چمکتا ہے انوارِ الٰہی سے
ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

سورج میں لگے دھبّا فطرت کے کرشمے ہیں
بت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارا نہیں ہوتا
آنکھ ان سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا

جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا
بلبل گلِ تصویر کا شیدا نہیں ہوتا

اللہ بچائے مرضِ عشق سے دل کو
سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا

تشبیہ ترے چہرے کو کیا دوں گلِ تر سے
ہوتا ہے شگفتہ مگر اتنا نہیں ہوتا

میں نزع میں ہوں، آئیں تو احسان ہے ان کا
لیکن یہ سمجھ لیں کہ تماشا نہیں ہوتا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اکبر الٰہ آبادی

○

آہ جو دل سے نکالی جائے گی!
کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی

یاد ان کی ہے بہت عزلت پسند
آہ بھی دل سے نکالی جائے گی!

نزع کہتی ہے کہ روٹھی تجھ سے جان
حشر کہتا ہے منالی جائے گی

اس نزاکت پر یہ شمشیر جفا
آپ سے کیونکر سنبھالی جائے گی

بے تکلف چاہیے سوز و گداز
شمع کیوں سانچے میں ڈھالی جائے گی

کیا غم دنیا کا ڈر مجھ رند کو
اور اک بوتل چڑھالی جائے گی

زندگی کی کَل ہے پیچیدہ تو خیر
سانس لے لے کر چلائی جائے گی

شیخ کی دعوت میں مے کا کام کیا
احتیاطاً کچھ منگالی جائے گی

یاد ابرو میں ہے اکبر محو کیوں
کب تری یہ کج خیالی جائے گی

○

چمن کی یہ کیسی ہوا ہو گئی
کہ صرصر سے بدتر صبا ہو گئی

عیادت کو آئے شفا ہو گئی
علالت ہماری دوا ہو گئی

وہ اُٹھے تو لاکھوں ہی فتنے اُٹھے
چلے تو قیامت بپا ہو گئی

محبت کی گرمی بھی کیا چیز ہے
طبیعت مری کیا سے کیا ہو گئی

لگاوٹ بہت ہے تری آنکھ میں
اسی سے تو یہ فتنہ زا ہو گئی

بتوں نے بھلایا جو دل سے مجھے
مرے ساتھ یادِ خدا ہو گئی

انھیں نے عطا کی تھی جانِ حزیں
ہوا خوب انہیں پر فدا ہو گئی

چکبست

فیض آباد کی سرزمین پر آنکھ کھولی۔ لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ وکالت کے ساتھ شاعری میں بھی ناموری پائی۔ پنڈت برج نارائن چکبست نے شاعری کے متعلق اپنا خیال اس طرح ظاہر کیا ہے: "میں پرانے رنگ کی شاعری اور غزل گوئی سے ناآشنا ہوں لیکن اس کے ساتھ میرا عقیدہ ہے کہ محض نئے خیالات کو توڑ مروڑ کر نظم کر دینا شاعری نہیں ہے۔ میرے خیال کے مطابق خیالات کی تازگی کے ساتھ زبان میں شاعرانہ لطافت اور الفاظ میں تاثیر کا جوہر ہونا ضروری ہے۔" اس بیان میں شاید "پرانے رنگ کی شاعری" سے مراد بناوٹ اور معاملہ بندی کی شاعری ہے۔ ان کی اپنی غزلوں میں عاشقانہ مضامین نسبتاً کم نظر آتے ہیں۔

سدھاری منزلِ ہستی سے کس بے اعتنائی سے
تنِ خاکی کو شاید روح نے گردِ سفر جانا

چکبست

بہار آئی ترقی پر ہے سودا دم بہ دم میرا
بڑھا جاتا ہے خود زنجیر کی جانب قدم میرا

لکھا یہ داورِ محشر نے میری فردِ عصیاں پر
یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا

کشاکش ہے امید و یاس کی یہ زندگی کیا ہے
الٰہی ایسی ہستی سے تو اچھا تھا عدم میرا

کھڑی تھیں راستہ روکے ہوئے لاکھوں تمنائیں
شہیدِ یاس ہوں نکلا ہے کس مشکل سے دم میرا

رہی ہے ایک ترکِ آرزو کی آرزو باقی
اسی پر ختم ہے افسانۂ درد و الم میرا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اتر جانا

بہت سودا رہا واعظ تجھے نازِ جہنم کا !
مزا سوزِ محبت کا بھی کچھ اے بے خبر جانا

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

بہارِ گل میں دیوانوں کا صحرا میں پرا ہوتا !
جدھر اٹھتی نظر کوسوں تلک جنگل ہرا ہوتا

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا !
نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

ہزاروں جان دیتے ہیں بتوں کی بیوفائی پر
اگر ان میں سے کوئی باوفا ہوتا تو کیا ہوتا

یہ مانا بے حجابانہ نگاہیں قہر کرتی ہیں
مگر حسنِ حیا پرور کا عالم دوسرا ہوتا

خدا کو بھول کر انساں کے دل کا یہ عالم ہے
یہ آئینہ اگر صورت نما ہوتا تو کیا ہوتا

اگر دم بھر میں مٹ جاتی خلش خارِ تمنا کی
دلِ حسرت طلب کو اپنی ہستی سے گلا ہوتا !

زباں کے زور پہ ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل
وطن میں ایک دل ہوتا مگر درد آشنا ہوتا

برج نرائن چکبست

دردِ دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایمان ہونا — آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

ہم کو منظور ہے اے دیدۂ وحدت آگیں — ایک غنچہ میں تماشائے گلستاں ہونا

جس طرح خم کسی جام کا ٹکڑہ نکلے — یونہی گردوں سے مہِ نو کا نمایاں ہونا

سر میں سودا نہ رہا پاؤں میں بیڑی نہ رہی — میری تقدیر میں تھا بے سر و ساماں ہونا

صفحۂ دہر میں مُہرِ یدِ قدرت سمجھو — پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا

ہو بیاضِ سحرِ نور پہ دل کیا مائل ! — یاد ہے دفترِ انجم کا پریشاں ہونا

کل بھی وہ کل ہے جو ہے فردائے قیامت زاہد — اور پھر اس کے لئے آج پریشاں ہونا

پاؤں زنجیر کے مشتاق ہیں اے جوشِ جنوں — ہے مگر شرط ترا سلسلہ جنباں ہونا

گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک — ہے اسے طرۂ دستارِ غریباں ہونا

ہے مرا ضبطِ جنوں جوشِ جنوں سے بڑھکر

ننگ ہے میرے لئے چاکِ گریباں ہونا

شاد عظیم آبادی

سید علی محمد شاد پٹنہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔
نے عربی، فارسی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ فن شاعری
میں خود اپنی محنت اور توجہ سے مہارت پائی۔ کسی
کے آگے زانوئے ادب تہہ نہ کیا۔ خوبصورت ...
بندشوں اور صناعی سے پورا کلام مزین ہے

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں، مینا اُسی کا ہے

شاد عظیم آبادی

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

اے درد! بتا کچھ تو ہی بتا، اب تک یہ معمہ حل نہ ہوا
ہم میں ہے دلِ بیتاب نہاں، یا آپ دلِ بے تاب ہیں ہم!

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے، آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ قدر کرو، نایاب نہ ہوں کمیاب ہیں ہم

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آ جاؤ جو تم کو آنا ہے، ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

○

ترچھی کلاہیں، تنگ قبائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
ایک ستم اور لاکھ ادائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

ہجر میں اپنا اور ہی عالم، ابرِ بہاراں دیدۂ پُرنم
ضد کہ ہمیں وہ آپ بلائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

اپنی ادا سے آپ ٹھٹکنا، اپنی ہوا سے آپ جھجکنا!
چال میں لغزش، منہ پہ حیائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

ہاتھ میں آڑی تیغ پکڑنا تاکہ لگے بھی زخم تو اوچھا
قصد کہ پھر جی بھر کے ستائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

رات کو اُٹھ اُٹھ کر رونا، ناک رگڑنی، سجدوں پہ سجدے
جو نہیں جائز اُس کی دعائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے!

کالی گھٹائیں، باغ میں جھولے، دھانی دوپٹے، لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

شاد نہ وہ دیدار پرستی اور نہ وہ بے نشہ کی مستی
تجھ کو کہاں سے ڈھونڈھ کے لائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

شاد عظیم آبادی

○

دل تو بدنام ہے اک عمر سے کیا اس کا گلہ کہتے آتی ہے حیا
یہ تمنا، یہ امیدیں، جنھیں برسوں پالا، کب مری ہوں گی بھلا
وہ تری کج روشی ہیچ کلہی، کینہ وری، دلبری، عشوہ گری
کون غش کھا کے گرا، کون بچا، کون مُوا، پھر کے دیکھا نہ ذرا
ہاں مارا تری آنکھوں نے، جو کی پھر کے نگاہ، نہ بچی دل کو پناہ
یار! کیا قہر ہے چلتا ہُوا جادو ترا، لاکھ روکا، نہ رُکا
رُت پھری ساری ہری ڈالوں میں پھوٹی کونپل ہوگئے پھول بھی پھل
اک یہ اُجڑا ہوا دل ہے کہ نہ پھولا نہ پھلا، اور سو کھا ہی کیا
کالی کالی وہ گھٹائیں، وہ پپیہوں کی پکار، دھیمی دھیمی وہ پھوار
اب کے ساون بھی ہمارا یوں ہی رونے میں کٹا، کیا نہیں جی کے سوا
بوسہ لینے کا مری خاک کو بھی ہے ارماں، تاب اُٹھنے کی کہاں؟
جامہ زیبی کا بھلا اے صنم تنگ قبا، کچھ تو دامن کو جھکا!
فتنہ خو، آفت جاں، سنگ دل آشوب جہاں، دشمن امن و اماں
سر و کج کلہاں خسرو اقلیم جفا، بانیِ مکر و دغا
رس بھری ہائے وہ آنکھیں تری کالی کالی بے پیے متوالی
سانولا رنگ نمک ریز جراحات جفا، اُف کہاں دھیان گیا
دیکھنا تیز انکھیوں سے ہے آڑی برچھی، یار اس کی نہ سہی
کب کو گنتی میں ہے وہ گھاؤ جو اوچھا سا لگا، پھر کے پھر دیکھ ذرا
آنکھیں روئی ہوئی، آواز سے بھرائی ہوئی، باتیں گھبرائی ہوئی
اس سے تو اور کسی بھید کا ملتا ہے پتہ، شاد قسمیں تو نہ کھا

شاد عظیم آبادی

○

کچھ کہے جاتا تھا غرق اپنے ہی افسانے میں تھا
مرتے مرتے ہوش باقی تیرے دیوانے میں تھا

مسکرا کر جھانکتی تھی کس ادا سے اک پری
چہرۂ ساقی کا شاید عکس پیمانے میں تھا

ہائے وہ خود رفتگی الجھے ہوئے سب سر کے بال
وہ کسی میں اب کہاں جو تیرے دیوانے میں تھا

دیکھتا تھا جس طرف اپنا ہی جلوہ تھا عیاں
میں نہ تھا وحشی کوئی اس آئینہ خانے میں تھا

بو رہا تھا، کچھ شبینہ سے تھی یا ٹوٹے سبو
اور کیا اس کے سوا مستوں کے ویرانے میں تھا

ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے سب کے اختیار
اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا

شاد کچھ پوچھو نہ مجھ سے میرے دل کے داغ کو
ٹمٹماتا سا چراغ اک اپنے ویرانے میں تھا

○

کہاں یہ تاب کہ چکھ چکھ کے، یا گرا کے پیوں
ملے بھرا ہوا ساغر تو ڈگڈگا کے پیوں

ہزار تلخ ہے، پیر مغاں نے جب دی ہے
خدا نکردہ جو میں منہ بنا بنا کے پیوں

مزہ ہے بادہ کشی کا دہیں تو اے ساقی
پیوں جو اب، تو ترے آستاں پہ آ کے پیوں

میں وہ نہیں کہ خود اپنے قدح کی خیر مناؤں
پیوں تو بزم میں دس پانچ کو پلا کے پیوں

زمیں پہ جام کو رکھ دے، ذرا ٹھہر ساقی
میں اس پہ ہو لوں تصدق، تو پھر اٹھا کے پیوں

وہ میکدہ ہے نہ ساقی ہے، کچھ نہ پوچھو شاد
میں کس کے گھر میں پیوں، کس کے گھر سے لا کے پیوں

مرزا (رسوا)

عین زمانۂ غدر میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور
اتفاق دیکھیے کہ مرزا محمد ہادی رسوا نے تمام
عمر ایک بے چینی کے عالم میں بسر کی۔ ان کے والد
آغا محمد تقی، عربی، فارسی اور علم الحساب میں کافی
دستگاہ رکھتے تھے۔ بدقسمتی کہ ان کا انتقال
مرزا کے لڑکپن میں ہی ہو گیا۔ مگر باپ کی علم سے
وابستگی ایسی رچی بسی اور ذہن اس بلا کا تھا کہ اپنے
ذاتی مطالعہ سے کیمسٹری، فلسفہ، منطق، تاریخ اور
دوسرے علوم میں اعلیٰ درجہ کی دستگاہ حاصل
کر لی تھی ۱۹۰۳ء-۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے
بی اے کیا اور پھر امریکہ کی ایک یونیورسٹی سے
پرائیویٹ امتحان دیکر پی ایچ ڈی بھی ہو گئے۔ اگر
زمانۂ قدیم میں ہوتے تو حکمائے میں شمار ہوتا اور اگر طرز جدید
کے پیرو ہوتے اور کسی ایک مضمون میں سر کھپاتے تو
دنیا کے مشاہیر میں شمار ہوتے، مگر طبیعت کی وارفتگی نے
یکسوئی سے دور رکھا۔ شاعری بھی اسی افتاد طبع کا شکار
ہو گئی۔ ویسے غزلیں غالب کے رنگ میں ہیں اور اتنی کامیاب
پیروی غالب کی کسی اور نے نہیں کی۔

بڑے ہیں ہم مگر ایسے بڑے بھی کم ہوں گے
کسی زمانے کے اچھے تمہیں کریں گے یاد

اطوار ترے اہلِ زمیں سے نہیں ملتے
انداز کسی اور حسیں سے نہیں ملتے

اُن کی بھی بہر حال گزر جاتی ہیں راتیں
جو لوگ کسی زہرہ جبیں سے نہیں ملتے

تم مہر سہی، ماہ سہی، ہم سے ملو تو
کیا اہلِ فلک، اہلِ زمیں سے نہیں ملتے

اے حضرتِ دل اُن سے بنی ہے نہ بنے گی
کیوں آپ کسی اور حسین سے نہیں ملتے

مرزا کو بھی پروا نہیں والا منشوں کی
اچھا ہے جو اس خاک نشیں سے نہیں ملتے

ریاضؔ خیرآبادی

یہ واحد شاعر اس زمانے کے تھے جو اخبار نویسی سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ اپنی زندگی میں کئی اخبار اور رسالے شائع کیے۔ خیرآباد ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئے۔ پہلے اسیرؔ اور پھر امیرؔ مینائی کے شاگرد ہوئے۔ خیرآباد، گورکھپور اور لکھنؤ میں عمر کا زیادہ حصہ گذارا۔ اکثر غزلوں میں ان جگہوں کا ذکر ہے۔ ریاضؔ کے کلام میں داغؔ کی شوخی جرأت کا اندازِ عاشقانہ۔ امیرؔ مینائی کی رنگینی کے ساتھ اپنا مخصوص رندانہ بانکپن بھی ہے جس شخص سے انتہائی محبت کرتے اسے ان کے مضحکہ کا بھی نشانہ بننا پڑتا۔ شراب سے پرہیز تھا۔ طبیعت کی ابلتی ہوئی شوخی کے باعث تیز ذہانت انھیں طنز کی جانب گامزن ہونے پر مجبور کرتی ہے۔

بہت سے رند بھی دیکھے بہت سے زاہد بھی
انھیں تو پیر ہمیشہ انھیں جواں دیکھا

ریاض خیرآبادی

ہنگامِ نزع رونا یہاں بے کسی کا تھا
تم ہنس دیے یہ کون سا موقع ہنسی کا تھا

دل نے مجھے خراب کیا کوئے یار میں
دشمن پہ اعتبار مجھے دوستی کا تھا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنامِ مے فروش
ہم سُن کے پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

حسرت سے کوئی سوئے فلک دیکھتا تھا آج
لب پر گلہ کسی کا نہ شکوہ کسی کا تھا

اہلِ حرم بھی آکے ہوئے تھے شریکِ دور
کچھ اور رنگ آج مری مے کشی کا تھا

لوٹے مزے حیا کے، اٹھائے ادا کے لطف
پہروں سے مجھ کو آج تصور کسی کا تھا

زاہد تمام عمر فرشتہ بنا رہا
اُس نے کیا جو کام، وہ کام آدمی کا تھا

جس انجمن میں بیٹھ گیا رونق آگئی
کچھ آدمی ریاض عجب دل لگی کا تھا

گل مرقعے ہیں ترے چاک گریبانوں کے
شکل معشوقوں کی، انداز ہیں دیوانوں کے

کعبہ و دیر میں ہوتی ہے پرستش کس کی
مے پرستو یہ کوئی کام ہیں میخانوں کے

جام مے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

پرِ پروانہ بنے خود شررِ شمع کبھی
شررِ شمع بنے پر کبھی پروانوں کے

آج بت بیٹھے ہیں تقدیر کے مالک بنکر
اب جو لکھا ہو مقدر میں مسلمانوں کے

وسعتِ ذات میں گم وحدت و کثرت ہے ریاض
جو بیاباں ہیں وہ ذرے ہیں بیابانوں کے

فن اور شخصیت

ریاض

○

وارفتہ آج کیسی طبیعت چمن میں تھی
صحرا سے کچھ سوا مجھے وحشت چمن میں تھی

بے دورِ جام، باغ میں گزرا تمام وقت
کل ساتھ ساتھ گردشِ قسمت چمن میں تھی

اجڑا جب آشیاں، تو خزاں کیا، بہار کیا
تنکوں سے آشیاں کے محبت چمن میں تھی

صیاد گھر ترا مجھے جنّت سہی، مگر
جنت سے بھی سوا مجھے راحت چمن میں تھی

صحرا کی دیکھ بھال بھی کچھ تھی مرے سپرد
تنکے چنوں چمن کے یہ خدمت چمن میں تھی

اللہ! اس طرح کی جنوں آفریں بہار
جوشِ بہار تھا کہ قیامت چمن میں تھی

سامان سب تھے، آج خدا نے بچا لیا
توبہ کے بعد کچھ مری نیّت چمن میں تھی

کل ہم گئے تھے، آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے
بے شمع و گل ریاض کی تربت چمن میں تھی

○

پی لی ہم نے شراب پی لی
تھی آگ مثالِ آب پی لی

اچھی پی لی خراب پی لی
جیسی پائی شراب پی لی

عادت سی ہے نشہ ہو نہ کیف
پانی نہ پیا، شراب پی لی

چھوڑے کئی دن گزر گئے تھے
آئی شبِ ماہتاب پی لی

منہ چوم لے کوئی اس ادا سے
سرکا کے ذرا نقاب پی لی

منظور تھی شستگی زباں کی
تھوڑی سی شرابِ ناب پی لی

ریاض

○

او کہ سنے والے اب دعا دے
اتنا کہہ دے خدا شفا دے

قطرہ، خم بادہ کا مزا دے
شبنم مری پیاس بجھا دے

درماں کی طرح تڑپ مزا دے
یارب مجھے دردِ لادوا دے

صیاد نہ باغ کی ہوا دے
وہ دور سے آشیاں دکھا دے

سب میکدے ہیں اس سے خالی
دل کو مرے بےخودی ندا دے

یہ دولتِ حسن و دولتِ عشق
بس کی نہیں، جسے خدا دے

گائیں وہ اے ریاض! شرمائیں
تو رو کے یہی غزل سنا دے

○

جی اُٹھے حشر میں پھر جی سے گذرنے والے
یاں بھی پیدا ہوئے پھر آپ پہ مرنے والے

ہے اداسی شب ماتم کی سہانی کیسی
چھاؤں میں تاروں کی نکلے ہیں سنورنے والے

ہم تو سمجھے تھے کہ دشمن پہ اٹھایا خنجر
تم نے جانا کہ ہمیں تم پہ ہیں مرنے والے

عمر کیا ہے۔ ابھی کم سِن ہیں، نہ تنہا لیٹیں
سو رہیں پاس مرے خواب میں ڈرنے والے

نزع میں حشر کے وعدے سے یہ تسکین بخشی
چین سے سو رہے منہ ڈھانپ کے مرنے والے

صبر کی میرے، مجھے داد ذرا دے دیتا
او مرے حشر کے دن فیصلہ کرنے والے

کیا مزہ دیتی ہے بجلی کی چمک مجھ کو ریاض
مجھ سے لپٹے ہیں مرے نام سے ڈرنے والے

مضطر خیرآبادی

مضطر خیرآبادی ۱۸۶۵ء میں خیرآباد (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ محترمہ بی بی سعید النساء اردو زبان میں شعر کہتی تھیں اور اپنے وقت کی اہم شاعرہ تھیں۔ مضطر نے شروع شروع میں اپنی ماں سے اصلاح لی۔ اس کے بعد امیر مینائی کی شاگردی قبول کی۔ امیر کے سب سے ممتاز شاگرد ہوتے ہوئے انہوں نے داغ کے رنگ کی پیروی کی۔ اور ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ حضرت داغ نے ایک مشاعرے میں مضطر صاحب کی غزل سامعین کو سنادی۔ انھیں اصل میں مضطر صاحب کی وہ غزل یاد تھی اور اس غزل کا رنگ خود ان کے رنگ سے ملتا جلتا تھا۔

مضطر صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی کا پیشتر حصہ ٹونک میں گزارا۔ وہ یہاں سشن جج تھے اور اسی حیثیت سے وہ گوالیار آئے۔ ان کے کئی شاگرد تھے۔ قادر الکلامی کا یہ عالم تھا کہ ایک مقدمے کا فیصلہ انھوں نے عدالت کے سامنے منظوم کر کے سنایا تھا۔ ان کے کئی اشعار ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں۔ حیرت ہے کہ اتنے بڑے شاعر کا کلام ابھی تک کلیات کی شکل میں نہیں چھپا۔ ان کے صاحبزادے جاں نثار اختر نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے والد صاحب کے کلام کو کلیات کی شکل میں مرتب کیا تھا۔ مضطر صاحب کا انتقال ۱۹۲۷ء میں گوالیار میں ہوا اور وہاں کے شاہی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

زلف کھولے ہوئے پھرتے ہیں قیامت دیکھو
اور کسی سے نہیں کہتے کہ بلا سے بچنا

فن اور شخصیت

مضطر خیر آبادی

○

علاج دردِ دل تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا
تم اچھا کر نہیں سکتے میں اچھا ہو نہیں سکتا

تمہیں چاہوں، تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں
مرا دل پھیر دو مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

ابھی مرتے ہیں ہم، جینے کا طعنہ پھر نہ دینا تم
یہ طعنہ اُن کو دینا جن سے ایسا ہو نہیں سکتا

دمِ آخر مری بالیں پہ مجمع ہے حسینوں کا
فرشتہ موت کا پھر آئے، پردا ہو نہیں سکتا

○

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مُشتِ غبار ہوں

میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا، مجھے کوئی سُن کے کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا، میں بڑے دُکھی کی پکار ہوں

مرا رنگ روپ بگڑ گیا، مرا بخت مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اُسی کی فصلِ بہار ہوں

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی شمع لا کے جلائے کیوں، کہ میں بیکسی کا مزار ہوں

نہ میں مضطر اُن کا حبیب ہوں نہ میں مضطر اُن کا رقیب ہوں
جو پلٹ گیا وہ نصیب ہوں جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں!

ضطر خیرآبادی

○

دمِ خواب راحت بلایا انہوں نے تو دردِ نہاں کی کہانی کہوں گا
مرا حال سمجھنے کے قابل نہیں ہے اگر لگ گئے تو زبانی کہوں گا

لب جوئے الفت رمائی ہے دھونی یہاں قصۂ سخت جانی کہوں گا
ادھر آ ادھر سوئے شیریں ادھر آ، ترے کوہ کن کی کہانی کہوں گا

خضر! تیرے چشمہ کا پانی ہے اچھا، مگر میں اسے موجِ فانی کہوں گا
محبت کا مارا ہوا دل جلا دے، میں تب تیرے پانی کو پانی کہوں گا

تری ذات واحد ہے بیدارِ مطلق، تجھے تو کبھی نیند آتی نہیں ہے
تری آنکھ لگنے کی حسرت میں یا رب! کہاں تک میں قصے کہانی کہوں گا

وہ اک آئینہ جس میں منہ دیکھتے ہیں، کسی ایک کا وقفِ صورت نہیں ہے
یہیں سے نتیجہ اٹھا کر دوئی کا میں وحدت کو کثرت کا بانی کہوں گا

یہ ہستی کا شیشہ جو تو نے دیا ہے ذرا اس پہ چاہت کی صیقل تو کر لوں
یہ ہو جائے پھر اپنی ہستی کو میں بھی، تری ذات کا نقشِ ثانی کہوں گا

ازل ہی میں تجھ پر نظر پڑ چکی ہے، نہ کر مجھ سے انکارِ جلوہ نمائی
تجلی تری گو نئی روشنی ہے، مگر میں تو اس کو پرانی کہوں گا

محبت میں انکارِ جلوہ نمائی، ذرا اس طریقے کو تو یاد رکھنا!
اگر میں کبھی تیرے درجے پہ پہنچا، تو میں بھی یونہی لن ترانی کہوں گا

میں کیا بے وفا ہوں، جو محشر میں مضطر خدا سے کروں شکوۂ قتل اپنا
زمانا کہے خونِ ناحق بہایا، اگر مجھ سے پوچھا تو پانی کہوں گا

مضطر خیرآبادی

○

غرورِ الفت کی طرزِ نازش عجب کرشمے دکھا رہی ہے
ہماری رہ تکتی ہوئی نظر کو تری تجلّی منا رہی ہے

وہ طور والی تری تجلّی، غضب کی گرمی دکھا رہی ہے
وہاں تو پتھر جلا دیئے تھے یہاں کلیجہ جلا رہی ہے

مرے نشیمن میں شانِ قدرت کے سارے اسباب ہیں مہیّا
ہوا صفائی پہ ہے مقرر، چراغ بجلی جلا رہی ہے

نہ اس کے دامن سے میں ہی اُلجھا، نہ میرے دامن سے یہ ہی اٹکی!
ہوا سے میرا بگاڑ کیا ہے جو شمعِ تربت بجھا رہی ہے

فرشتے آئے اگر لحد میں تو صاف کہہ دوں گا راستہ لو
جب اس کی چاہت میں جان دیدی تو بات کہنے کو کیا رہی ہے

جمالِ قدرت مجھی کو دے دے کہ میں کلیجے کی چوٹ سیکوں
کلیم کے گھر میں رکھے رکھے وہ آگ اب کیا بنا رہی ہے

جلیل مانک پوری

جلیل حسن ۔ جلیل القدر فصاحت جنگ کا لقب پانے والے ۱۸۶۹ء میں مانکپور (اودھ) میں پیدا ہوئے ۔ ۱۹۴۶ء میں حیدرآباد دکن میں انتقال کیا۔ امیر مینائی کے شاگرد تھے اور میر محبوب علی خاں اور میر عثمان علی خاں ان کے شاگرد تھے۔ کلام میں استاد کا رنگ جھلکتا ہے۔

اگر میں ہوش میں آتا تو یہ طلسم جہاں
مری نگاہ میں بھولا سا خواب ہو جاتا

غزل نمبر

فن اور شخصیت

جلیل مانک پوری

○

کھو کے دل میرا انہیں ناحق پشیمانی ہوئی
تم سے نادانی ہوئی، یا مجھ سے نادانی ہوئی؟

اللہ اللہ پھوٹ نکلا رنگ چاہت کا مری
زہر کھایا میں نے پوشاک آپ کی دھانی ہوئی

ہم کو ہو سکتا نہیں دھوکا ہجوم حشر میں !
تیری صورت ہے ازل سے جانی پہچانی ہوئی

اے صبا! میں اور کیا دوں قبر مجنوں کے لئے
خاک تھوڑی سی چڑھا دینا مری چھانی ہوئی

یار کے ہاتھوں ہوا جو کچھ ہوا اے تیغ ناز !
تیری عریانی ہوئی یا میری قربانی ہوئی

کر گئی دیوانگی ہم کو بری ہر جرم سے
چاک دامانی سے اپنی چاک دامانی ہوئی

باڑھ دی بانکی اداؤں نے جو خنجر کو جلیل
ذبح کرنے میں مرے قاتل کو آسانی ہوئی

○

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے
فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو، زمین چلے، آسماں چلے

آنکھوں میں کون آ کے الٰہی نکل گیا
کس کی تلاش میں مرے اشک رواں چلے

اٹھتا ہوں میں جو دشت سے جانے کو اے جنوں
کہتے ہیں خار تھام کے دامن، کہاں چلے

حفیظ جونپوری

ان کے بارے میں کچھ بھی نہ معلوم ہوسکا سوائے اس کے کہ امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ اس طرح شاید صرف یہی ایک شعر ہی آج تک لوگوں کے ذہن و زبان پر رہ گیا ہے اور اس کے علاوہ کچھ یاد نہیں اور نہ ہی دیگر کلام کا کہیں چرچا ہے۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

فن اور شخصیت

حفیظ جونپوری

○

دل اس لئے ہے دوست کہ دل میں ہے جائے دوست
جب یہ نہ ہو بغل میں، ہے دشمن بجائے دوست

مٹنے کی آرزو ہے اسی رہگزار میں!
اتنے مٹے کہ لوگ کہیں خاک پائے دوست

تقریر کا ہے خاص ادا سے بیاں میں لطف
سننے مری زبان سے کچھ ماجرائے دوست

سب کچھ ہے اور کچھ نہیں عالم کی کائنات
دنیا برائے دوست ہے، عقبیٰ برائے دوست

○

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

نہیں مرتے ہیں، تو ایذا نہیں جھیلی جاتی
اور مرتے ہیں تو پیماں شکنی ہوتی ہے

لٹ گیا وہ ترے کوچے میں رکھا جس نے قدم
اس طرح کی بھی کہیں راہ زنی ہوتی ہے

مے کشوں کو نہ کبھی فکر کم و بیش ہوئی
ایسے لوگوں کی طبیعت بھی غنی ہوتی ہے

پی لو دو گھونٹ کہ ساقی کی رہے بات حفیظ
صاف انکار میں خاطر شکنی ہوتی ہے

نوح ناروی

ہندوستان کے غزل گو شعراء میں نہایت مشہور شاعر ہیں۔ داغ کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ خود چار سو شاعروں کے استاد ہیں۔ کلام میں سلاست اور روانی ملتی ہے۔ ساری عمر حسن و عشق اور ہجر و وصال کے جھگڑوں میں گزار دی۔ سوائے اس کے کچھ اور کام نہ کیا۔ "سفینۂ نوح" "طوفان نوح" اور "اعجاز نوح" ان کے کلام کے ضخیم مجموعے ہیں۔

عرصہ دراز تک ماہوار رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور کے سرپرست رہے پھر دہلی سے ایک رسالہ انھیں کی سرپرستی میں بہت دن تک نکلتا رہا۔ ۱۸ ستمبر ۱۸۷۹ء کو بھوانی پور (ضلع رائے بریلی) میں پیدا ہوئے۔ وطن نارہ (ضلع الٰہ آباد) ہے۔ ان کی شاعری پر بہت لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور چند ایک کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ان کا انتقال ۱۹۶۲ء میں ہوا۔

تمہارے وصل کی ساعت ہمیشہ ٹلتی رہتی ہے
خدا جانے کہاں ہوگا، کسے معلوم کب ہوگا

نوح ناروی

آپ جن کے قریب ہوتے ہیں
وہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں

جب طبیعت کسی پہ آتی ہے
موت کے دن قریب ہوتے ہیں

مجھ سے ملنا، پھر آپ کا ملنا
آپ کس کو نصیب ہوتے ہیں

ظلم سہہ کر، جو اُف نہیں کرتے
اُن کے دل بھی عجیب ہوتے ہیں

عشق میں اور کچھ نہیں ملتا!
سیکڑوں غم نصیب ہوتے ہیں

نوح کی قدر کوئی کیا جانے
کہیں ایسے ادیب ہوتے ہیں

صفی لکھنوی

سید علی نقی زیدی نام۔ صفی تخلص اور لسان القوم لقب۔ ۲ جنوری ۱۸۶۲ء کو بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے اور محکمۂ دیوانی کی چالیس سال ملازمت کے بعد ۱۹۱۳ء میں پنشن پائی۔ ۱۹۵۰ء میں انتقال کیا۔ شاعری میں اگرچہ کسی کے شاگرد نہیں مگر ان کا شمار لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں ہوتا ہے۔ تمام اصنافِ سخن پر عبور رکھتے تھے۔ ان کے اشعار میں بہت زیادہ دلچسپی اور ان کے کلام میں بڑی شگفتگی پائی جاتی ہے۔ صفی کی مشہور مثنوی تنظیم الحیات ہے جس پر ہندستانی اکیڈمی الہ آباد نے پانچ سو روپیہ انعام دیا۔ یہ اکانومی آف ہیومن لائف کا ترجمہ ہے۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ [illegible] عرصہ ہوا شائع ہوا تھا۔ بعد میں بھی ایک دوسرا مکمل مجموعہ ترتیب نامور ادیبوں کی کوشش سے چھپا۔

جانا جانا جلدی کیا ہے، ان باتوں کو جانے دو
ٹھہرو ٹھہرو، دل تو ٹھہرے مجھ کو ہوش میں آنے دو

صفی لکھنوی

○

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

قفس لے اڑوں میں، ہوا اب جو سنکے
مدد اتنی اے بالِ پرواز دینا

نہ خاموش رہنا مرے ہم صفیرو
جب آواز دوں تم بھی آواز دینا

کوئی سیکھ لے دل کی بے تابیوں کو
ہر انجام میں رنگِ آغاز دینا

دلیل گراں باریٔ سنگِ غم سے
صفیؔ ٹوٹ کر دل کا آواز دینا

○

مری نظر سے نظر، دل سے دل ملائے جا
ترے نثار، یئے جا، یونہیں پلائے جا

اسی طرح ابھی اے انقلاب آئے جا
رہے سہے جو نشاں ہیں اُنہیں مٹائے جا

جفائے حسن سے نالاں نیازمندیٔ عشق
وفا کا دل سے تقاضا کہ ناز اٹھائے جا

لبوں پہ موجِ تبسم، نگاہ قہر آلود
دلِ حزیں پہ یونہیں بجلیاں گرائے جا

دلوں پہ نقشِ محبت بٹھا تو ہے اک بات
لبوں پہ مہر لگائی تو کیا، لگائے جا

ابھی ہے تجھ سے بہت دور منزلِ مقصود
ٹھہر کے دیتی ہے غیرت، قدم بڑھائے جا

شکستِ دل کی صدائیں صفیؔ تلخ نوا
زمانہ گوش بر آواز ہے سنائے جا

عزیزؔ لکھنوی

نام مرزا محمد ہادی۔ محمد علی کے لڑکے۔ وطن لکھنؤ اور تخلص عــزیز۔ ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوئے۔ معقول و منقول فقہ و اصول۔ صرف و نحو۔ ادبیات و درسیات کی تعلیم لکھنؤ کے مشہور علماء و فضلاء سے پائی۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ غزل اور قصیدہ ان کے خاص مضمون ہیں جن میں آپ نے خوب طبع کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ صفی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ "گل کدہ" "صحیفۂ ولا" ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن
بھولتا ہی نہیں عــالم تری انگڑائی کا

عزیز لکھنوی

جلوہ دکھلائے جو وہ اپنی خود آرائی کا
نور جل جائے ابھی چشمِ تماشائی کا!

رنگ ہر پھول میں ہے حسنِ خود آرائی کا
چمنِ دہر ہے محضر تری یکتائی کا

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

دیکھکر نظمِ دو عالم ہمیں کہنا ہی پڑا
یہ سلیقہ ہے کسی انجمن آرائی کا!

گل جو گلزار میں ہیں گوشِ برآواز عزیز
مجھ سے بلبل نے لیا طرزِ یہ شیوائی کا

ثاقب لکھنوی

مرزا ذاکر حسین نام ثاقب تخلص۔ ۲ جنوری ۱۸۶۹ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آغا محمد عسکری قزلباش بعد میں آگرہ کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ چلے آئے۔ ان کی تعلیم و تربیت لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ہر وقت فکرِ سخن میں غلطاں رہنے لگے جس کی وجہ سے زندگی کے راستے میں اکثر ٹھوکریں کھائیں اور تکلیف اٹھائی۔ حصولِ معاش کے لئے کچھ تجارت کا سلسلہ شروع کیا جس میں گھر کی ساری جمع پونجی گنوائی۔ پھر ۱۹۰۶ء میں سفارت خانہ ایران میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۰۸ء میں مہاراجہ محمود آباد سے تعلق ہو گیا اور میر منشی کا عہدہ ملا۔ تقسیم ملک کے وقت یہ ملازمت بھی ختم ہوئی اور گھر بیٹھ گئے۔ کلام میں زور، بلند پروازی، خودداری اور فلسفیانہ رنگ۔ ذاتی لحاظ سے بہت خوش مزاج، با اخلاق، صاحب مروت اور خاکسار طبیعت انسان تھے۔ ۱۹۴۹ء میں وفات پائی۔

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

○

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

کس نظر سے آپ نے دیکھا دلِ مجروح کو
زخم جو کچھ بھر چلے تھے پھر ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

سینۂ سوزاں میں ثاقب گھٹ رہا ہے وہ دھواں
اُف کروں تو آگ دنیا کی ہوا دینے لگے

○

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

تلوک چند محروم

محروم ۱۸۸۷ء میں عیسیٰ خیل ضلع میانوالی (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام بھگت رام دیال تھا۔ ابتدائی تعلیم میانوالی میں ہی حاصل کی۔ پھر ۱۹۰۸ء میں ٹریننگ کالج (لاہور) سے جے۔ اے۔ وی کا امتحان پاس کیا۔ اور عیسیٰ خیل سے گریجویٹ کا امتحان پاس کیا۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی اور عیسیٰ خیل ہی میں ہیڈ مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد بہت سی جگہوں پر محکمۂ درس و تدریس سے ہی منسلک رہے۔

سبھی اصنافِ سخن پر عبور تھا لیکن نظم ان کا خاص میدان رہی۔ سب سے پہلا مجموعہ گنج معانی ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کاروانِ وطن، نیرنگ معانی اور شعلۂ نوا کے نام سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی رباعیوں کا مجموعہ رباعیات محروم کے نام سے شائع ہوا۔ آپ کے صاحبزادے جگن ناتھ آزاد صاحب نے آپکی شاعری اور شخصیت پر ایک کتاب مرتب کرکے شائع کی۔

مرے اشعار پر محروم یوں کہتے ہیں صاحب دل
یہ دلی کی نہیں، دل کی زباں معلوم ہوتی ہے

تلوک چند محروم

○

دل آزردۂ شائستۂ دردِ نہاں پیدا کریں
عزمِ جانکاہ سے آرامِ جاں پیدا کریں

نغمۂ درد میں اثرِ جاوداں پیدا کریں
نالۂ ناقوس سے بانگِ اذاں پیدا کریں

ایک ہم ہیں اپنے گلشن کو بھی صحرا کر چلے
ایک وہ تھے دشت سے جو گلستاں پیدا کریں

○

وہ وعدہ استوار کبھی ہے کبھی نہیں
ہم کو بھی اعتبار کبھی ہے کبھی نہیں

ہم رہروِ قدیم ہیں، اور جانتے ہیں خوب
ہموار رہگزار کبھی ہے کبھی نہیں

ہو دوست سے توقعِ لطفِ دوام کیا
جب دل پہ اختیار کبھی ہے کبھی نہیں

ظالم تمام عمر رہا دل کے آس پاس
اک غم جو خوشگوار کبھی ہے کبھی نہیں

محروم طبعِ شاعرِ فطرت نگر، رواں
مانندِ جوئبار کبھی ہے کبھی نہیں

جوشؔ ملسیانی

۱۸۸۳ء میں ملسیان تحصیل نکودر میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے، لکھے پڑھے۔ داغؔ کے خاص شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ خود ان کے بھی دو سو سے زائد شاگرد ہیں۔ ان کے شعری مجموعے "فردوسِ گوش" "جنونِ جوش" "بادۂ سرجوش" شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ شاعری کے علاوہ نثر میں بھی انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ دیوانِ غالب اور آئینۂ اصلاح شائع ہو چکی ہیں۔ "دستور القواعد" کے نام سے فارسی میں بھی انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے۔

داد دیتے ہیں جنھیں اہلِ حرم بھی اے جوشؔ
مورتیں ایسی ہیں صدہا مرے بُت خانے میں

جوشؔ ملسیانی

میں غیر وفادار کبھی ہو نہیں سکتا
اس سے تمہیں انکار کبھی ہو نہیں سکتا

اعمال کی پرسش نہ کرائے داورِ محشر
مجبور تو مختار کبھی ہو نہیں سکتا

ممکن ہے فرشتوں سے کوئی سہو ہوا ہو
میں اتنا گنہ گار کبھی ہو نہیں سکتا

اک میں کہ ترے جور سے فریاد بہ لب ہوں
اک تو کہ خطا وار کبھی ہو نہیں سکتا

آزارِ محبت ہی وہ آزار ہے اے جوشؔ
جو باعثِ آزار کبھی ہو نہیں سکتا

اثر لکھنوی

لکھنؤ کی ٹکسالی زبان اپنے آپ میں ایک ایسی کشش رکھتی ہے کہ زبان کا ذرا بھی شعور رکھنے والا آدمی اس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ تاریخ ادب میں جہاں اس زبان کا ذکر آئے گا وہاں حضرت جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا ذکر بھی بطور خاص آئے گا۔

حضرت اثر کی پیدائش ۱۲ر جولائی ۱۸۸۵ء کو لکھنؤ میں ہوئی اور عہد طفلی میں ہی انھیں شعر و ادب کا ماحول مل گیا۔ کئی اہم عہدوں پر فائز رہتے ہوئے بھی انھوں نے مشق سخن کو جاری رکھا اور دنیائے ادب میں اپنا ایک مقام بنا لیا اور صف اول کے شعراء میں گنے جانے لگے

حضرت اثر کو غزل سے بڑا شغف رہا ہے۔ ان کے کلام میں میر کا اثر نمایاں ہوتے ہوئے بھی ایک الگ رنگ نظر آتا ہے۔

زندگی اور زندگی کی یادگار
پردہ اور پردے پر کچھ پرچھائیاں

اثر لکھنوی

دل کا ہے رونا، کھیل نہیں ہے، منہ کو کلیجا آنے دو
تھمتے تھمتے اشک تھمیں گے، ناصح کو سمجھانے دو

کہتے ہی کہتے حال کہیں گے، ایسی تمہیں جلدی کیا ہے
دل تو ٹھکانے ہونے دو، اور آپ میں ہم کو آنے دو

مجھکو تڑپتا چھوڑ نہ جائے ایسی کوئی تدبیر کرو
زخمیٔ تیغِ ناز و ادا سے ہاتھ نہ اس کو اٹھانے دو

بزم طرب میں دیکھ کے مجھکو پھیر لیں آنکھیں ساقی نے
میرے لئے تھے زہرِ ہلاہل، رس کے بھرے پیمانے دو

خود سے گریباں پھٹتے تھے اکثر، چاک ہوا میں اڑتے تھے
اب وہ جنوں کا جوش نہیں، آئی بہار تو آنے دو

یادِ دلِ گم گشتہ میں ہم ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے
ہنس کے ستمگر کہتا کیا ہے، بات ہی کیا ہے جانے دو

دل کو اثرؔ کے لوٹ لیا ہے، شوخ نگہ اک کافر نے
کوئی نہ اسکو رونے سے روکو، آگ لگی ہے بجھانے دو

نواں باب

حسرت موہانی	۱۸۵۷-۱۹۵۱
اصغر گونڈوی	۱۸۸۴-۱۹۳۶
فانی بدایونی	۱۸۷۹-۱۹۴۰
جگر مرادآبادی	۱۸۹۰-۱۹۴۱
مرزا یاس یگانہ	۱۸۸۴-۱۹۵۶
آرزو لکھنوی	۱۸۷۲-۱۹۵۱
جمیل مظہری	۱۹۰۵-؟
محمد علی جوہر	۱۸۷۸-۱۹۳۱
حامد سعید	۱۸۹۷-۱۹۶۰

حسرت موہانی

لکھنؤ کے قریب ضلع اناؤ میں ایک قصبہ ہے
موہان۔ وہیں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی۔
تسلیم کے شاگرد تھے اور مومن و نسیم دہلوی کے
شیدائی۔ سید فضل الحسن حسرت کے کلام میں
دہلی اور لکھنؤ دونوں طرز کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔
نازک خیالی اور دلکشی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بڑے
نامور سیاسی لیڈر بھی رہے۔ کانپور سے رسالہ
اردوئے معلیٰ نکالتے تھے اکثر قابل قدر تنقیدی
مضامین بھی لکھ کر اس رسالے میں شامل اشاعت
کرتے۔ انتہائی جفاکش، سچے اور فرشتہ خصلت
انسان تھے۔

وہ کیا قدر جانیں دل عاشقانہ کی
نہ عالم، نہ فاضل، نہ دانا نہ بینا

حسرت موہانی

تاثیر برق حسن جو اُن کے سخن میں تھی !
اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی !

اک رنگِ التفات بھی اُس بے رخی میں تھا
اک سادگی بھی اُس نگہِ سحر فن میں تھی

محتاج بوئے عطر نہ تھا جسم بوئے یار !
خوشبوئے دلبری تھی جو اُس پیرہن میں تھی

کچھ دل ہی بجھ گیا ہے مرا ورنہ آج کل
کیفیتِ بہار کی شدت چمن میں تھی

معلوم ہو گئی مرے دل کو زراہِ شوق !
وہ بات پیار کی جو ہنوز اُس دہن میں تھی

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی
جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی !

اچھا ہوا کہ خاطرِ حسرت سے مٹ گئی
ہیبت سی اِک جو خطرۂ دار و رسن میں تھی

حسرت موہانی

○

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

میرے عذرِ جرم پر مطلق نہ کیجے التفات
بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جائیے

راہ میں ملیے کبھی مجھ سے تو از راہِ ستم
ہونٹ اپنا کاٹ کر فوراً جدا ہو جائیے

میری تحریرِ ندامت کا نہ دیجے کچھ جواب
دیکھ لیجے اور تغافل آشنا ہو جائیے

ہاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا
آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُر جفا ہو جائیے

جی میں آتا ہے کہ اُس شوخِ تغافل کیش سے
اب نہ ملیے پھر کبھی، اور بے وفا ہو جائیے

ہائے رے بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر
اُس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہو جائیے

چاہتا ہے مجھ کو تو بھولے، نہ بھولوں میں تجھے
تیرے اس طرزِ تغافل پر فدا ہو جائیے

○

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلیٔ ہمرہاں سے ہم

بے تابیوں سے چھپ نہ سکا حالِ آرزو
آخر بچے نہ اُس نگہِ بدگماں سے ہم

ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق
پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

حسرت پھر اور جا کے کریں کس کی بندگی
اچھا، جو سر اُٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

حسرت

○

بھلاتا لاکھ ہوں۔ لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی! ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہم نشیں! کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی، تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں، تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

○

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو!
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عیش کی!
اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرت خام کاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

اصغرؔ گونڈوی

اصغرؔ حسین، گونڈہ کے رہنے والے تھے۔ اصغرؔ کے کلام کی رنگینی اور نازک خیالی بعض اوقات مومنؔ کی یاد تازہ کردیتی ہے اور یہ کوئی تعجب خیز بات اس لئے نہیں کہ وہ (امیر اللہ) تسلیمؔ کے شاگرد تھے۔ صوفی منش تھے، کلام میں بھی تصوف ہے لیکن اندازِ بیان نرالا ہے۔ حتیٰ کہ عاشقانہ اشعار میں بھی یہ خصوصیت برقرار ہے جو لوگ مل چکے تھے وہ زندگی بھر ان کی مسکراتی سنجیدگی کے رطب اللسان رہے۔

رودادِ چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

اصغر گونڈوی

○

وہ نغمہ بلبل رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے، چمن بیدار ہو جائے

سحر لائے گی کیا پیغام بیداری شبستاں میں
نقاب رخ الٹ دو، خود سحر بیدار ہو جائے

نظر اس حسن پر ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے
کبھی خود پھول بن جائے، کبھی رخسار ہو جائے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

○

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

ہم اس نگاہ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگ جاں بنا دیا

اس حسن کاروبار کو مستوں سے پوچھئے
جس کو فریب ہوش نے عصیاں بنا دیا

اصغر گونڈوی

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبارِ قیس خود اٹھتا ہے، خود برباد ہوتا ہے

قفس کیا، حلقہ ہائے دام کیا، رنجِ اسیری کیا
چمن پر مٹ گیا جو، ہر طرح آزاد ہوتا ہے

بہار انجام سمجھوں اس چمن کا، یا خزاں سمجھوں
زبانِ برگِ گل سے مجھ کو کیا ارشاد ہوتا ہے

سمائے جا رہے ہیں اب وہ جلوے دیدہ و دل میں
یہ نظارہ ہے یا ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

یہاں مستوں کے سر الزام ہستی ہی نہیں اصغر
پھر اس کے بعد ہر الزام بے بنیاد ہوتا ہے

اصغر گونڈوی

○

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

آئے تھے سبھی طرح کے جلوے مرے آگے
میں نے مگر اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا

اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پُر آشوب
فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا

ہر حال میں بس پیشِ نظر ہے وہی صورت
میں نے کبھی روئے شبِ ہجراں نہیں دیکھا

کچھ دعوئ تمکیں میں ہے معذور بھی زاہد
مستی میں تجھے چاکِ گریباں نہیں دیکھا

رودادِ چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں!
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں، یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا، تو گریباں نہیں دیکھا

شائستۂ صحبت کوئی ان میں نہیں اصغر
کافر نہیں دیکھے، کہ مسلماں نہیں دیکھا

○

ترے جلووں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی، نگاہِ بے زباں رکھ دی

مٹی جاتی تھی بلبل، جلوۂ گلہائے رنگیں پر!
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا؟ اے واعظِ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

قفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل، معاذ اللہ
کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخِ آشیاں رکھ دی

کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاید رقصِ بسمل میں
بہت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغِ خوں فشاں رکھ دی

الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

فانیؔ بدایونی

شوکت علی فانیؔ — بریلی اور علی گڑھ میں تعلیم پانے کے بعد لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے مگر یہ پیشہ ان کے لئے ساز گار نہ ثابت ہوا۔ حیدرآباد جا کر محکمۂ تعلیم میں ملازمت کرلی۔ مگر کامیابی وہاں بھی نہ ملی۔ ۱۹۴۰ء میں ناکام و نامراد اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کی شاعری بھی ان ہی حالات کی آئینہ دار ہے۔

دنیا کے رنج و راحت کچھ ہوں تری بلا سے
دنیا کی ہر ادا سے منہ پھیر کر گزر جا

فانیؔ بدایونی

مآلِ سوزِ غمہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

ابھی کیا ہے کسی دن خود، رلائے گی یہ خاموشی
زبانِ حال کی جادو بیانی دیکھتے جاؤ

غرورِ حسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

بہارِ زندگی کا لطف دیکھا اور دیکھو گے
کسی کا عیشِ مرگِ ناگہانی دیکھتے جاؤ

سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

وہ اُٹھا شورِ ماتم آخری دیدارِ میت پر
اب اُٹھا چاہتی ہے نعشِ فانیؔ دیکھتے جاؤ

دُنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

وحشت دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں، یہ تو ہوش پرستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دُنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اُجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے

فانیؔ جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

○

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچہ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں، دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا

فصل گل آئی یا اجل آئی، کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

کیجے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہیے!
اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدّت گزری چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے، کوئی تمنا ساتھ نہ تھی!
تھک تھک کر اس راہ میں آخر ایک ایک ساتھی چھوٹ گیا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

جگر مرادآبادی

علی سکندر نام اور جگر تخلص، تخلص کے ساتھ اپنے وطن کا نام بھی رکھتے تھے۔ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ شروع شروع میں اپنے والد نظر سے پھر تسلیم اور پھر داغ سے اصلاح لی۔ غزل گوئی میں خوب نام پیدا کیا۔ ان کے مجموعے "آتشِ گل" کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا تھا۔ "آتشِ گل" کے علاوہ "شعلۂ طور" اور "داغِ جگر" نامی ان کے مجموعے چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کے تمام ہی مجموعے زیادہ تعداد میں بکتے رہے ہیں۔ مشاعروں میں عزت سے بلائے جاتے تھے۔ ترنم غضب کا پایا تھا۔ مشاعرے لوٹ لیا کرتے تھے۔ مشاعروں میں انھیں جو مقام ملا کرتا تھا شاید ہی کسی اور کو ملا ہو۔ ان کا انتقال گونڈہ میں ۱۹۶۰ء میں ہوا۔

وہ یوں دل سے گذرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

جگر مرادآبادی

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی
وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی!

کوئی بڑھے نہ بڑھے ہم تو جان دیتے ہیں
پھر ایسی چشم توجہ کبھی ہوئی نہ ہوئی

تمام حرف و حکایت تمام دیدہ و دل
اس اہتمام پہ بھی شرحِ عاشقی نہ ہوئی

کسی کی مست نگاہی نے ہاتھ تھام لیا
شریکِ حال جہاں میری بیخودی نہ ہوئی

صبا یہ اُن سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

اِدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی اُن سے آہ بھی نہ ہوئی

خیالِ یار سلامت تجھے خدا رکھے
ترے بغیر کبھی گھر میں روشنی نہ ہوئی

گئے تھے ہم بھی جگر جلوہ گاہِ جاناں میں
وہ پوچھتے ہی رہے ہم سے بات ہی نہ ہوئی

محبت کارفرمائے دو عالم ہوتی جاتی ہے
کہ ہر دنیائے دل شائستۂ غم ہوتی جاتی ہے

ہر اک صورت ہر اک تصویر مبہم ہوتی جاتی ہے
الٰہی کیا مری دیوانگی کم ہوتی جاتی ہے

جہاں تک توڑتا جاتا ہوں رسمِ ظاہر و باطن
دلیلِ عاشقی اتنی ہی محکم ہوتی جاتی ہے

جہاں تک دل کا شیرازہ فراہم کرتا جاتا ہوں
یہ محفل اور برہم، اور برہم ہوتی جاتی ہے

نزاکت ہائے احساسِ محبت اے معاذ اللہ
کہ اب اک اک گھڑی ایک ایک عالم ہوتی جاتی ہے

غرورِ حسن رخصت، الفراق اے نازِ خودبینی
مزاجِ حسن سے اب تمکنت کم ہوتی جاتی ہے

یہی جی چاہتا ہے چھیڑتے ہی چھیڑتے رہیے
بہت دلکش ادائے حسنِ برہم ہوتی جاتی ہے

تصور رفتہ رفتہ اک سراپا بنتا جاتا ہے
وہ اک شے جو مجھی میں ہے مجسم ہوتی جاتی ہے

وہ رہ رہ کر گلے مل مل کے رخصت ہوتے جاتے ہیں
مری آنکھوں سے یارب روشنی کم ہوتی جاتی ہے

جگر مراد آبادی

جدھر سے میں گذرتا ہوں نگاہیں اٹھتی جاتی ہیں
مری ہستی بھی کیا تیرا ہی عالم ہوتی جاتی ہے

جگر تیرے سکوتِ غم نے یہ کیا کہہ دیا اُن سے
جھکی پڑتی ہیں نظریں، آنکھ پُرنم ہوتی جاتی ہے

○

دل گیا رونقِ حیات گئی — غم گیا ساری کائنات گئی
دن کا کیا ذکر تیرہ بختوں میں — ایک رات آئی، ایک رات گئی
اُن کے بہلائے بھی نہ بہلا دل — رائیگاں سعیِ التفات گئی
مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن — اک مسیحا نفس کی بات گئی
اب جنوں آپ ہے گریباں گیر — اب وہ رسمِ تکلفات گئی
ترکِ الفت بہت بجا ناصح — لیکن اُس تک اگر یہ بات گئی
نہیں ملتا مزاجِ دل ہم سے — غالباً دور تک یہ بات گئی

قیدِ ہستی سے کب نجات جگر
موت آئی اگر حیات گئی

مرزا یاسؔ یگانہ

عظیم آباد وطن تھا۔ شادؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے دوسرے پیشرو یا ہمعصر شعراء کی سی شہرت اگرچہ نہ پائی لیکن بھلا دئے جائیں ایسے شاعر بھی نہیں۔ واجد حسین یاسؔ یگانہ کی تصانیف میں "غالب شکن" "چراغِ سخن" — اور "آیاتِ وجدانی" وغیرہ شامل ہیں۔

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

مرزا یاس یگانہ

کارگاہِ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے
اک طرف اُجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے

کیمیائے دل کیا ہے، خاک ہے مگر کیسی
لیجئے تو مہنگی ہے بیچئے تو سستی ہے

حسن بے تماشا کی دھوم کیا معمّہ ہے
کان بھی ہیں نامحرم، آنکھ بھی ترستی ہے

خضرِ منزل اپنا ہوں اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا
فکر کی بلندی یا حوصلے کی پستی ہے

بے دلوں کی ہستی کیا، جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
خواب ہے نہ بیداری، ہوش ہے نہ مستی ہے

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر کے سادگی برستی ہے

ترکِ لذتِ دنیا کیجئے تو کس دل سے
ذوقِ پارسائی کیا، فیضِ تنگدستی ہے

دیدنی ہے یاس اپنے رنج و غم کی طغیانی
جھوم جھوم کر کیا کیا یہ گھٹا برستی ہے

میرزا یاس یگانہ

○

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

برا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گمراہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائیگا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

اسیرو! شوقِ آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے
مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا

دلِ بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں
وہ آنسو کیا پئے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

○

جب تک خلشِ دردِ خداداد رہے گی
دنیا دلِ ناشاد کی آباد رہے گی

دنیا کی ہوا راس نہ آئیگی کسی کو
ہر سر میں ہوائے عدم آباد رہے گی

چونکائے گی رہ رہ کے تو غفلت کا مزہ کیا
ساتھ اپنے اجل صورتِ ہمزاد رہے گی

دل اور دھڑکتا ہے ادب گاہِ قفس میں
شاید یہ زباں تشنۂ فریاد رہے گی

جو خاک کا پتلا وہی صحرا کا بگولا
مٹنے پہ بھی اک ہستیٔ برباد رہے گی

ہر شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

شہرہ ہے یگانہ تری بیگانہ روی کا
واللہ یہ بیگانہ روی یاد رہے گی

غزل نمبر

○

لذتِ زندگی مبارک باد
کل کی کیا فکر؟ ہر چہ بادا باد

اے خوشا زندگی کہ پہلوئے شوق
دوست کے دم قدم سے ہے آباد

دل سلامت ہے دردِ دل نہ سہی
درد جاتا رہا کہ درد کی یاد ؟

زیست کے ہیں یہی مزے واللہ
چار دن شاد چار دن ناشاد

کون دیتا ہے دادِ ناکامی
خونِ فرہاد برسرِ فرہاد

صبر اتنا نہ کر کہ دشمن پر
تلخ ہو جائے لذتِ بیداد

صلح کر لو یگانہ غالب سے
وہ بھی استاد تم بھی اِک استاد

○

خوشی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

پیامِ زیرِ لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

ہنسی میں وعدۂ فردا کو ٹالنے والو
لو دیکھ لو وہی کل آج بن کے آ نہ گیا

گناہِ زندہ دلی کہیے یا دل آزاری
کسی پہ ہنس لیے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

کروں تو کس سے کروں دردِ نارسا کا گلہ
کہ مجھ کو لے کے دلِ دوست میں سما نہ گیا

بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا
خدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا

کرشن کا ہوں پجاری علی کا بندہ ہوں
یگانہ شانِ خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

آرزو لکھنوی

لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سید انور حسین آرزو
جلال کے شاگرد اور جانشین تھے۔ عربی و فارسی
کی اعلیٰ استعداد تھی۔ فنِ عروض و قافیہ میں
کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اس موضوع پر کئی
کارآمد رسالے لکھ چکے ہیں۔ زبان کی صحت کے لحاظ
سے مستند کلام مانا جاتا ہے۔ پرہیزگاری و تقویٰ کے
باعث دنیا سے نباہ نہ کرسکے۔ چنانچہ سالہا سال تک فلموں
اور ڈراموں کے لئے عرق ریزی کی مگر دنیادار نہ ہونے
کے سبب وہ معاوضہ نہ پاسکے جس کی ان کی تخلیقیں مستحق
تھیں۔ اکثر چھوٹے چھوٹے فقرے آسان الفاظ اور
ترکیب استعمال کرتے۔ سادگی اور اثر آفرینی آرزو
کے کلام کی خصوصیت تھی۔

کھائی ہو کبھی چوٹ تو دُکھ اور کا سمجھیں
وہ ہنس رہے ہیں اور یہاں جی پہ بنی ہے

فن اور شخصیت

آرزو لکھنوی

اوّل شب وہ بزم کی رونق، شمع بھی تھی پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے رنگی پر!
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا مے خانہ بھی

دونوں جولاں گاہِ جنوں ہیں بستی کیا ویرانہ کیا
اٹھ کے چلا جب کوئی بگولا دوڑ پڑا دیوانہ بھی

ایک لگن کے دو ہیں اثر اور دونوں حسبِ مراتب ہیں
لو جو لگائے شمع کھڑی ہے رقص میں ہے پروانہ بھی

وحدت میں کی کثرت پیدا جلووں کی پاشانی نے
ایک ہی جا تھا کچھ دن پہلے کعبہ بھی بت خانہ بھی

غنچے چپ ہیں، گل ہیں ہوا پر، کس سے کہئے جی کا حال
خاک نشیں اک سبزہ ہے، سو اپنا بھی بیگانہ بھی

قید کو توڑ کے نکلا جب میں، اٹھ کے بگولے ساتھ ہوئے
دشتِ عدم تک جنگل جنگل بھاگ چلا ویرانہ بھی

حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ ادھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا اڑ کے چلا پروانہ بھی

دورِ مسرت آرزو اپنا کیسا زلزلہ آگیں تھا!
ہاتھ سے منہ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی

جمیلؔ مظہری

نام میر کاظم علی، جمیلؔ تخلص، مولد عظیم آباد، سنِ ولادت سنہ ۱۹۰۵ء
ان کی ابتدائی تعلیم والدہ کے زیرِ سایہ ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں تاتلہ ہائی اسکول
سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ بنگال باشی کالج سے بی-اے
اور سنہ ۱۹۳۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ اس کے بعد روزنامہ
"ہند" اور "عصرِ جدید" سے منسلک رہے پھر مولانا ابوالکلام آزاد
کی ایماء سے پٹنہ میں شعبۂ اطلاعات میں پبلسٹی آفیسر ہو گئے۔ لیکن
سنہ ۱۹۴۲ء میں تحریکِ آزادی کے سلسلے میں نوکری چھوڑ دی۔ اسی زمانے
میں انگریز حکومت نے انھیں جیل میں بھیج دیا۔ رہا ہونے کے بعد
بمبئی میں فلمی دنیا سے منسلک ہو گئے اور گانے اور مکالمے لکھنے لگے
پھر فلمی دنیا راس نہ آئی اور پٹنہ میں ڈپٹی ڈائرکٹر آف پبلسٹی کا عہدہ
سنبھالا۔ اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے نثار بھی ہیں ——
"نقشِ جمیل" اور "فکرِ جمیل" مجموعۂ کلام شائع ہو چکے ہیں۔

رستے کا نشاں جس کو سمجھتے ہیں جمیلؔ آپ
ممکن ہے کہ گمراہوں کا نقشِ کفِ پا ہو!

فن اور شخصیت

جمیل مظہری

○

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

ہے روح تاریکیوں میں حیراں، بجھا ہوا ہے چراغِ منزل
کہیں سرِ راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا

بس ایک احساسِ نارسائی، نہ جوش اس میں نہ ہوش اس میں
جنوں پہ حالت ربودگی کی، خرد پہ عالم غنودگی کا

خدا کی رحمت پہ بھول بیٹھوں، یہی نہ معنی ہیں اس کے واعظ
وہ ابر کا منتظر کھڑا ہو، مکان جلتا ہو جب کسی کا

وہ لاکھ جھکوا لے سر کو میرے مگر یہ دل اب نہیں جھکے گا
کہ کبریائی سے بھی زیادہ مزاج نازک ہے بندگی کا

○

کہو نہ یہ کہ محبت ہے تیرگی سے مجھے
ڈرا دیا ہے پتنگوں نے روشنی سے مجھے

سفینہ شوق کا اب کے جو ڈوب کے ابھرا
نکال لے گیا دریائے بےخودی سے مجھے

ہے میری آنکھ میں اب تک وہی سفر کا غبار
ملا جو راہ میں صحرائے آگہی سے مجھے

ابھی تو پاؤں سے کانٹے نکالتا ہوں میں
ابھی نکال نہ گلزارِ زندگی سے مجھے

محمد علی جوہر

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر ایڈیٹر کامریڈ و ہمدرد سے کون واقف نہیں۔ ہندستان کی کامل آزادی کے بہت زبردست علمبردار اور مسلمانوں کے محبوب لیڈر تھے۔ آزادی کی جو تڑپ ان کے دل میں تھی وہ ان کے اس فقرے سے ظاہر ہے جو انھوں نے لندن میں کہا تھا "میں غلام ملک میں واپس جانا نہیں چاہتا۔ یا تو تمہیں ہم لوگوں کو آزادی دینی پڑے گی یا مجھے دوگز زمین قبر کے لیئے" اور انھوں نے اپنا یہ عزم پورا بھی کر دکھایا۔ لندن ہی میں ان کا انتقال ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو ہوا اور نعش بیت المقدس لاکر دفن کی گئی۔ آزادی کے عشق میں متعدد مرتبہ قید و بند کی تکلیفیں اٹھائیں مگر استقامت میں فرق نہ آیا۔ قادر الکلام شاعر انگریزی اور اردو کے اعلیٰ پایہ کے ادیب اور زبردست صحافی شعلہ بیان خطیب، ماہر سیاست داں اور نہایت بلند کیرکٹر کے انسان تھے۔ جوہر ۱۸۷۸ء میں ریاست رام پور میں پیدا ہوئے۔ دو برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ نے جو عوام میں بی اماں کے نام سے مشہور تھیں ان کی نہایت اعلیٰ تربیت کی۔ بی اے علیگڑھ کالج سے کیا پھر آئی سی ایس کی تعلیم کے لیئے انگلستان چلے گئے۔ واپس آکر رام پور اور بڑودہ میں کچھ عرصہ ملازمت کی مگر جلد ہی نوکری کی پابندیوں سے گھبرا کر استعفیٰ دے دیا اور کلکتہ سے ۱۱ جنوری ۱۹۱۱ء کو کامریڈ جاری کیا۔ اس میں زبردست مقالے لکھے اور انشاء پردازی کے ایسے شاندار نمونے دکھائے کہ مشہور ادیب ایچ جی ویلز نے کہا "محمد علی نے برک کی زبان، مکالے کا قلم اور نپولین کا دل پایا ہے۔" مولانا کے اشعار جذب، اثر، جوش سے بھرے ہوئے ہیں۔ "کلام جوہر" ان کی منظومات کا مجموعہ ہے۔ مگر شاعری ان کا اصل میدان نہیں۔ ان کی عظمت کے جھنڈے سیاست کے خارزار میں گڑے ہوئے ہیں۔

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

محمد علی جوہر

○

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر آن تسلی ہے ہر لحظہ تشفی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بیٹھا ہوا توبہ کی تو خیر منایا کر
ٹلتی نہیں یوں جوہر اس دیس کی برساتیں

○

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو کوئی آرزو
باقی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں
آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا، سزا کے بعد

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

حامد سعید خاں حامدؔ

حامد سعید خاں حامدؔ بتاریخ ۲۳ اگست ۱۸۹۷ء بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم احمد سعید خان صاحب ریاست کے جاگیردار اور نواب نصراللہ خاں صاحب کے اسٹاف آفیسر تھے۔ حامد صاحب کے دادا حکیم محمد سعید خاں صاحب بڑے حاذق طبیب اور فارسی زبان کے جیّد عالم تھے۔ انھوں نے اپنے دادا کی ہی گود میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ۱۵ برس کی عمر سے ہی لیلیٰ شاعری کی زلفوں کے اسیر ہو گئے اور ۲۰ سال کی عمر میں اسکول کی بندشوں اور درسی علوم سے کنارہ کش ہو گئے۔ باقاعدہ کسی کے شاگرد نہیں رہے البتہ شہید ٹونکی سے کبھی کبھی وہ مشورۂ سخن کر لیا کرتے تھے۔ پچیس برس کی عمر میں ممتاز غزل گو شعراء کی صف میں انھیں شامل کیا جانے لگا۔ ۱۹۲۳ء میں انھوں نے بھوپال سے ایک ادبی رسالہ "محسن الملک" جاری کیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ نیازؔ فتح پوری اپنا رسالہ "نگار" بھوپال سے نکالا کرتے تھے۔ حامد صاحب کا رسالہ حالات کی ژولیدگی کی نذر ہو گیا۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۲۹ء تک کا زمانہ علیگڈھ میں گذرا۔ یہاں ان کے ذوقِ سلیم کو مزید جلا ملی اور ان کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوا۔ غزل گوئی میں کافی نام پیدا کیا آخرش ۲۷ فروری ۱۹۶۲ء کو اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔

میں کس طرح سے چھپاؤں کسی کے آنے کو
فضائے رونقِ دیوار و در نہیں چھپتی

حامد سعید خاں حامدؔ

کسی حجاب میں یہ پردہ در نہیں چھپتی!
چھپاؤ لاکھ محبت مگر نہیں چھپتی

میں کس طرح سے چھپاؤں کسی کے آنے کو
فضائے رونقِ دیوار و در نہیں چھپتی

نقابِ عارضِ گلگوں سہی وہ زلف مگر
ردائے ظلمتِ شب سے سحر نہیں چھپتی

جوابِ نامہ چھپاتا ہے سو طرح، لیکن
ندامتِ نگہِ نامہ بر نہیں چھپتی

حجابِ راہ ہیں دیر و حرم مگر پھر بھی
مری نظر سے تری رہ گزر نہیں چھپتی

مریضِ درد کی حالت چھپا رہا ہے مگر
فسردگیٔ رخِ چارہ گر نہیں چھپتی

چھپا رہی ہیں سرِ حشر رحمتیں حامدؔ
مگر لطافتِ دامانِ تر نہیں چھپتی

حامد سعید خاں حامد

○

کمی سمجھ کے مذاقِ جنوں بڑھایا ہے
مرے سلام پہ وہ آج مسکرایا ہے

اسیر اب کہیں ان تیلیوں سے رکتے ہیں
قفس میں اہلِ چمن کا سلام آیا ہے

فضائے شوق کی حد ختم ہو گئی ہے جہاں
دل آج ان کو وہاں تک پکار آیا ہے

رکے رکے سے ستارے ڈرا ڈرا سا جہاں
مگر مزاجِ جنوں برہمی پہ آیا ہے

حریمِ حسن میں اب آفتاب لے جائیے
کہ آئینہ تو بہت شرمسار آیا ہے

الٰہی خیر ہو زنداں کی اب کہ پہلی بار
تمام عمر میں دیوانہ مسکرایا ہے

بلاک جلوہ توان سے بلند ہے جنکو
پیمبری کی سند لے کے ہوش آیا ہے

مری حیات نے ان کی پناہ میں آکر
ہزار بار اجل کا مذاق اڑایا ہے

سکونِ دل ہی سے چھوٹے ہیں زمزمے حامد
سکونِ دل مگر حشر بھی اٹھایا ہے

○

روح کا منزلِ ہستی سے جدا ہو جانا
قافلہ بھر کا ہے بے بانگِ درا ہو جانا

آؤ اک قصۂ افتادِ تمنا سن لو
پھر ہمیشہ کے لئے ہم سے خفا ہو جانا

اک نگاہِ کرمِ یار سکھا دیتی ہے
عمر بھر کے لئے پابندِ وفا ہو جانا

جس جگہ زندگیٔ عشق گذاری ہو کبھی
فخرِ ہستی ہے اسی در پہ فنا ہو جانا

دہر میں ایسی فضائیں کہیں ملتی ہیں بھلا
چاہتا ہوں میں ازل ہی میں فنا ہو جانا

ہم پہ گذرا ہے محبت کا زمانہ حامد
ہم نے دیکھا ہے جفاؤں کا وفا ہو جانا

آشنائی نگہِ برقِ تپاں ہے کہ نہیں
اس چمن میں کوئی اب شعلہ بجاں ہے کہ نہیں

یہ زمانہ یہ فلک یہ کرم دشمن و دوست
کوئی نالہ مرے ہونٹوں پہ جواں ہے کہ نہیں

عشقِ خود بیں پہ تو دنیا کی نظر ہے لیکن
عالمِ دل کا بھی کوئی نگراں ہے کہ نہیں

ان کی محفل میں یہ شک اور بھی بڑھ جاتا ہے
یعنی ہم ہیں کہ نہیں بزم جہاں ہے کہ نہیں

دل سے پوچھوں تو سہی اک نگہِ لطف کے بعد
آج بھی کچھ خلشِ دردِ نہاں ہے کہ نہیں

تم تو دیکھو کہ مجھے کوئی بتاتا ہی نہیں
کوئی جلوہ مری صورت سے عیاں ہے کہ نہیں

تم ذرا نوکِ مژہ سے کہیں چھیڑو تو سہی
کسی رگ میں بھی مری خون رواں ہے کہ نہیں

لاکھ ہو طاقتِ گفتار مگر اُن کے حضور
سوچتا ہوں کہ مرے منہ میں زباں ہے کہ نہیں

دل سے اور چشمِ فسوں گر سے نہ جانے حامد
اب بھی کچھ سلسلۂ ربطِ نہاں ہے کہ نہیں

دسواں باب

اقبال ۱۸۷۵-۱۹۳۸
جوش ملیح آبادی ۱۸۹۴ء
فراق ۱۸۹۶
سیماب اکبرآبادی ۱۸۸۰-۱۹۵۱
حفیظ جالندھری ۱۹۰۰
اختر شیرانی ۱۹۰۵-۱۹۴۸
ساغر نظامی ۱۹۰۵

روش صدیقی ۱۹۱۱-۱۹۷۱
آنند نرائن ملا ۱۹۰۱
احسان دانش ۱۹۱۲
ہری چند اختر ۱۹۰۱-۱۹۵۸
عرش ملسیانی ۱۹۰۸
تاثیر ۱۹۰۲-۱۹۵۰
سیف الدین سیف ۱۹۲۲
عبدالحمید عدم ۱۹۰۹
شاد عارفی

اقبؔال

کشمیری بزرگوں کی نسل سے ڈاکٹر سر محمد اقبؔال کی پیدائش سیالکوٹ میں ہوئی۔ مشرق و مغرب کے فلسفہ کے علوم کے اعلیٰ مدارج انگلستان اور جرمنی میں طے کیے۔ اقبؔال نے شاعری کے ساتھ اپنے علم و دانش سے بھی اتنی ہی شہرت حاصل کی۔ ان کا مرتبہ جدید اسلامی دنیا کی تاریخ میں بہت بلند ہے۔ عالم، فلسفی، شاعر اور روشن خیال رہبر قوم تھے۔ شاعری کے فن میں داغؔ کے شاگرد تھے ابتدا کی شاعری میں استاد کی جھلک ہے۔ رفتہ رفتہ ایک علیحدہ ڈگر اختیار کی جس کی خوبیاں اظہر من الشمس ہیں۔ غالبؔ کی طرح اقبؔال کے فارسی کلام کو اردو سے بلند خیال کیا جاتا ہے اور غالبؔ ہی کی طرح ان پر بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اقبال

○

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج، نظر کے سوا کچھ اور نہیں

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

عروسِ لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے، ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

بڑا کریم ہے اقبال بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

○

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دورِ پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

کوئی بتائے مجھے یہ غیاب ہے کہ حضور
سب آشنا ہیں یہاں ایک میں ہوں بیگانہ

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

اقبال

○

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں، زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں!

اگر کچھ آشنا ہوتا، مذاقِ جبہہ سائی سے
تو سنگِ آستانِ کعبہ، جا ملتا جبینوں میں

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں
کہ لیلیٰ کی طرح، تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

مہینے وصل کے، گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی، گزرتی ہیں مہینوں میں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا! کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو، ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو، موجِ نفس ان کو
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

تمنا دردِ دل کی ہو، تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں!

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

محبت کے لئے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

خموش اے دل! بھری محفل میں چلّانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے، محبت کے قرینوں میں

بُرا سمجھوں انھیں، مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا!
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

اقبال

○

کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا، کہ چھپا ہوا ہو، سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے، نگاہِ آئینہ ساز میں

دمِ طوف، کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملیگا نماز میں

○

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہو
مری سادگی دیکھ! کیا چاہتا ہو

ستم ہو، کہ ہو وعدۂ بے حجا
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہو

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہو

ذرا سا تو دل ہوں، مگر شوخ ا
وہی لن ترانی سنا چاہتا

کوئی دم کا مہماں ہوں، اے اہلِ مح
چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا

بھری بزم میں راز کی بات کہ
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا

جوشؔ ملیح آبادی

۱۸۹۴ء میں ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد دادا، پردادا سب ہی شاعر تھے۔ اس طرح ان کو گھر کے ادبی ماحول میں اپنے ذوق کی تربیت کا موقع ملا۔ ان کی سیاسی اور انقلابی نظموں کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے کلام میں جذبات اور احساسات کی شدت غیر معمولی طور پر پائی جاتی ہے۔

حضرت جوشؔ اچھوتی تشبیہیں، بے مثل استعارات، لطیف ترین محاکات و نفسیات نگاری کی طرح نو کے بانی ہیں۔ یہ حقیقی معنوں میں اردو شاعری کے لئے شاعر انقلاب ہیں۔ جدید شاعری اور ادب کے لئے شاعر انقلاب کا اچھوتا طرز فکر و بیان ایک ناقابل فراموش دین ہے۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے کلام میں لفظوں کا جو خزینہ ملتا ہے وہ کسی اور شاعر کے پاس نہیں۔ جوشؔ ان دنوں پاکستان میں قیام پذیر ہیں۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

جوش ملیح آبادی

○

قدم انساں کا راہِ دہر میں تھرّا ہی جاتا ہے
چلے کتنا ہی کوئی بچ کے ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

نظر خواہ کتنی ہی حقائق آشنا، پھر بھی
ہجومِ کشمکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے

خلافِ مصلحت میں بھی سمجھتا ہوں، مگر واعظ
وہ آتے ہیں تو چہرہ پر تغیّر آ ہی جاتا ہے

ہوائیں زور کتنا ہی لگائیں آندھیاں بن کر!
مگر جو گھر کے آتا ہے وہ بادل چھا ہی جاتا ہے

شکایت کیوں اسے کہتے ہو یہ فطرت ہے انساں کی
مصیبت میں خیالِ عیشِ رفتہ آ ہی جاتا ہے

سمجھتی ہیں مآلِ گل میں کیا زورِ فطرت ہے
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسّم آ ہی جاتا ہے

جوش ملیح آبادی

○

اٹھی وہ گھٹا رنگ سامانیاں کر
گہر پاشیاں کر، زر افشانیاں کر

وہ چہکے عنادل، وہ سنکیں ہوائیں
گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر

صراحی جھکا اور دھومیں مچا دے
گلابی اٹھا اور گل افشانیاں کر!

مٹا داغِ ہوش اور مدہوش ہو جا
اٹھا جامِ زر اور سلطانیاں کر

نگاہوں سے برسا دے ابرِ جوانی!
مئے لالہ گوں سے گلستانیاں کر!

صبا کی طرح کنج میں رقص فرما
بگولوں کی مانند جولانیاں کر!

سکوں پاؤں چومے وہ ہلچل مچا دے
خرد سر جھکا دے وہ نادانیاں کر

علم کھول کر جوش بدمستیوں کے
جہانداریاں کر جہانبانیاں کر

جوش ○

عشووں کو چین ہی نہیں آفت کئے بغیر
تم، اور مان جاؤ شرارت کئے بغیر

اہلِ نظر کو یارا دکھاتا رہِ وفا
اے کاش! ذکرِ دوزخ و جنت کئے بغیر

اب دیکھ اس کا حال کہ آتا نہ تھا قرار
خود تیرے دل کو جس پہ عنایت کئے بغیر

اے ہمنشیں محال ہے ناصح کا ٹالنا
یہ، اور یہاں سے جائیں نصیحت کئے بغیر

تم کتنے تند خو ہو کہ پہلو سے آج تک
اک بار بھی اٹھے نہ قیامت کئے بغیر

چاہتا نہیں ہے محفلِ حسنِ جواں میں کام
ہر جنبشِ نظر سے عبادت کئے بغیر
مانا کہ ہر قدم پہ قیامت ہے پھر بھی جوش
بنتا نہیں کسی سے محبت کئے بغیر

○

جہنم سرد ہے، جنت کے در کھلوائے جاتے ہیں
سرِ محشر پجاری حسن کے بلوائے جاتے ہیں

غضب ہے یہ ادا اُن کی دمِ آرائشِ گیسو
جھکی جاتی ہیں آنکھیں خود بخود شرمائے جاتے ہیں

سحر کی ضو، شفق کی سرخیاں، برسات کے بادل
مجھے ہمراز پاکر یہ مناظر کھائے جاتے ہیں

نہ جانے کتنی رنگیں صحبتیں ہیں میری نظروں میں
بس اے مطرب! مری آنکھوں میں آنسو آئے جاتے ہیں

شبِ وعدہ یہ کیسی تیرگی ہے؟ وقت کیا ہوگا؟
تمناؤں کے غنچے ہم نفس، کھلائے جاتے ہیں

کوئی حد ہی نہیں اس احترامِ آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں
بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

فراق گورکھپوری

فراق کو شاعری ورثے میں ملی آپ کے والد بزرگوار منشی گورکھ پرشاد عبرت اپنے وقت کے اردو کے ممتاز شاعر تھے۔ فراق ۸ر اگست ۱۸۹۶ء کو گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گورکھپور میں ہی ہوئی۔ بعد میں میور سنٹرل کالج الہ آباد سے امتیازی نشانات سے بی اے کیا۔ اسی زمانے میں جدوجہد آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے جیل گئے۔ رہا ہو کر کانگریس کے انڈر سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے پھر آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات سے ایم اے کیا اور الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے استاد مقرر ہو گئے۔

ویسے فراق نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی اور کامیاب بھی رہے مگر یہ غزل گوئی میں اپنے ہمعصروں کے میر کارواں نظر آتے ہیں۔ زبان کی مٹھاس، لوچ لچک، پیار کی چاشنی، محاکات کی کشش، کسک اور چسک ان کی شاعری کی امٹ چھاپ ہے۔ غزلوں میں ہندی الفاظ بڑے رچاؤ، سبھاؤ اور لگاؤ سے لاتے ہیں۔

شاعری کے علاوہ انھوں نے کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے، ادبیات کے علاوہ فلسفہ، نفسیات اور مذہب کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ کئی انجمنوں کے رکن اور عہدہ دار ہیں۔ موجودہ دور کے شعرا میں فراق کا درجہ بہت بلند ہے۔ علامہ اقبال کے بعد اگر کسی شاعر پر نظر ٹھہرتی ہے تو وہ ہیں فراق ـــ

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہو یا تجھے بھلانے میں

فراق گورکھپوری

سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اِس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اُس جلوہ گہِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بیجا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

آہ یہ مجمعِ احباب، یہ بزمِ خاموش
آج محفل میں فراقؔ سخن آرا بھی نہیں

○

شام غم کچھ اس نگاہ ناز کی باتیں کرو
بے خودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو

یہ سکوت ناز، یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا
خامشی میں کچھ شکست ساز کی باتیں کرو

نکہت زلف پریشاں، داستان شام غم
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو

ہر رگ دل وجد میں آتی رہے، دکھتی رہے
یونہی اس کے جا و بے جا ناز کی باتیں کرو

جو عدم کی جان ہے، جو ہے پیام زندگی
اس سکوت راز، اس آواز کی باتیں کرو

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرت پرواز کی باتیں کرو

جس کی فرقت نے پلٹ دی عشق کی کایا فراق
آج اس عیسیٰ نفس دم ساز کی باتیں کرو

فراق گورکھپوری

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب، مگر پھر بھی

ہزار بار زمانہ اِدھر سے گذرا ہے
نئی نئی ہے مگر کچھ تیری رہ گذر پھر بھی

خوشا اشارۂ پیہم زہے سکوتِ نظر
دراز ہو کے فسانہ ہے مختصر پھر بھی

جھپک رہی ہیں زمان و مکاں کی بھی آنکھیں
مگر ہے قافلہ آمادۂ سفر پھر بھی

پلٹ رہے ہیں غریب الوطن، پلٹنا تھا!
وہ کوچہ روکشِ جنت ہو، گھر ہے گھر پھر بھی

خراب ہو کے بھی سوچا کئے ترے مہجور!
یہی کہ تیری نظر ہے تری نظر پھر بھی

تری نگاہ سے بچنے میں عمر گذری ہے
اُتر گیا رگِ جاں میں یہ نیشتر پھر بھی

غمِ فراق کے کُشتوں کا حال کیا ہوگا
یہ شامِ ہجر تو ہو جائے گی سحر پھر بھی

اگرچہ بیخودیٔ عشق کو زمانہ ہوا!
فراقؔ کرتی رہی کام وہ نظر پھر بھی

○

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا
وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا

پھر ترا غم وہی رسوائے جہاں ہے کہ جو تھا
پھر فسانہ بحدیثِ دگراں ہے کہ جو تھا

منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گذراں ہے کہ جو تھا

منزلیں عشق کی تا حدِّ نظر سونی ہیں
کوئی رہبر نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے کہ جو تھا

یوں تو اس دور میں بے کیف سی ہے بزمِ حیات
ایک ہنگامہ سرِ رطلِ گراں ہے کہ جو تھا

جو بھی کر جور و ستم جو بھی کر احسان و کرم
تجھ پہ اے دوست وہی وہم و گماں ہے کہ جو تھا

آنکھ جھپکی کہ ادھر ختم ہوا روزِ وصال
پھر بھی اس دن پہ قیامت کا گماں ہے کہ جو تھا

قرب ہی کم ہے نہ دوری ہی زیادہ لیکن
آج وہ ربط کا احساس کہاں ہے کہ جو تھا

پھر سرِ میکدۂ عشق ہے اک بارشِ نور
چھلکے جاموں سے چراغاں کا سماں ہے کہ جو تھا

آج بھی آگ دبی ہے دلِ انساں میں فراق
آج بھی سینوں سے اٹھتا وہ دھواں ہے کہ جو تھا

یہ نکہتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رات
یاد آ رہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

مایوسیوں کی گود میں دم توڑتا ہے عشق
اب بھی کوئی بنا لے تو بگڑی نہیں ہے بات

کچھ اور بھی تو ہو ان اشارات کے سوا
یہ سب تو اے نگاہِ کرم، بات بات بات

اک عمر کٹ گئی ہے ترے انتظار میں
ایسے بھی ہیں کہ کٹ نہ سکی جن سے ایک رات

ہم اہلِ انتظار کے آہٹ پہ کان تھے
ٹھنڈی ہوا تھی، غم تھا ترا، ڈھل چلی تھی رات

یوں تو بچی بچی سی اٹھی وہ نگاہِ ناز
دنیائے دل میں ہو ہی گئی کوئی واردات

جن کا سراغ پا نہ سکی غم کی روح بھی
ناداں ہوتے ہیں عشق میں ایسے بھی سانحات

ہر سعی و ہر عمل میں محبت کا ہاتھ ہے
تعمیرِ زندگی کے سمجھ کچھ محرکات

مجھ کو تو غم نے فرصتِ غم بھی نہ دی فراق
دے فرصتِ حیات نہ جیسے غمِ حیات

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

تمام شعلۂ گل ہے تمام موجِ بہار
کہ تا حدِ نگہِ شوق لہلہاتے ہیں باغ

"نئی زمیں، نیا آسماں، نئی دنیا"
سنا تو ہے کہ محبت کو ان دنوں ہے فراغ

جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

نگاہیں مطلعِ نو پر ہیں ایک عالم کی
کہ مل رہا ہے کسی پھوٹتی کرن کا سراغ

دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

فراق بزمِ چراغاں ہے محفلِ رنداں
سجے ہیں پگھلی ہوئی آگ سے چھلکتے ایاغ

سیماب اکبرآبادی

عاشق حسین نام ۔ محمد حسین صدیقی کے فرزند ۔ آگرہ کے رہنے والے ۔ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے ۔ عربی ادب، اصول، منطق اور فارسی کی تحصیل کے بعد انگریزی کی تحصیل شروع کی ۔ ایف ۔ اے میں تھے کہ والد کے انتقال کے باعث تعلیم ترک کرنی پڑی اور ریلوے میں ملازم ہو گئے مگر شعر و شاعری کے شوق میں ملازمت کو خیرباد کہا اور آگرہ آکر زبان اور ادب کی خدمت میں مصروف ہو گئے ۔ رسالہ 'مرصع' جاری کیا ۔ پھر ٹونڈے میں جاکر 'آگرہ اخبار' کی ادارت کی ۔ 'پیمانہ'، 'ثریا'، 'شاعر' اور 'تاج' کے ایڈیٹر بھی رہے ۔ فن شعر میں داغ کے شاگرد رہے ۔ ان کی شاعری کا موضوع بقول خود "حسن محض اور عشق محض" ہے ۔ باقاعدہ شاعری کا کالج بنام "قصر الادب" قائم کیا اور سیکڑوں شاگرد بنائے ۔ چار مہینے فالج میں مبتلا رہنے کے بعد ۷۱ سال کی عمر میں ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو کراچی میں انتقال کیا ۔ بقول خود ۲۸۴ کتابوں کے مصنف تھے ۔ ان کی نظموں کے تین مجموعے 'صہبائے کہن'، 'بادۂ دوشین' اور 'نشید نو' کے نام سے چھپ چکے ہیں ۔ 'ساز و آہنگ'، 'سرود غم'، 'نغمۂ کار امروز' اور 'دستور الاصلاح' بھی ان کی کتابیں ہیں ۔ خوش گو اور قادر الکلام شاعر تھے ۔ ان کے نام سے بمبئی میں ایک اکیڈمی بھی قائم ہوئی ہے جس کا کام ان کی تخلیقات کو فروغ دینا ہے ۔

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

سیماب اکبرآبادی

چمک جگنو کی برقِ بے اماں معلوم ہوتی ہے
قفس میں رہ کے قدرِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

ہوائے شوق کی قوت وہاں لے آئی ہے مجھ کو
جہاں منزل بھی گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے
کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبت کی
جہاں محسوس ہوتی تھی وہاں معلوم ہوتی ہے

نہ کیوں سیماب مجھکو قدر ہو ویرانیٔ دل کی
یہ بنیادِ نشاطِ دو جہاں معلوم ہوتی ہے

سیماب اکبرآبادی

○

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

صبر آہی جائے گر ہو بسر ایک حال میں
امکاں اک اور ظلم ہے قیدِ محال میں

آزردہ اس قدر ہوں سرابِ خیال سے
جی چاہتا ہے تم بھی نہ آؤ خیال میں

تنگ آکے توڑتا ہوں طلسمِ خیال کو!
یا مطمئن کرو کہ تمھیں ہو خیال میں!

دنیا ہے خواب، حاصلِ دنیا خیال ہے
انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں

بجلی گری اور آنچ نہ آئی کلیم پر!
شاید ہنسی بھی آ گئی ان کو جلال میں

عمرِ دو روزہ واقعی خواب و خیال تھی
کچھ خواب میں گزر گئی، باقی خیال میں

○

جنوں پہنچا بیاباں، بہار آئی گلستاں میں
یہ دونوں کیوں نہ آ بیٹھے مرے چاکِ گریباں میں

یہ کس کافر نے لی انگڑائیاں صحنِ گلستاں میں
قیامت چھپتی پھرتی ہے گلوں کے چاک داماں میں

دلِ غمگیں! مداراتِ ستم کی بات رہ جائے
لہو کی بوند بن کر جذب ہو جا، نوکِ پیکاں میں

ذرا کھل کر پکارا اے صور۔! مجذوبانِ لفت کو
یہ دیوانے کہیں بیٹھے نہ رہ جائیں بیاباں میں

سیماب اکبرآبادی

○

نامہ گیا کوئی، نہ کوئی نامہ بر گیا
تیری خبر نہ آئی، زمانہ گزر گیا

ہنستا ہوں یوں کہ ہجر کی راتیں گزر گئیں
روتا ہوں یوں کہ لطفِ دعائے سحر گیا

اب مجھ کو ہے قرار تو سب کو قرار ہے
دل کیا ٹھہر گیا کہ زمانہ ٹھہر گیا

یارب! نہیں میں واقفِ رودادِ زندگی
اتنا ہی یاد ہے کہ جیا اور مر گیا

○

جتنے ستم کئے تھے کسی نے عتاب میں
وہ بھی ملا لئے کرمِ بے حساب میں

حسرت کو گھر کہیں نہ ملا اضطراب میں
لٹنے کو آ گئی دلِ خانہ خراب میں

اٹھا ہے ابرِ مے کدہ دستِ دعا کے ساتھ
اتنی برس پڑے کہ نہا لوں شراب میں

آ، اے گلِ فسردہ! لگا لوں تجھے گلے
تو بھی تو میری طرح لٹا ہے شباب میں

ہر چیز پہ بہار، ہر اک شے پہ حسن تھا
دنیا جواں تھی میرے عہدِ شباب میں

حفیظؔ جالندھری

حفیظؔ سنہ ۱۹۰۰ء میں جالندھر (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے
سات برس کی عمر سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ گھرانہ اسلامی تہذیب کا
دلدادہ تھا اس لئے ان کے رگ و پے میں بھی اسلامی نظریات رچ بس گئے
۱۹۱۱ء میں جب یہ چھٹی جماعت میں تھے پہلی غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے ؎

خواب میں دلدار کی تصویر ہم نے دیکھ لی
رات جاگی ہوئی تقدیر ہم نے دیکھ لی

گذر بسر کے لئے انھیں بہت صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں، کبھی ٹائم کیپری کی ملازمت
کی تو کبھی فوجی وردیوں کی تیاری کا ٹھیکہ لیا تو کبھی عطر کی دکان کھول لی۔ پھر صحافت
میں آ گئے۔ رسالہ "اعجاز" جالندھر، رسالہ "شباب" لاہور، روزنامہ "زمیندار"
وغیرہ سے منسلک رہے۔ پھر "ہزار داستان" کے مدیر اعلیٰ ہو گئے۔ اعلیٰ سطح پر
فوجی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ کئی اعزازت اور خطابات سے نوازے
گئے۔ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی اور کامیاب رہے لیکن "شاہنامۂ اسلام"
لکھ کر انھوں نے عالمی شہرت اختیار کی۔ پہلا مجموعۂ کلام "نغمہ زار" ۱۹۲۵ء میں چھپا
اس کے بعد چھ اور مجموعے بھی شائع ہوئے۔ انھوں نے طبعزاد افسانے بھی لکھے حالی
کا انتخاب بھی پیش کیا۔ اور بچوں کے لئے بھی انھوں نے کئی کتابیں لکھیں۔

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظؔ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں

حفیظ جالندھری

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے

تم ہی نہ سن سکے اگر، قصۂ غم سنے گا کون
کس کی زباں کھلے گی پھر، ہم نہ اگر سنا سکے

ہوش میں آ چکے تھے ہم، جوش میں آ چکے تھے تم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے

رونقِ بزم بن گئے، لب پہ حکایتیں رہیں
دل میں شکایتیں رہیں، لب نہ مگر ہلا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی برہمئ مزاجِ دوست
اب وہ کرے علاجِ دوست جس کی سمجھ میں آ سکے

شوقِ وصال ہے یہاں، لب پہ سوال ہے یہاں
کس کی مجال ہے یہاں ہم سے نظر ملا سکے

اہلِ زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے

حفیظ جالندھری

او دل توڑ کے جانے والے، دل کی بات بتاتا جا!
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں، مجھ کو بھی سمجھاتا جا

ہاں، میرے مجروح تبسم خشک لبوں تک آتا جا
پھول کی ہمت و بو دینی ہے کھلتا جا مرجھاتا جا

میری چپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سنتا جا شرماتا جا

یہ دکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے داتا کی
شکر نعمت بھی کرتا جا، دامن بھی پھیلاتا جا

جینے کا ارمان کروں یا مرنے کا سامان کروں
عشق میں کیا ہوتا ہے ناصح عقل کی بات سجھاتا جا

تجھ کو ابر آلود دلوں سے کام نہ چاندنی راتوں سے
بہلاتا ہے باتوں سے بہلاتا جا بہلاتا جا

دونوں سنگ راہ طلب ہیں، راہنما بھی منزل بھی
ذوق طلب ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا

نغمے سے جب پھول کھلیں گے چننے والے چن لینگے
سننے والے سن لیں گے تو اپنی دھن میں گاتا جا

آخر تجھ کو بھی موت آتی بخیر حفیظ خدا حافظ
لیکن جاتے جاتے پیارے، وجہ مرگ بتاتا جا

فن اور شخصیت

حفیظ جالندھری

جھگڑا دانے پانی کا ہے، دام و قفس کی بات نہیں
اپنے بس کی بات نہیں، صیاد کے بس کی بات نہیں

جان سے پیارے یار ہمارے، قید وفا سے چھوٹ گئے
سارے رشتے ٹوٹ گئے اک تارِ نفس کی بات نہیں

تیرا پھولوں کا بستر بھی راہ گزارِ سیل میں ہے
آقا۔ اب یہ بندے ہی کے خار و خس کی بات نہیں

دونوں ہجر میں رو دیتے ہیں، دونوں وصل کے طالب ہیں
حسن بھلا کیسے پہچانے، عشق ہوس کی بات نہیں

نوش ہے عنواں، نیش نتیجہ، ان شیریں افسانوں کا
تذکرہ ہے انسانوں کا یہ مور، مگس کی بات نہیں

کارِ مغاں یہ قند کا شربت بیچنے والے کیا جانیں!
تلخی و مستی بھی ہے غزل میں، خالی رس کی بات نہیں

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظؔ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں

اختر شیرانی

نام داؤد خاں اور تخلص اختر تھا ۔ مشہور فاضل اور محقق حافظ محمود خاں شیرانی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی کے لڑکے تھے اور افغانوں کے قبیلہ شیرانی سے متعلق تھے ۔ ۴ مئی ۱۹۰۵ء کو ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے ۔ ۱۹۱۹ء میں حافظ صاحب اور اختر لاہور آ گئے ۔ ۱۹۲۱ء تین چار مہینے پڑھ کر منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۲۲ء میں ادیب فاضل کا ۔ شعر گوئی کا بچپن سے شوق تھا ۔ پہلی نظم جوگن ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی جو اتنی شاندار تھی کہ اس نے ان کے نام کو سارے ہندستان میں مشہور کر دیا ۔ مختلف اوقات میں ہمایوں، انتخاب، بہارستان، خیالستان، رومان اور مولانا تاجور کے رسالے شاہکار کے ایڈیٹر رہے ۔ مولانا محمد علی جوہر کے روزنامہ ہمدرد دہلی میں ڈکاہی کالم لکھتے رہے ۔ اور ادارہ اردو مرکز میں مولانا تاجور کے معین و مددگار رہے ۔ انجمن ترقی اردو میں بھی کچھ عرصہ کام کیا ۔ ۱۹۴۰ء میں وطن واپس چلے گئے مگر تقسیم ملک کے بعد پھر لاہور آ گئے کثرت شراب نوشی نے ان کے دل و دماغ اور دوسرے اعضاء پر بہت برا اثر کیا ۔ اسی باعث ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو میو اسپتال لاہور میں انتقال ہوا ۔ میاں صاحب کے قبرستان میں دفن ہوئے ۔ رومانی شاعری میں ان کا اپنا ایک الگ مقام تھا ۔ اردو شاعری میں پہلی بار 'عورت' کو انھوں نے ایک نئے اور انوکھے انداز سے متعارف کروایا ۔

تم افسانۂ قیس کیا پوچھتے ہو
اِدھر آؤ ہم تم کو لیلیٰ بنا دیں

فن اور شخصیت

اختر شیرانی

بھلا کیوں کر نہ ہوں راتوں کو نیندیں بے قرار اس کی
کبھی لہرا چکی ہو جس پہ زلفِ مشکبار اس کی

امیدِ وصل پر دل کو فریبِ صبر کیا دیجے
ادا وحشی صفت اس کی، نظر بیگانہ وار اس کی

محبت تھی مگر یہ بے قراری تو نہ تھی پہلے
الٰہی آج کیوں یاد آتی ہے بے اختیار اس کی

یہاں کیا دیکھتے ہو ناصحو، گھر میں دھرا کیا ہے
مرے دل کے کسی پردے میں ڈھونڈو یادگار اس کی

جفائے نازکی میں نے شکایت ہائے کیوں کی تھی
مجھے جینے نہیں دیتی نگاہِ شرمسار اس کی!

نہیں عرضِ تمنا کی جسارت، ہو تو کیوں کر ہو!
نگاہیں فتنہ زا اس کی، ادائیں حشر بار اس کی

کوئی کیونکر بھلا دے ہائے ایسے کی محبت کو
ادا روحِ نشاط اس کی، نظر جانِ بہار اس کی!

بُرا ہو اس تغافل کا، کہ تنگ آ کر یہ کہتا ہوں
مجھے کیوں ہو گئی الفت مرے پروردگار اس کی

انہی کوچوں میں کل اختر کو رسوا ہوتے دیکھا تھا
وہ آنکھیں اشکبار اس کی وہ باتیں دل فگار اس کی

اختر شیرانی

وہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بھلا دیں
محبت کریں خوش رہیں مسکرا دیں

غرور اور ہمارا غرورِ محبت
مہ و مہر کو ان کے در پر جھکا دیں

جوانی ہو گر جاودانی تو یا رب
تری سادہ دنیا کو جنت بنا دیں

شبِ وصل کی بے خودی چھا رہی ہے
کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں

بہاریں سمٹ آئیں کھل جائیں کلیاں
جو ہم تم چمن میں کبھی مسکرا دیں!

عبادت ہے اک بے خودی سے عبارت
حرم کو مئے مشکبو سے بسا دیں

وہ آئیں گے آج اے بہارِ محبت
ستاروں کے بستر پہ کلیاں بچھا دیں

بناتا ہے منہ تلخیٔ مے سے زاہد
تجھے باغِ رضواں سے کوثر منگا دیں

تم افسانۂ قیس کیا پوچھتے ہو!
ادھر آؤ ہم تم کو لیلیٰ بنا دیں

وہ سرمستیاں بخش اے رشکِ شیریں
کہ خسرو کو خوابِ عدم سے جگا دیں

انھیں اپنی صورت پہ یوں ناز کب تھا
مرے عشقِ رسوا کو اختر دعا دیں

تمناؤں کو زندہ آرزوؤں کو جواں کرلوں
یہ شرمیلی نظر کہہ دے تو کچھ گستاخیاں کرلوں

بہار آئی ہے بلبل دردِ دل کہتی ہے پھولوں سے
کہو تو میں بھی اپنا دردِ دل تم سے بیاں کرلوں

ہزاروں شوخ ارماں لے رہے ہیں چٹکیاں دل میں
حیا ان کی اجازت دے تو کچھ بیباکیاں کرلوں

کوئی صورت تو ہو دنیائے فانی میں بہلنے کی
ٹھہر جا اے جوانی ماتمِ عمرِ رواں کرلوں

چمن میں ہیں بہم پروانہ و شمع و گل و بلبل
اجازت ہو تو میں بھی حالِ دل اپنا بیاں کرلوں

کسے معلوم کب کس وقت کس پر گر پڑے بجلی
ابھی سے میں چمن میں چل کر آباد آشیاں کرلوں

بر آئیں حسرتیں کیا کیا اگر موت اتنی فرصت دے
کہ اک بار اور زندہ شیوۂ عشقِ جواں کرلوں

مجھے دونوں جہاں میں ایک وہ مل جائیں گر اختر
تو اپنی حسرتوں کو بے نیازِ دو جہاں کرلوں

ساغر نظامی

سنہ ۱۹۰۵ء کو علیگڈھ میں پیدا ہوئے۔ اصلی نام محمد صمد یار خاں اور تخلص ساغر، ساغر نظامی کے نام سے ادبی دنیا میں جانے مانے جاتے ہیں۔ سیماب اکبرآبادی کے خاص شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔ استاد کے ساتھ مل کر آگرہ سے رسالہ "پیمانہ" نکالا۔ بعد میں سیماب صاحب سے لڑائی ہو گئی اور تین سال کے بعد رسالہ بند ہو گیا پھر علیگڈھ سے "مستقبل" نکالا، پھر اخبار علیگڈھ پنچ جاری کیا۔ جو بڑی شان سے نکلا۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں میرٹھ میں ادبی مرکز اور سلفر پریس جاری کیا۔ یہیں سے ماہنامہ "ایشیاء" نکالا۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں پونا جا کر شالیمار پکچرز میں ملازم ہو گئے۔ بعد میں بمبئی میں بھی فلمی کام کیا۔ صحافت کے ساتھ ساتھ شاعری بھی جاری رہی۔ "بادۂ مشرق" "صبوحی" اور "رنگ محل" ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

ڈھونڈنے کو تجھے او میرے نہ ملنے والے
وہ چلا ہے جسے اپنا بھی پتہ یاد نہیں

ساغر نظامی

کافر گیسو والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

صبر و سکوں دو دریا ہیں، بھرتے بھرتے بھرتے ہیں
تسکین دل کی بارش ہے، ہوتے ہوتے ہوتی ہے

جینے میں کیا راحت تھی، مرنے میں تکلیف ہے کیا
جب دنیا کیوں ہنستی تھی، اب دنیا کیوں روتی ہے

ساون آئے، پھول کھلے، اک افسردہ یہ بول اٹھا!
جس میں دل کھل جاتے ہیں، وہ برکھا اب ہوتی ہے

رات کے آنسو اے ساغرؔ پھولوں میں بھر جاتے ہیں
صبح چمن اس پانی سے کلیوں کا منھ دھوتی ہے

نغمے ہوا نے چھیڑے فطرت کی بانسری میں
پیدا ہوئیں زبانیں جنگل کی خامشی میں

اس وقت کی اداسی ہے دیکھنے کے قابل
جب کوئی رو رہا ہو، افسردہ چاندنی میں

کچھ تو لطیف ہوتیں گھڑیاں مصیبتوں کی!
تم ایک دن تو ملتے دو دن کی زندگی میں

خالی پڑے ہوئے ہیں پھولوں کے سب صحیفے
رازِ چمن نہاں ہے کلیوں کی خامشی میں

روشؔ صدیقی

اصلی نام شاہد عزیز، تخلص روشؔ۔ پیدائش ۱۹۱۱ء، سہارنپور۔ اور تعلیم گھر پر ہی۔ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں پر قدرت حاصل کی۔ شعری ذوق بچپن ہی سے رہا۔

غزل اور نظم دونوں صنفوں میں ان کا کلام موجود ہے اور جو کچھ بھی انھوں نے لکھا وہ اہمیت اختیار کر گیا۔ اردو ادب میں منفرد جگہ بنانے میں روشؔ صاحب نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔

حرفِ آساں لب آشنا نہ ہوا
میں زمانے کا ہم نوا نہ ہوا

روشؔ صدیقی

عشق دشوار نہیں، خوش نظری مشکل ہے
سہل ہے کوہ کنی، شیشہ گری مشکل ہے

اس میں شامل ہے مرا حسنِ طلب بھی اے دوست
ورنہ اس حسن سے بیدادگری مشکل ہے

لگ گئی دامنِ گیسوئے پریشاں کی ہوا!
ہوش میں آئے نسیمِ سحری مشکل ہے

مسندِ لالہ و ریحاں ہو کہ ہو تختۂ دار
ہم نشیں چارۂ آشفتہ سری مشکل ہے

یہ حقیقت کوئی اربابِ خبر سے پوچھے
کس قدر مرحلۂ بے خبری مشکل ہے

دلِ بیدار کا اب اور ہی عالم ہے روشؔ
لب تک آ جائے فغانِ سحری مشکل ہے

———————

پنڈت آنند نرائن مُلّا

سنہ ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صاحب پنڈت جگت نرائن مُلّا لکھنؤ کے معروف لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ لکھنؤ تہذیب، والد صاحب کی تربیت اور لکھنؤ یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم نے ان کی شخصیت کو بنانے میں مدد کی۔ ایم اے کے بعد ایل ایل بی کی تعلیم حاصل کی۔ اور انگریزی میں ٹیگور، غالب، اور اقبال کے بہت سے اشعار کے ترجمے کئے۔ عرصہ تک وکالت کی اور بعد میں الہ آباد ہائی کورٹ میں جج کے عہدے پر فائز ہوئے۔

شاعری کی ابتدا ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ کسی کو اپنا اُستاد نہیں بنایا۔ اُردو کے عاشق ہیں۔ اُردو کی بے عزتی کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ غزل بڑے اہتمام سے کہتے ہیں۔ ان کے دو مجموعے "جوئے شیر" اور "کچھ ذرّے کچھ تارے" شائع ہو چکے ہیں۔

نظامِ میکدہ ساقی بدلنے کی ضرورت ہے
ہزاروں ہیں صفیں جن میں نہ مے آئی نہ جام آیا

فن اور شخصیت

آنند نرائن مُلّا

خسروِ خاک مبارک ہو وہ دن دور نہیں !
مہر بیں ذرّوں کی ہوں اور چاند ستاروں کی جبیں

وادیٔ نور بنے گی یہی شعلوں کی زمیں !
ابھی مٹی کے فرشتے سے میں مایوس نہیں

دو ہی قانون ہیں طاقت کے، کرم یا بیداد
عدل تو بندۂ مجبور کا اک خوابِ حسیں

صرف چھونے کا گنہگار ہوں اے ساقیٔ بزم
میں نے جو جام اٹھایا تھا وہ رکھا ہے وہیں

ایک ہنگامۂ آتش نفساں بھی ہے حیات
یہ فقط انجمنِ شعلہ رخاں ہی تو نہیں

اب کہیں جاکے ہوئی ہجر کی شب سحر کی شب
آج آنکھوں میں کوئی اشکِ فروزاں بھی نہیں

لبِ تہذیب کا انداز بیاں ہے ورنہ
شکر میں کون سی شے ہے جو شکایت میں نہیں

جنّت اُجڑی ہے تو کیا ہم سے فرشتوں کو بلا
ہم نکالے بھی گئے اور بسائیں بھی ہمیں !

تیری باتوں کا یقیں تو نہ کیا دوست، مگر!
ہائے وہ لذتِ لمحاتِ گریزاں و یقیں !

احسان دانش

۱۹۱۴ء میں قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے ان کے والد کا
نام قاضی دانش علی تھا۔ غربت و افلاس کی زندگی نے تعلیم میں رکاوٹیں
پیدا کیں لیکن اس عالم میں بھی شعر کا دامن تھامے رکھا۔ یہ جب ترک وطن
کر کے لاہور پہنچے تو دوستوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور دامے درمے
مدد کرنا چاہی مگر دانش کی خودداری نے انھیں ایسا کرنے نہیں دیا۔
انھوں نے لاہور میں مزدوری بھی کی اور معماری بھی پہرہ داری بھی کی
اور باغبانی بھی لیکن انھیں کسی نے کبھی رات کے بارہ بجے سے پہلے
اور صبح کو چار بجے کے بعد محو خواب نہیں دیکھا۔ جب دوپہر کو تھک
کر سب مزدور آرام کرتے تو دانش مصروف مطالعہ پائے جاتے۔
ان کے کلام میں غربت، افلاس اور بھوک کی کربناک زندگی کا
ہر پہلو نمایاں رہتا ہے۔ دانش تہذیبی اور سماجی اقدار کے پرستار
اور نظم نگاری کے قافلہ سالار سمجھے جاتے ہیں۔ لاہور میں مقیم ہیں اور
کئی مجموعے اردو دنیا کو دے چکے ہیں۔

دانش ہم اہل غم نے انھیں دل میں رکھ لیا
جو خشک پھول لائقِ دستار بھی نہ تھے

فن اور شخصیت

احسان دانشؔ

مانا کہ ہم بُرے تھے وفادار بھی نہ تھے
لیکن خدا گواہ زبوں کار بھی نہ تھے

ہم اُن کے سامنے تھے، مگر مثلِ آئینہ
گستاخیٔ نظر کے گنہگار بھی نہ تھے

ہاتھوں پہ زخم لے کے چلے روشنی میں ہم
جب شامِ غم میں، صبح کے آثار بھی نہ تھے

تم نے انھیں کی راہ میں سورج اُگا دیے
جو طالبانِ سایۂ دیوار بھی نہ تھے

آخر انھیں بھی مل ہی گئی منزلِ مراد
جن قافلوں میں قافلہ سالار بھی نہ تھے

دانشؔ ہم اہلِ غم نے انھیں دل میں رکھ لیا
جو خشک پھول لائقِ دستار بھی نہ تھے

.....

احسان دانش

جب جوانی کی دھوپ ڈھلتی ہے　　خودسری سر جھکا کے چلتی ہے
یاس میں ان کے لطف کی امید　　ظلمتوں میں کرن مچلتی ہے

اُف وہ معذوریٔ نگاہ کہ جب　　زندگی بندگی میں ڈھلتی ہے
دل سلگتا نہ ہو بہاروں کا　　اشکِ شبنم سے لو نکلتی ہے

لامکاں کے لئے عروسِ حیات　　موت کے بھیس میں نکلتی ہے
تجربہ ہے کہ دشمنی اکثر　　دوستی کے لہو سے پلتی ہے

ہوشیار اے وفا کے دیوانے　　یہ وفا آنسوؤں میں ڈھلتی ہے
تھک گیا چاند سو چکے تارے　　اب تو آؤ کہ رات ڈھلتی ہے

شامِ غم میں خیال ہے اُن کا　　اور جنگل میں آگ جلتی ہے
یاس لے بیٹھتی ہے کشتی کو　　آس ساحل پہ ہاتھ ملتی ہے

بعض اوقات دل کی دنیا بھی　　آنکھ کے فیصلوں پہ چلتی ہے
مسجدوں میں سکوت کیا معنی　　میکدوں میں شراب ڈھلتی ہے

عشرتِ بے ثبات کی لَو میں　　جسم ہنستا ہے روح جلتی ہے
دَورِ حاضر کی دوستی احسانؔ
کس قدر جلد رُخ بدلتی ہے

احسان دانش

جو ترے آستاں سے لوٹ آئے
جنتِ دو جہاں سے لوٹ آئے
بندگی کے مقام سے آگاہ
سرحدِ لامکاں سے لوٹ آئے
ماہ و انجم کے ساتھ تھے ہم بھی
ہم مگر درمیاں سے لوٹ آئے
لگ گیا جی قفس میں جن جن کا
بارہا آشیاں سے لوٹ آئے
اب تو کعبے میں روشنی کر دو
اب تو کوئے بتاں سے لوٹ آئے
جن گلوں کو جہاں سے نسبت تھی
حلقۂ گلستاں سے لوٹ آئے
آ رہی ہے اِک آشنا آواز
بے خودی ہم کہاں سے لوٹ آئے
ہائے جو گردِ راہ ہیں اب تک
وائے جو کارواں سے لوٹ آئے
دیر و کعبہ سے ان کے دیوانے
ناخوش و سرگراں سے لوٹ آئے
کاش احساںؔ و خلدِ رعنائی
ارضِ ہندوستاں سے لوٹ آئے

پنڈت ہری چند اختر

وطن ہوشیار پور۔ تقسیم ملک تک، لاہور میں مقیم رہے۔ فارسی میں منشی فاضل اور انگریزی میں ایم اے کیا۔ شروع ہی سے مضمون نگاری اور شعر و شاعری سے نہایت درجہ لگاؤ رہا۔ فارسی میں بہت سے مضامین رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور میں وقتاً فوقتاً لکھے۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے سن شعور کے بعد ابتدا میں چند سال تک اخبار نویسی کی۔ بعد ازاں دفتر پنجاب اسمبلی اور محکمۂ اطلاعات میں کام کیا۔ دوسری جنگِ عظیم میں سرکار انگریزی کے جنگی پراپگنڈے کے محکمے سے متعلق رہے۔ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ غزل گوئی میں اپنی انفرادیت رکھتے تھے اور غزل میں انھوں نے روایتی غزل سے ہٹ کر بڑے چونکا دینے والے مضامین نظم کئے ہیں۔ نہایت ہی ذہین اور حاضر جواب تھے۔ مشاعروں کی اناؤنسنگ میں اپنا جواب آپ تھے۔ ان کا انتقال یکم جنوری ۱۹۵۸ء کو ہوا

رہے دو دو فرشتے ساتھ اب انصاف کیا ہوگا
کسی نے کچھ لکھا ہوگا، کسی نے کچھ لکھا ہوگا

ہری چند اختر

شباب آیا کسی بت پر فدا ہونے کا وقت آیا
مری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا

انھیں دیکھا تو زاہد نے کہا ایمان کی یہ ہے
کہ اب انسان کو سجدہ روا ہونے کا وقت آیا

تکلم کی خموشی کہہ رہی ہے حرفِ مطلب سے
کہ اشک آمیز نظروں سے ادا ہونے کا وقت آیا

ہمیں بھی آ پڑا ہے دوستوں سے کام کچھ، یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

○

ملے گی شیخ کو جنت ہمیں دوزخ عطا ہوگا
بس اتنی بات ہے جس کے لیے محشر بپا ہوگا

تری دنیا میں صبر و شکر سے ہم نے بسر کر لی
تری دنیا سے بڑھ کر بھی تری دوزخ میں کیا ہوگا

بھروسہ کس قدر ہے تجھ کو اختر اس کی رحمت پر
اگر وہ شیخ صاحب کا خدا نکلا تو کیا ہوگا

عرش ملسیانی

حضرت داغ کے شاگردوں میں جوش ملسیانی کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی طرح عرش صاحب جو جوش کے صاحبزادے ہیں داغ کے اسکول سے ہی ہوئے لیکن عرش صاحب کا ذہن تخلیقی رہا ہے تقلیدی نہیں، اس لئے ان کے کلام میں کلاسیکیت کے رچاؤ کے ساتھ ساتھ عصر کی بوباس بھی ہے۔

عرش ۱؍ستمبر ۱۹۰۸ء کو ملسیان ضلع جالندھر (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ انٹر کرنے کے بعد انجینئرنگ کا کورس کیا اور ملازمت اختیار کی لیکن یہ ملازمت صرف ایک سال کے عرصے تک جاری رہی۔ اس کے بعد انھوں نے لدھیانہ میں ایک اور ملازمت کی اور ساتھ ہی بی اے کے لئے اسٹڈی بھی کرتے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں بی اے کی ڈگری لیکر دلی چلے آئے۔ پہلے تو جوش ملیح آبادی کے رفیق کار رہے۔ پھر ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد "آجکل" کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ پنجاب حکومت نے انھیں تین برس تک راج کوی رکھا۔ ان کے مجموعے ہفت رنگ، چنگ و آہنگ شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہوا اور ہندی میں بھی ان کی دو ایک کتابیں چھپ چکی ہیں۔

کسی کو کوئی کیا دے گا سب محتاج خالق ہیں
درِ انساں پہ لاحاصل ہے انساں کی جبیں سائی

فن اور شخصیت

عرش ملسیانی

دلِ فسردہ پہ سو بار تازگی آئی!
مگر وہ یاد کہ جب آ کر نہ پھر کبھی آئی

چمن میں کون ہے پرسانِ حال شبنم کا
غریب روئی تو غنچوں کو بھی ہنسی آئی!

عجب نہ تھا کہ غمِ دل شکست کھا جاتا
ہزار شکر ترے لطف میں کمی آئی

دیے جلائے امیدوں نے دل کے گرد بہت
کسی طرف سے نہ اس گھر میں روشنی آئی

ہزار دید پہ پابندیاں تھیں پردے تھے
نگاہِ شوق مگر اُن کو دیکھ ہی آئی!

کسی طرح نہ مٹا عرشؔ داغِ کفرانا
ہمارے کام نہ سجدے نہ بندگی آئی

......

محمد دین نام ۔ تاثیر تخلص ۔ ۲۰ فروری ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے
آبائی وطن کشمیر ہے ۔ ابھی وہ دو ہی برس کے تھے کہ ماں باپ
دونوں کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ پھر ان کی پرورش ان کے خالو نے
کی اور اعلیٰ تعلیم دلوائی ۔ کیمبرج یونیورسٹی سے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری
حاصل کی ۔ انھوں نے شادی ایک یوروپین لیڈی سے کی جنھوں نے مسلمان
ہو کر اپنا نام بلقیس تاثیر رکھا ۔ نکاح ڈاکٹر اقبال نے پڑھا اور نکاح
نامے پر اپنے دستخط بھی کئے ۔

انگلینڈ سے واپسی پر آزاد کشمیر چلے گئے اور وہاں ملازمت
اختیار کر لی ۔ آخر میں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل ہو گئے تھے ۔ ۳۰ نومبر
سنہ ۱۹۵۰ء کو انتقال کیا ۔ گورنمنٹ نے ان کے پسماندگان کو وظیفہ مقرر کر دیا ۔
"آتش کدہ" ان کے کلام کا مجموعہ ہے جسے ان کی بیوی نے ان کے انتقال
کے ڈھائی برس بعد شائع کیا ۔ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ "عزیزم کے نام"
بھی چھپ چکا ہے ۔ "کنول" بھی ان کی ایک کتاب ہے ۔

دل نے آنکھوں سے کہی آنکھوں نے دل سے کہہ دی
بات چل نکلی ہے اب دیکھئے کہاں تک پہونچے

تاثیر

میری وفائیں یاد کروگے
روؤ گے، فریاد کروگے

مجھ کو تو برباد کیا ہے
اور کسے برباد کرو گے!

ہم بھی ہنسیں گے تم پر اک دن
تم بھی کبھی فریاد کرو گے

محفل کی محفل ہے غمگیں
کس کس کا دل شاد کروگے

دشمن تک کو بھول گئے ہو
مجھ کو تم کیا یاد کرو گے

ختم ہوئی دشنام طرازی
یا کچھ اور ارشاد کرو گے

جا کر بھی ناشاد کیا تھا
آ کر بھی ناشاد کرو گے

چھوڑو بھی تاثیر کی باتیں
کب تک اس کو یاد کروگے

سیف الدین نام۔ سیفؔ تخلص امرتسر کے رہنے والے
مارچ ۱۹۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ دسویں جماعت میں پڑھتے
تھے کہ خاکسار تحریک میں شامل ہونے کی پاداش میں دو سال
کی قید ہوگئی۔ چھوٹ کر آئے اور کالج میں داخل ہوئے تو
وہاں سے بھی لڑ کر خارج ہوئے۔ اس لئے تعلیم ہی کو
خیرباد کہا اور معاش کی تلاش میں دہلی سے کشمیر تک گئے
آخر میں فلمی گانے بھی لکھے۔ چنانچہ انہوں نے اسی کام
کو ہی اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ غزل گو شعراء میں ممتاز مقام
رکھتے ہیں۔ کلام کے مجموعے کا نام "خم کاکل" ہے۔

تیری زلفوں کو چھیڑتی تھی صبا
خود پریشان ہو گئی ہوگی

سیف الدین سیف

○

بڑے خطرے میں ہے حسنِ گلستاں ہم نہ کہتے تھے
چمن تک آ گئی دیوارِ زنداں ہم نہ کہتے تھے

بھرے بازار میں جنسِ وفا بے آبرو ہوگی
اُٹھے گا اعتبارِ کوئے جاناں ہم نہ کہتے تھے

اسی رستے میں آخر وہ کڑی منزل بھی آئے گی
جہاں دم توڑ دے گی یادِ یاراں ہم نہ کہتے تھے

دلِ فطرت شناس آخر کہیں یونہی دھڑکتا ہے
فریبِ حسن ہے، جشنِ چراغاں ہم نہ کہتے تھے

○

راہ آسان ہو گئی ہو گی
جان پہچان ہو گئی ہو گی

پھر پلٹ کر نگہ نہیں آئی
تجھ پہ قربان ہو گئی ہو گی

تیری زلفوں کو چھیڑتی تھی صبا
خود پریشان ہو گئی ہو گی

اُن سے بھی چھین لو گے یاد اپنی
جن کا ایمان ہو گئی ہو گی

مرنے والوں پہ سیفؔ حیرت کیوں
موت آسان ہو گئی ہو گی

سیف

○

قریب موت کھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ
فضا سے آنکھ لڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

تھکی تھکی سی فضائیں بجھے بجھے تارے
بڑی اداس گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

نہیں امید کہ ہم آج کی سحر دیکھیں
یہ رات ہم پہ کڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

ابھی نہ جاؤ کہ تاروں کا دل دھڑکتا ہے
تمام رات پڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

عروس شام ابھی گیسوؤں کے سائے میں
کنیز بن کے کھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

پھر اس کے بعد کبھی ہم نہ تم کو روکیں گے
لبوں پہ سانس اڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

دم فراق میں جی بھر کے تم کو دیکھ تو لوں
یہ فیصلے کی گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

سیف

○

دلوں کو توڑنے والو تمہیں کسی سے کیا
ملو تو آنکھ چرا لو تمہیں کسی سے کیا

ہماری لغزشِ پا کا خیال کیوں ہے تمہیں؟
تم اپنی چال سنبھالو تمہیں کسی سے کیا

چمک کے اور بڑھا دو مری سیہ بختی
کسی کے گھر کے اجالو! تمہیں کسی سے کیا

نظر بچا کے گزر جاؤ میری تربت سے
کسی پہ خاک نہ ڈالو تمہیں کسی سے کیا

مجھے خود اپنی نظر میں بنا کے بیگانہ
جہاں کو اپنا بنا لو تمہیں کسی سے کیا

قریبِ نزع بھی کیوں چین لے سکے کوئی
نقاب رخ سے اٹھا لو تمہیں کسی سے کیا

○

غمِ خزاں کی تلافی بہار میں بھی نہیں
کہ اب نگاہ ترے انتظار میں بھی نہیں

تری نگاہ سے بدلی ہے کس طرح دنیا
جو دل کشی تھی خزاں میں بہار میں بھی نہیں

بھڑک اٹھی ہے کچھ اس طرح آتشِ ہستی
قرار سایۂ دامانِ یار میں بھی نہیں

عجیب سکون کا عالم ہے یاس کا عالم
یہ دل کشی تو غمِ انتظار میں بھی نہیں

ہلاکِ جبرِ مسلسل یہی سمجھتے ہیں
نظامِ دہر ترے اختیار میں بھی نہیں

عبدالحمید عدمؔ

عدمؔ کا نام اور کلام دونوں مشہور ہیں۔ خاص طور پر چھوٹی بحروں میں ان کی جو غزلیں ہیں وہ اردو شاعری کا ایک خاص سرمایہ ہے۔ زبان و بیان کی شوخی و سادگی نے انھیں خاص و عام کا مقبول شاعر بنا دیا ہے۔ شراب اور شراب خانہ عدمؔ کی زندگی اور شاعری ہیں۔ عدمؔ دراصل اسی مکتب سے تعلق رکھتے ہیں جس کی بنیاد صدیوں پہلے عمر خیام نے ڈالی تھی۔

ان کا آبائی وطن تلونڈی موسیٰ خاں تحصیل و ضلع گوجرانوالہ ہے لیکن ان کی پیدائش لائلپور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم لاہور میں اس کے بعد ایس اے ایس کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ سنہ ۱۹۶۶ء تک ڈپٹی اسسٹنٹ کنٹرولر کے عہدے پر فائز رہے ان کی تصانیف کی تفصیل یہ ہے۔ خرابات، گردش جام، رم آہو، شہر خوباں قیصر شیریں، شہر فرہاد، دو جام، جنس گراں، پیچ و خم، قول و قرار، زیر لب اور متعدد دیگر۔ عدم نے زیادہ تعداد میں شعر کہے ہیں۔ زود نویسی بری چیز نہیں تو اچھی چیز بھی نہیں ہے۔ فن شاعری کے لحاظ سے عدمؔ پھر بھی بڑے شاعر ہیں۔

میں میکدے کی راہ سے ہو کر گذر گیا
ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا

عبدالحمید عدم

آگہی کے فیض سے سادہ دلی جاتی رہی
ہر طلسمِ آرزو کی دلکشی جاتی رہی

دل کو تیری ذات سے جو ربطِ پنہاں تھا کبھی
وہ تو اب بھی ہے مگر اُس کی خوشی جاتی رہی

چھوٹی چھوٹی رنجشیں اک حادثہ سا بن گئیں
چھوٹی چھوٹی رنجشوں سے دوستی جاتی رہی

انقطاعِ راہ و رسمِ دوستی سے اے عدمؔ
کم سے کم اک بے وفا کی بدظنی جاتی رہی

○

محشر میں اک سوال کیا تھا کریم نے
مجھ سے وہاں بھی آپ کی تعریف ہو گئی

دل سے رنگین صورتیں نہ گئیں
زندگی کی ضرورتیں نہ گئیں

اُلٹے اُلٹے مطالبات نہ کر
زندگی اس قدر حسیں بھی نہیں

عبدالحمید عدم

○

میکدہ تھا چاندنی تھی میں نہ تھا
اک مجسّم بے خودی تھی میں نہ تھا

عشق جب دم توڑتا تھا تم نہ تھے
موت جب سر دُھن رہی تھی میں نہ تھا

طور پر چھیڑا تھا جس نے آپ کو
وہ مری دیوانگی تھی میں نہ تھا

وہ حسیں بیٹھا تھا جب میرے قریب
لذّتِ ہمسائگی تھی میں نہ تھا

میکدے کے موڑ پر رُکتی ہوئی
مدّتوں کی تشنگی تھی میں نہ تھا

میں اور غنچہ دہن کی آرزو
آرزو کی سادگی تھی میں نہ تھا

گیسوؤں کے سائے میں آرام کش
سر برہنہ زندگی تھی میں نہ تھا

دیر و کعبہ میں عدم حیرت فروش
دو جہاں کی بدظنی تھی میں نہ تھا

○

عہدِ مستی ہے لوگ کہتے ہیں
مے پرستی ہے لوگ کہتے ہیں

غمِ ہستی خریدنے والو
موت سستی ہے لوگ کہتے ہیں

ہم جہاں جی رہے ہیں مر مر کر
بزمِ ہستی ہے لوگ کہتے ہیں

ضبط تو یہ پہ آ رہی ہے ہنسی
تنگ دستی ہے لوگ کہتے ہیں

شاید اک بار اُجڑ کے پھر نہ بسے
دل کی بستی ہے لوگ کہتے ہیں

کیا کریں مہ وشوں سے پیار عدم
بت پرستی ہے لوگ کہتے ہیں

ان مست انکھڑیوں کو کنول کہہ گیا ہوں میں
محسوس ہو رہا ہے غزل کہہ گیا ہوں میں

ساقی! تری نگاہ کو کتنے غرور سے
ہر حادثے کا ردِ عمل کہہ گیا ہوں میں

کہتے ہیں زندگی جسے اس حرفِ تلخ کو
سمجھا نہیں تو زہرِ اجل کہہ گیا ہوں میں

کہتے ہیں زندگی جسے اے مرگِ ناگہاں
اس اتفاق کو بھی اٹل کہہ گیا ہوں میں

قسمت کی الجھنوں کو عدم کس گریز سے
اس گیسوئے دراز کا بل کہہ گیا ہوں میں

غمِ محبت ستا رہا ہے، غمِ زمانہ مسل رہا ہے
مگر مرے دن گزر رہے ہیں مگر مرا وقت ٹل رہا ہے

وہ ابر آیا وہ رنگ برسے وہ کیف جاگا وہ جام کھنکے
چمن میں یہ کون آ گیا ہے تمام موسم بدل رہا ہے

مری جوانی کے گرم لمحوں پہ ڈال دے گیسوؤں کا سایہ
یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو تمام ماحول جل رہا ہے

یہ بھینی بھینی سی مست خوشبو یہ ہلکی ہلکی سی دلنشیں بو
یہیں کہیں تیری زلف کے پاس کوئی پروانہ جل رہا ہے

نہ دیکھ او مہ جبیں مری سمت اتنی مستی بھری نظر سے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے شراب کا دور چل رہا ہے

عدم خرابات کی سحر ہے کہ بارگاہِ رموزِ مستی
ادھر بھی سورج نکل رہا ہے ادھر بھی سورج نکل رہا ہے

شاد عارفی

نام احمد علی خاں تھا۔ لوہارو میں پیدا ہوئے لیکن عمر کا بیشتر حصہ رام پور میں بسر ہوا۔ ۸ فروری ۱۹۶۴ء کو وہیں انتقال کیا۔ انتقال کے وقت عمر ساٹھ سے کچھ اوپر ہی تھی۔ مظفر حنفی نے ان کے فکر و فن پر متعدد کتابیں مرتب کر کے شائع کی ہیں۔ زندگی میں کلام کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا اور ایک مختصر سا انتخاب انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ نے چھاپا تھا۔

اُس نے چاہا جسے سرفرازِ سخن
اُس کے حصّے میں دنیا کا غم رکھ دیا

شاد عارفی

تمہیں رہبر سمجھنا پڑ گیا ہے
ہماری بے کسی کی انتہا ہے

ہماری جرأتوں پر وہ ہنسا ہے
ہنسا، لیکن پسینہ آ گیا ہے

میں اپنے لفظ واپس لے رہا ہوں
یہ رہزن تھا، میں سمجھا رہنما ہے

برابر ہیں فغان و درد و نغمہ
یہ آزادی نہیں تو اور کیا ہے

یہی ہے شاد میں سب سے بڑا عیب
وہی لکھتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے

○

روشن ہے ماحول کا چہرہ، دل پر ظلمت طاری ہے
ظاہر پر تارے چھٹکے ہیں، باطن میں اندھیاری ہے

ناجائز پیسے کی اُجلی تعمیروں کے ماتھے پر!
آپ نے لکھا دیکھا ہوگا یہ سب فضلِ باری ہے

پیرِ میخانہ کی نظریں تکتے ہیں ساقی کے ہاتھ
ہم مجبوروں کی میخواری مانگے کی میخواری ہے

شاعر سے یوں جان بچائے پھرتے ہیں سنجیدہ لوگ
گویا ذوقِ شعری اُڑ کر لگنے کی بیماری ہے

شاد کئی "پس ماندہ شاعر" آزادی مل جانے پر
آنکھیں مل کر پوچھ رہے ہیں "خواب ہے یا بیداری ہے"

گیارہواں باب

نام	پیدائش	وفات
فیض احمد فیض	۱۹۱۱	
اسرار الحق مجاز	۱۹۱۱	۱۹۵۵
معین احسن جذبی	۱۹۱۲	
مخدوم محی الدین	۱۹۰۷	۱۹۶۹
سردار جعفری	۱۹۱۳	
جاں نثار اختر	۱۹۱۴	۱۹۷۶
احمد ندیم قاسمی	۱۹۱۶	
کیفی اعظمی	۱۹۲۰	
ساحر لدھیانوی	۱۹۲۲	
علی جواد زیدی	۱۹۲۰	
مجروح سلطانپوری	۱۹۱۹	
غلام ربانی تاباں	۱۹۱۴	
سکندر علی وجد	۱۹۱۴	

نام	پیدائش	وفات
اعجاز صدیقی	۱۹۱۱	۱۹۷۸
شمیم کرہانی	۱۹۱۶	
خورشید احمد جامی	۱۹۱۵	
نازش پرتاب گڑھی	۱۹۲۲	
نشور واحدی	۱۹۱۲	
قتیل شفائی	۱۹۱۹	
مجید امجد	۱۹۱۴	
گوپال متل	۱۹۰۹	
میکش اکبر آبادی	۱۹۰۵	
آل احمد سرور	۱۹۱۲	
جگن ناتھ آزاد	۱۹۱۸	
سلام مچھلی شہری	۱۹۲۲	
اختر سعید	۱۹۲۳	

سیف الدین سیف

بڑے خطرے میں ہے حسنِ گلستاں ہم نہ کہتے تھے
چمن تک آ گئی دیوارِ زنداں ہم نہ کہتے تھے

بھرے بازار میں جنسِ وفا بے آبرو ہو گی
اٹھے گا اعتبارِ کوئے جاناں ہم نہ کہتے تھے

اسی رستے میں آخر وہ کڑی منزل بھی آئے گی
جہاں دم توڑ دے گی یادِ یاراں ہم نہ کہتے تھے

دلِ فطرت شناس آخر کہیں یونہی دھڑکتا ہے
فریبِ حسن ہے، جشنِ چراغاں ہم نہ کہتے تھے

○

راہ آسان ہو گئی ہو گی
جان پہچان ہو گئی ہو گی

پھر پلٹ کر نگہ نہیں آئی
تجھ پہ قربان ہو گئی ہو گی

تیری زلفوں کو چھیڑتی تھی صبا
خود پریشان ہو گئی ہو گی

ان سے بھی چھین لو گے یاد اپنی
جن کا ایمان ہو گئی ہو گی

مرنے والوں پہ سیفؔ حیرت کیوں
موت آسان ہو گئی ہو گی!

فیض احمد فیض

ترقی پسند تحریک کے ساتھ اُبھرنے والے شاعروں میں سب سے نمایاں مقام فیض کا ہے۔ اُن کی شاعری جہاں خواص کو متاثر کرتی ہے وہاں عوام کو بھی اپنا رسیا بنا لیتی ہے۔ اسی خوبی کی بنا پر آج تک ان کی عزت اور شہرت کے قد تک ان کا کوئی بھی ہمعصر نہیں پہنچ سکا۔ اور یہ اعزاز بھی انھیں حاصل ہے کہ اقبال اور غالب کے بعد ان کا ہی کلام مختلف زبانوں میں زیادہ تعداد میں منتقل ہوا۔ آج یہ عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔

اصلی نام فیض احمد اور فیض تخلص، ان کی پیدائش ۱۹۱۱ء میں سیالکوٹ میں ہوئی۔ انگریزی اور عربی سے ایم اے پاس کیا۔ شاعری کے علاوہ تنقید سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں جدید اور انقلابی تصورات، فلسفیانہ تخیلات و تفکرات کا ایک سمندر موجزن ہے۔

۱۹۳۶ء میں ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی کے لیکچرر مقرر ہوئے اور پہلی بڑی جنگ کے زمانے میں فوج میں کرنل تھے۔ پاکستان بننے کے بعد یہ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر بنے۔ راولپنڈی کے مقدمہ سازش کے سلسلے میں جیل میں بھی رہے۔ انھیں مشہور ادبی لینن انعام بھی مل چکا ہے۔

"نقش فریادی" "دست صبا" "زنداں نامہ" "دست تہ سنگ" ان کی شاعری کے مجموعے ہیں۔ چند ادبی رسائل نے ان پر نمبر بھی شائع کئے اور اب ہندوستان میں پہلی بار ان کی شخصیت اور شاعری کے شایانِ شان رسالہ فن اور شخصیت ایک بھرپور اور ضخیم نمبر پیش کرے گا۔

مقامِ فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فیض احمد فیض

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں

ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر!
کچھ کچھ سحر کے رنگ پر افشاں ہوئے تو ہیں

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

ہاں کج کرو کلاہ کہ سب کچھ لٹا کے ہم
اب بے نیازِ گردشِ دوراں ہوئے تو ہیں!

اہلِ قفس کی صبحِ چمن میں کھلے گی آنکھ
بادِ صبا سے وعدہ و پیماں ہوئے تو ہیں

ہے دشت اب بھی دشت مگر خونِ پا سے فیض
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

○

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھولے سے مسکرا تو دیے تھے وہ آج فیض
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

فیض احمد فیض

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

دوستو اُس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصوّر نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

محتسب کی خیر اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، پیمانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے غریبانِ چمن !
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

فیضؔ اُن کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنھیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

٭٭٭

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم
گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم
خوشا نظارۂ رخسارِ یار کی ساعت
خوشا قرارِ دلِ بے قرار کا موسم
حدیثِ بادۂ ساقی نہیں تو کس مصرف
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار کا موسم
نصیبِ صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے
یہ رقصِ سایۂ سرو و چنار کا موسم
یہ دل کے داغ تو دُکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم
یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم
قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے، بہار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

فیض احمد فیض

○

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

کئی بار اس کی خاطر ذرے ذرے کا جگر چیرا
مگر یہ چشمِ حیراں جس کی حیرانی نہیں جاتی

نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

سرِ خسرو سے نازِ کجکلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

○

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں !

حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن
تو چشمِ صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

فیض احمد فیض

○

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گذری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گذری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گذری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گذری ہے

نہ گُل کھلے ہیں، نہ اُن سے ملے، نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گذری ہے

چمن میں غارتِ گلچیں پہ جانے کیا گذری
قفس سے آج صبا بے قرار گذری ہے

○

وہیں ہیں دل کے قرائن تمام کہتے ہیں
وہ اک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں

تم آرہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

یہی کنارِ فلک کا سیہ تریں گوشہ
یہی ہے مطلعِ ماہِ تمام کہتے ہیں

پیو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

فقیہہِ شہر سے مئے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

نوائے مرغ کو کہتے ہیں اب زیانِ چمن
کھلے نہ پھول اسے انتظام کہتے ہیں

کہو تو ہم بھی چلیں فیض اب نہیں سرِ دار
وہ فرقِ مرتبۂ خاص و عام کہتے ہیں

اسرار الحق مجازؔ

مجازؔ اُردو شاعری کا کیٹس (KEATS) ہے۔
مجازؔ کی شاعری ترقی پسند تحریک کی شان ہے۔
مجازؔ کی نظم نے اپنے ہم عصروں میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔
مجازؔ کو شراب نے مارا۔
مجازؔ کی زندگی میں اور اس کے مرنے کے بعد اس کے متعلق کچھ ایسی ہی باتیں خاص و عام میں مشہور ہیں اور ان باتوں کے ساتھ ہی ساتھ اس کی نظمیں اور اس کے شعر بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ وہ انقلاب کا مغنی ہے اور اس کی شاعری میں ایک ایسی دلنوازی نغمگی ہے جو کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے۔ اس نے اپنی نوجوانی ہی میں قبولِ عام کی سند حاصل کر لی تھی۔ زبان و بیان کی سادگی، پرکاری اور مواد کی زندگی سے قربت نے مجازؔ کی شاعری کو ادب کے محدود حلقوں سے نکال کر عوام تک پہنچایا۔ آج مجازؔ نہیں ہے مگر اس کے قلم سے نکلے ہوئے لفظ اس کی آواز بن کر لاکھوں دلوں کی دھڑکنوں کو چھیڑتے اور تڑپاتے رہتے ہیں۔

چھُپ گیا وہ سازِ ہستی چھیڑ کر ٭ اب تو بس آواز ہی آواز ہے

مجازؔ کے والد چودھری سراج الحق اودھ ضلع بارہ بنکی قصبہ ردولی کے رہنے والے تھے۔ ردولی ہی میں مجاز ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کیا اور اس کے بعد شاعری کے میدان میں بھی اسے نمایاں ہی کامیابیاں نصیب ہوتی رہیں۔ جہاں بھی مجاز پہنچ جاتا لوگ اُسے گھیر لیتے، وہ ادبی محفلوں کی جان سمجھا جاتا تھا۔ اس میں تمام اخلاقی خوبیاں موجود تھیں لیکن شراب نے اُسے اپنی زلف کا اسیر بنا لیا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کی۔ ریڈیو کے آرگن "آواز" کے مدیر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ اس میگزین کو اس لحاظ سے مجازؔ کی یادگار کہا جا سکتا ہے کہ یہ نام مجاز ہی نے تجویز کیا تھا اور یہ مختلف زبانوں میں آج تک نکل رہا ہے۔ "شب تاب" اور "آہنگ مجاز" چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ مجازؔ کا ترانہ آج بھی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں گایا جاتا ہے۔ ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء کو یہ ہردلعزیز شاعر دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔

اسرار الحق مجاز

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہیے بہلا بھی گئے، تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ سُن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگیِ وحشت کی قسم حیرت کی قسم حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں، ہم رازِ تبسم پا بھی گئے

رودادِ غمِ الفت اُن سے ہم کیا کہتے کیونکر کہتے
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہیے کیا کیا گزری
آئے تھے سوادِ الفت میں، کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اُٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اس محفلِ کیف و مستی میں، اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے، ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

○

کیا تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے اب اُن کی جفا کو کیا کہیے!
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

※

مجھ کو یہ آرزو وہ اُٹھائیں نقاب خود
اُن کو یہ انتظار تقاضا کرے کوئی

فن اور شخصیت

اسرار الحق مجاز

○

مری وفا کا ترا لطف بھی جواب نہیں
مرے شباب کی قیمت ترا شباب نہیں

یہ ماہتاب نہیں ہے کہ آفتاب نہیں
سبھی ہے حسن، مگر عشق کا جواب نہیں

مری نگاہ میں جلوے ہیں جلوے ہی جلوے
یہاں حجاب نہیں ہے یہاں نقاب نہیں

جنوں بھی حد سے سوا شوق بھی ہے حد سے سوا
یہ بات کیا ہے کہیں مورد عتاب نہیں

یہاں تو حسن کا دل بھی ہے غم سے صد پارہ
میں کامیاب نہیں وہ بھی کامیاب نہیں

یہاں تو رات کی بیداریاں مسلم ہیں
مگر وہاں بھی حسیں انکھڑیوں میں خواب نہیں

نہ پوچھئے مری دنیا کو میری دنیا میں
خود آفتاب بھی ذرہ ہے آفتاب نہیں

سبھی ہیں میکدۂ دہر میں خرد والے
کوئی خراب نہیں ہے کوئی خراب نہیں

مجاز کس کو میں سمجھاؤں کوئی کیا سمجھے
کہ کامیابِ محبت بھی کامیاب نہیں

○

شوق کے ہاتھوں اے دلِ مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا
عشق تو رسوا ہو ہی چکا ہے حسن بھی کیا رسوا ہوگا

حسن کو بزمِ خاص میں جا کر اس سے زیادہ کیا ہوگا
کوئی نیا پیماں باندھیں گے کوئی نیا وعدہ ہوگا

چارہ گری سر آنکھوں پر اس چارہ گری سے کیا حاصل
درد کہ اپنی آپ دوا ہے تم سے اچھا کیا ہوگا

واعظ سادہ لوح سے کہہ دو چھوڑے عقبیٰ کی باتیں
اِس دنیا میں کیا رکھا ہے اُس دنیا میں کیا ہوگا

ڈاکٹر معین احسن جذبی

معین احسن نام اور جذبی تخلص ہے۔ ۲۱ اگست ۱۹۱۲ء کو ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ دادا ڈاکٹر عبدالغفور ایک شاعر تھے اور مظہر قلمی نام سے شاعری کرتے تھے۔ گھر کا سارا ماحول ادبی تھا۔ بچپن ہی میں شعر گوئی کا شوق ہوا اور ۱۶ برس کی عمر میں تو باقاعدہ غزلیں کہنے لگے۔

جذبی نے اپنی زندگی میں بڑی صعوبتیں جھیلیں مگر مایوسی کو قریب پھٹکنے نہ دیا اور مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ آخر کار ایم اے کیا۔ اس کے بعد بھی انھیں عرصے تک نوکری کے لئے کوشاں رہنا پڑا۔ ادب کے میدان میں بھی انھیں ابتدا میں نظر انداز کیا گیا۔ پہلی مرتبہ ماہنامہ "ہمایوں" لاہور میں جب ان کی غزل چھپی تو قاری ہی نہیں ادیب، شاعر اور نقاد بھی متوجہ ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا ایک مقام بنالیا۔ ترقی پسند تحریک کے اہم ستون مانے جاتے ہیں۔ نئی غزل کو فروغ دینے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ آج کل علی گڑھ میں ہیں۔ "فروزاں" نام سے ان کی شاعری کا ایک مجموعہ ادبی دنیا میں کافی مشہور ہوا۔

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جذبی

○

ملے مجھکو غم سے فرصت تو سناؤں وہ فسانہ
کہ ٹپک پڑے نظر سے مئے عشرتِ شبانہ

یہی زندگی مصیبت، یہی زندگی مسرّت
یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانہ

کبھی درد کی تمنا، کبھی کوششِ مداوا
کبھی بجلیوں کی خواہش کبھی فکرِ آشیانہ

مرے قہقہوں کی زد پر کبھی گردشیں جہاں کی
مرے آنسوؤں کی رَو میں کبھی تلخیٔ زمانہ

مری رفعتوں سے لرزاں کبھی مہر و ماہ و انجم
مری پستیوں سے خائف کبھی اوجِ خسروانہ

کبھی میں ہوں تجھ سے نالاں کبھی مجھ سے تو پریشاں
کبھی میں ترا ہدف ہوں، کبھی تو مرا نشانہ

جسے پا سکا نہ زاہد جسے چھو سکا نہ صوفی
وہی تار چھیڑتا ہے مرا سوزِ شاعرانہ

○

ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں، آہوں میں اشارا کرتے ہیں

کچھ تجھکو پتہ، کیا تجھکو خبر دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکلِ گیتی ہم تجھکو جس طرح سنوارا کرتے ہیں

اے موجِ بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں

کیا جانئے کب یہ پاپ کٹے، کیا جانئے وہ دن کب آئے
جس دن کے لئے ہم اے جذبی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

فن اور شخصیت

معین احسن جذبی

○

بیتے ہوئے دلوں کی حلاوت کہاں سے لائیں
اک میٹھے میٹھے درد کی راحت کہاں سے لائیں

ڈھونڈھیں کہاں وہ نالۂ شب تاب کا جمال
آہِ سحر گہی کی صباحت کہاں سے لائیں

سمجھائیں کیسے دل کی نزاکت کا ماجرا
خاموشیٔ نظر کی خطابت کہاں سے لائیں

ترکِ تعلقات کا ہو جس سے احتمال،
بے باکیوں میں اتنی صداقت کہاں سے لائیں

افسردگیٔ ضبطِ الم آج بھی سہی —
لیکن نشاطِ ضبطِ مسرت کہاں سے لائیں

ہر فتح کے غرور میں بے وجہ بے سبب
احساسِ انفعالِ ہزیمت کہاں سے لائیں

آسودگیٔ لطف و عنایت کے ساتھ ساتھ
دل میں دبی دبی سی قیامت کہاں سے لائیں

وہ جوشِ اضطراب پہ کچھ سوچنے کے بعد
حیرت کہاں سے لائیں ندامت کہاں سے لائیں

ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا
ناآزمودہ کار کی جرأت کہاں سے لائیں

ہے آج بھی نگاہِ محبت کی آرزو
پر ایسی نگاہ کی قیمت کہاں سے لائیں

سب کچھ نصیب ہو بھی تو اے شورشِ حیات
تجھ سے نظر چرانے کی عادت کہاں سے لائیں

معین احسن جذبی

○

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہش دنیا کون کرے

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں سے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبیؔ ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دنیا دنیا کون کرے

○

جسے آج نغمہ سمجھتی ہے دنیا
وہی نغمہ کل تک فغاں ہو نہ جائے

جسے سازِ دوراں پہ گانا نہ آیا
وہ مطرب کہیں نوحہ خواں ہو نہ جائے

بچا کر جسے رکھ لیا ہے جبیں میں
وہ سجدہ بھی نذرِ بتاں ہو نہ جائے

نہ کلیاں ہی چٹکیں نہ تارے ہی چمکے
مرا غم غمِ دو جہاں ہو نہ جائے

مخدوم محی الدین

مخدوم نے غزل کے میدان میں ذرا دیر سے قدم رکھا لیکن جب غزل کہی تو اس میں چار چاند لگا دیئے۔ مخدوم اپنے عہد کے بلند قامت شاعر ہیں اور حیدرآباد میں انکی تقریباً پرستش کیجاتی ہو۔

مخدوم محی الدین کی پیدائش ۱۹۱۰ء میں حیدرآباد (دکن) کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ پانچ برس کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا۔ چچا کی سرپرستی میں مدرسے اور گھر پر کچھ مذہبی تعلیم حاصل کی اور عربی فارسی سیکھی اور ۱۹۳۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا۔ ۱۹۳۳ء سے شعر کہنا شروع کیا۔ ابتدا رومانی نظموں سے ہوئی۔ مگر بہت جلد اقتصادی اور سیاسی حقیقتوں کی طرف مائل ہوئے۔ اسی زمانے میں ایک کتاب "ٹیگور اور ان کی شاعری" لکھی۔ کچھ ڈرامے بھی لکھے ——— ۱۹۴۰ء میں مارکسزم سے روشناس ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں حیدرآباد میں بڑے نامساعد حالات میں انجمن ترقی اردو مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ ادب اور طالب علموں کی تحریک میں حصہ لیتے رہے۔ خفیہ طور پر مارکسی تعلیمات کا ایک حلقہ بنایا پھر کچھ دنوں کی بے روزگاری کے بعد سٹی کالج میں لکچرر ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء میں نوکری چھوڑ کر علانیہ کمیونسٹ پارٹی کے ہمہ وقتی کارکن ہو گئے اور بغاوت کے الزام میں تین مہینے کی جیل کاٹی۔ ۱۹۴۶ء میں سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں روپوش ہو گئے اور تلنگانہ میں کام کرتے رہے۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں گرفتار ہوئے اور دسمبر میں چناؤ سے پہلے رہا ہوئے اور حیدرآباد اسمبلی کے ممبر چنے گئے ۲۵ اگست سنہ ۱۹۶۹ء کو انھوں نے دہلی میں انتقال کیا۔ مخدوم کے تین مجموعہ کلام سرخ سویرا، گل تر، اور بساط رقص شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

مخدوم محی الدین

عشق کے شعلے کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے
دل کے انگارے کو دہکاؤ کہ کچھ رات کٹے

ہجر میں ملنے شب ماہ کے غم آئے ہیں
چارہ سازوں کو بھی بلواؤ کہ کچھ رات کٹے

کوئی جلتا ہی نہیں، کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ، پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

چشم و رخسار کے اذکار کو جاری رکھو
پیار کے نغمے کو دہراؤ کہ کچھ رات کٹے

آج ہو جانے دو ہر ایک کو بدمست و خراب
آج اک ایک کو پلواؤ کہ کچھ رات کٹے

کوہِ غم اور گراں، اور گراں، اور گراں
غم زدو تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

٭

O

گلوئے یزداں میں نوکِ سناں بھی ٹوٹی ہے
کشاکشِ دلِ پیغمبراں بھی ٹوٹی ہے

سراب ہے کہ حقیقت، نظارہ ہے کہ فریب
یقیں بھی ٹوٹا ہے، طرزِ گماں بھی ٹوٹی ہے

ستیا دلِ آئینہ چور چور تو تھی
سیاستِ دلِ آہنگراں بھی ٹوٹی ہے

تمہارے جسم کا سورج جہاں جہاں ٹوٹا
وہیں وہیں مری زنجیرِ جاں بھی ٹوٹی ہے

شکست و ریخت زمانے کی خوب ہے مخدوم
خودی تو ٹوٹی تھی، خوئے بتاں بھی ٹوٹی ہے

٭٭

کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل
تمام رات غزل گائیں دیدِ یار کریں

پھر چھڑی رات، بات پھولوں کی
رات ہے یا برات پھولوں کی

پھول کے ہار پھول کے گجرے
شام پھولوں کی رات پھولوں کی

آپ کا ساتھ، ساتھ پھولوں کا!
آپ کی بات، بات پھولوں کی

نظریں ملتی ہیں، جام ملتے ہیں
مل رہی ہے حیات پھولوں کی

کون دیتا ہے جان پھولوں پر
کون کرتا ہے بات پھولوں کی

وہ شرافت تو دل کے ساتھ گئی
لٹ گئی کائنات پھولوں کی

اب کسے ہے دماغِ تہمتِ عشق
کون سنتا ہے بات پھولوں کی

میرے دل میں سرورِ صبحِ بہار
تیری آنکھوں میں رات پھولوں کی

پھول کھلتے رہیں گے دنیا میں
روز نکلے گی بات پھولوں کی

یہ مہکتی ہوئی غزل مخدوم
جیسے صحرا میں رات پھولوں کی

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چشمِ نم مسکراتی رہی رات بھر

رات بھر درد کی شمع جلتی رہی
غم کی لو تھرتھراتی رہی رات بھر

بانسری کی سریلی سہانی صدا
یاد بن بن کے آتی رہی رات بھر

یاد کے چاند دل میں اترتے رہے
چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر

کوئی دیوانہ گلیوں میں پھرتا رہا
کوئی آواز آتی رہی رات بھر

علی سردار جعفری

علی سردار جعفری مشہور شاعر، نقاد اور صحافی ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے اہم ستون مانے جاتے ہیں۔ سردار بنیادی طور سے نظم کے شاعر ہیں لیکن غزل میں بھی اپنا الگ انداز رکھتے ہیں۔ فکر کی بلندی اور جذبے کی تازگی کا امتزاج ان کی غزل کو ایک نئی کیفیت عطا کرتا ہے۔

جعفری صاحب ۲۹ر نومبر ۱۹۱۳ء کو بلرام پور ضلع گونڈہ، یو۔پی میں پیدا ہوئے۔ دہلی یونیورسٹی سے بی اے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ طالب علمی کے زمانے سے جدوجہدِ آزادی میں شریک رہے۔ اسی سلسلے میں دو بار جیل بھی جا چکے ہیں۔ ہند و پاک کے مختلف معیاری رسائل میں ان کا کلام اور مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اس کے علاوہ چھ شعری مجموعے اور تین کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی سیاست، ادب اور ثقافت پر کافی مضامین چھپ چکے ہیں۔ آپ کی کچھ نظموں کا روسی، ازبک، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، زیک، عربی اور کئی ہندستانی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

نیشنل بک ٹرسٹ نے ان کی طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" کو چودہ ہندستانی زبانوں میں ترجمے کے لئے منتخب کیا ہے۔ "نیا ادب" کے بانی اور ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ رسالہ "گفتگو" کے بانی اور ایڈیٹر ہیں۔ ہندستانی بک ٹرسٹ بمبئی کے بھی ایڈیٹر ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں پدم شری کا خطاب ملا۔ ۱۹۷۳ء میں حکومت مہاراشٹر نے جسٹس آف پیس مقرر کیا۔ ۱۹۶۵ء میں "ایک خواب اور" پر سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ مل چکا ہے۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے علامہ اقبال پر ایک ڈاکومنٹری فلم بنائی ہے

ہمارے دل کی تپش سے چراغ جلتے ہیں
ہماری تشنہ لبی مے کدے بناتی ہے

فن اور شخصیت

علی سردار جعفری

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا !

باعثِ رشک ہے تنہا رویٔ رہروِ شوق !
ہمسفر کوئی نہیں دوریٔ منزل کے سوا

ہم نے دنیا کی ہر اک شے سے اٹھایا دل کو
لیکن اک شوخ کے ہنگامۂ محفل کے سوا

تیغ منصف ہو جہاں، دار و رسن ہو شاہد
بے گنہ کون ہے اُس شہر میں قاتل کے سوا !

جانے کس رنگ سے آئی ہے گلستاں میں بہار
کوئی نغمہ ہی نہیں شورِ سلاسل کے سوا

٭

○

شکستِ شوق کو تکمیلِ آرزو کہیے
جو تشنگی ہو تو پیمانہ و سبو کہیے

خیالِ یار کو دیجیے وصالِ یار کا نام
شبِ فراق کو گیسوئے مشک بو کہیے

چراغِ انجمنِ حیرتِ نظارہ تھے
وہ لالہ رو جنھیں اب داغِ آرزو کہیے

مہک رہی ہے غزل ذکرِ زلفِ خوباں سے
نسیمِ صبح کے مانند کو بکو کہیے

شکایتیں بھی بہت ہیں حکایتیں بھی بہت
مزہ تو جب ہے کہ یاروں کے روبرو کہیے

ہے حکم کیجیے پھر خنجروں کی دل داری !
دہانِ زخم سے افسانۂ گلو کہیے

زبانِ تیغ سے کرتے ہیں پرسشِ احوال
اور اس کے بعد یہ کہتے ہیں آرزو کہیے

ہے زخم زخم مگر کیوں نہ جانیے اسے پھول
لہو لہو ہے مگر کیوں اسے لہو کہیے

سمجھیے قامتِ یاراں کو ادا کی قبا !
حنائے پائے نگارانِ تند خو کہیے

جہاں جہاں بھی خزاں ہے وہیں وہیں ہے بہار
چمن چمن یہی افسانۂ نمو کہیے !

سنواریے غزل اپنی بیانِ غالب سے
زبانِ میر میں بھی ہاں کبھو کبھو کہیے !

مگر وہ حرف دھڑکنے لگے جو دل کی طرح
مگر وہ بات جسے اپنی گفتگو کہیے !

وہ جس کے فیض سے غالب ہوا تھا نکتہ سرا
زبان ہے جسے دِلّی کی آبرو کہیے

روانی ایسی کہ گنگا کی کھائیے قسمیں
جوانی ایسی کہ جنّت کی آب جو کہیے

رہے تو معجزۂ نطق کو دعا دیجیے
مٹے تو آنکھ سے ٹپکا ہوا لہو کہیے

جراحتوں کی سیاست ہے جن کا فن سنوار
اب ان سے کہیے تو کیا حاجتِ رفو کہیے

○

فروغِ دیدہ و دل، لالۂ سحر کی طرح
اُجالا بن کے رہو شمعِ رہگزر کی طرح

پیمبروں کی طرح سے جیو زمانے میں
پیامِ شوق بنو دولتِ ہنر کی طرح

یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے ہم نفسو
ستارہ بن کے جلے بجھ گئے شرر کی طرح

ڈرا سکی نہ مجھے تیرگی زمانے کی
اندھیری رات سے گزرا ہوں میں قمر کی طرح

سمندروں کے تلاطم نے مجھ کو پالا ہے
چمک رہا ہوں اسی واسطے گہر کی طرح

تمام کوہ و تل و بحر و بر ہیں زیرِ نگیں
کھلا ہوا ہوں میں شاہیں کے بال و پر کی طرح

تمام دولتِ کونین ہے خراج اس کا
یہ دل نہیں کسی لوٹے ہوئے نگر کی طرح

گزر کے خار سے، غنچہ سے گل سے شبنم سے
میں شاخِ وقت میں آیا ہوں اک ثمر کی طرح

میں دل میں تلخیِ زہرابِ غم بھی رکھتا ہوں
نہ مثلِ شہد ہوں شیریں نہ میں شکر کی طرح

خزاں کے دستِ ستم نے مجھے چھوا ہے مگر
تمام شعلہ و شبنم ہوں کاشمر کی طرح

مری نوا میں ہے لطف و سُرورِ صبحِ نشاط
ہر ایک شعر ہے رندوں کی شامِ تر کی طرح

یہ نا تمام غزل عصرِ نو کا ہے آہنگ
بلند و پست کو دیکھا ہے دیدہ ور کی طرح

علی سردار جعفری

○

جلا کے لحن کی قندیل نور بار چلو
لٹاتے دولتِ گل صورتِ بہار چلو

وصال و ہجر کی راہوں میں روشنی ہو گی
دلوں میں لے کے چراغِ جمالِ یار چلو

اسی سے پھول کھلیں گے، لہولہان ہیں پاؤں
ابھی تو راہِ طلب میں بہت ہیں خار چلو

کہاں ہو میرے رفیقانِ حرف و صوت و صدا
سکوتِ شب ہے سیہ رنگ، شعلہ بار چلو

اُمیدِ حور میں جنت پہ مر رکھنے والو
بلا رہے ہیں حسینانِ روزگار چلو

عدو کی تیغِ ستم سے مقابلہ ہے ابھی
بھلا کے ظلمِ رفیقانِ کم عیار چلو

سوادِ منزلِ جانانہ قریب ہے شاید
مثالِ بادِ صبا ہو کے بیقرار چلو

○

وہی حسن یار میں ہے، وہی نو بہار میں ہے
وہ جو کیفیت نشے کی مے خوشگوار میں ہے

یہ زمین کی آرزو ہے [illegible] زمین کو
یہ تمام رنگ و نکہت ترے اختیار میں ہے

ترے ہاتھ کی بلندی میں فروغ کہکشاں ہے
یہ ہجوم ماہ و انجم ترے انتظار میں ہے

بس اسی کو توڑنا ہے، یہ جنون نفع خوری
یہی ایک سرد خنجر دل روزگار میں ہے

ابھی زندگی حسیں ہے، ابھی ذکر موت کیسا
ابھی پھول کھل رہے ہیں ابھی تو کنار میں ہے

ابھی میکدہ جواں ہے، ابھی موج میں ہے ساقی
ابھی جام رقص میں ہے ابھی مے بہار میں ہے

یہی مرا شعر و نغمہ، یہی مری فکر و حکمت
جو سرور درد مندی دل بیقرار میں ہے

علی سردار جعفری

○

بہاروں کے پیام آئے ستاروں کے سلام آئے
ہزاروں نامہ ہائے شوق اہلِ دل کے نام آئے

نہ جانے کتنی نظریں اس دلِ وحشی پہ پڑتی ہیں
ہر اک کو فکر ہے اس کی یہ شاہیں زیرِ دام آئے

اسی امید میں بیتابیٔ جاں بڑھتی جاتی ہے
سکونِ دل جہاں ممکن ہو شاید وہ مقام آئے

ہماری تشنگی بجھتی نہیں شبنم کے قطروں سے
جسے ساقی گری کی شرم ہو آتش بجام آئے

انہی راہوں میں شیخ و محتسب حائل رہے اکثر
انہی راہوں میں حورانِ بہشتی کے خیام آئے

نگاہیں منتظر ہیں ایک خورشیدِ تمنا کی
ابھی تک جتنے مہر و ماہ آئے ناتمام آئے

یہ عالم لذتِ تخلیق کا ہے رقصِ لافانی
تصور خانۂ حیرت میں لاکھوں صبح و شام آئے

کوئی سردار کب تھا اس سے پہلے تری محفل میں
بہت اہلِ سخن اٹھے، بہت اہلِ کلام آئے

جاں نثار اختر

اُردو کے ممتاز شاعر جاں نثار اختر کا جنم گوالیار (مدھیہ پردیش) میں ۱۹۱۴ء میں ہوا ۔ انھوں نے ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور اسی سال ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں شامل ہو گئے ۔ کچھ عرصے کے لئے انھوں نے حمیدیہ کالج بھوپال میں اُردو کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں ۔ لیکن جلد ہی ملازمت کی پابندی سے اکتا گئے اور بمبئی چلے آئے ۔ جہاں انھوں نے فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے آزادانہ کام شروع کیا

جاں نثار اختر مضطر خیر آبادی کے بیٹے تھے اس لئے ورثے میں رنگین تخیل اور رومانی فکر کی ایک دلکش روایت ملی تھی ۔ انھوں نے زندگی کے حسن کے گیت گائے ۔ بقول آل احمد سرور " ان کے یہاں ایک شاعرانہ مزاج اور قلندرانہ انداز ہے جو ان کی شخصیت کے کھرے پن کو ظاہر کرتا ہے ۔ " انھوں نے کالج میں اُردو کی تعلیم بھی دی ہے ، فلمیں بھی بنائی ہیں ، ہر طرف لپکے ہیں اور ہر شعلے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے ۔

وہ بڑے قادر الکلام شاعر تھے ۔ ان کی شاعری کا کینوس بہت وسیع تھا اسی لئے وہ کبھی بندھے ٹکے اصولوں کے پابند نہیں رہے ۔

مدھیہ پردیش شاسن ساہتیہ پریشد ایوارڈ کے علاوہ ان کی شاعری نے سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ بھی حاصل کیا ۔ ان کے چھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔ ۱۸ اگست ۱۹۷۶ء کو جاں جان آفریں کے سپرد کر دی ۔ بعد مرگ ان کے مجموعے "خاک دل" پر ساہتیہ اکاڈیمی نے ایوارڈ دیا ۔ "پچھلے پہر" "خاک دل" "گھر آنگن" ان کے بہترین شعری مجموعے ہیں ۔ ان کی حیات میں ہی رسالہ فن اور شخصیت نے ان پر ایک ضخیم نمبر نکالا تھا جو اپنی مثال آپ ہے ۔

ہمارا ذکر [illegible] اے سخن کے متوالو!
[illegible] کل [illegible] گے مزاج داں ہم سے

جاں نثار اختر

جب لگیں زخم تو قاتل کو دعا دی جائے
ہے یہی رسم، تو یہ رسم اٹھا دی جائے

تشنگی کچھ تو بجھے تشنہ لبانِ غم کی
اک ندی درد کی شہروں میں بہا دی جائے

دل کا وہ حال ہوا ہے غمِ دوراں کے تلے
جیسے اک لاش چٹانوں میں دبا دی جائے

ہم نے انسانوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا
کیا برا ہے جو یہ افواہ اڑا دی جائے

ہم کو گزری ہوئی صدیاں تو نہ پہچانیں گی
آنے والے کسی لمحے کو صدا دی جائے

پھول بن جاتی ہیں دہکے ہوئے شعلوں کی لویں
شرط یہ ہے کہ انھیں خوب ہوا دی جائے

کم نہیں نشّے میں جاڑے کی گلابی راتیں
اور اگر تیری جوانی بھی ملا دی جائے

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے غزل کا فن کیا
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں
وطن سے عشق، غریبی سے بیر، امن سے پیار
سبھی نے اوڑھ رکھے ہیں نقاب جتنے ہیں
سمجھ سکے تو سمجھ، زندگی کی الجھن کو!
سوال اتنے نہیں ہیں، جواب جتنے ہیں

زندگی تنہا سفر کی رات ہے
اپنے اپنے حوصلے کی بات ہے
کس عقیدے کی دہائی دیجئے
ہر عقیدہ آج بے اوقات ہے
کیا پتا پہنچیں گے کب منزل تلک
گھٹتے بڑھتے فاصلوں کا ساتھ ہے

○

ہر ایک روح میں اک غم چھپا لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو کوئی بد دعا لگے ہے مجھے

جو آنسوؤں میں کبھی رات بھیگ جاتی ہے
بہت قریب وہ آوازِ پا لگے ہے مجھے

مَیں سو بھی جاؤں تو کیا میری بند آنکھوں میں
تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے

مَیں جب بھی اُس کے خیالوں میں کھو سا جاتا ہوں
وہ خود بھی بات کرے تو بُرا لگے ہے مجھے

دبا کے آئی ہے سینے میں کون سی آہیں
کچھ آج رنگ ترا سانولا لگے ہے مجھے

نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے
کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحہ لگے ہے مجھے

اب ایک آدھ قدم کا حساب کیا رکھیے
ابھی تلک تو وہی فاصلہ لگے ہے مجھے

حکایتِ غمِ دل کچھ کشش تو رکھتی ہے
زمانہ غور سے سُنتا ہوا لگے ہے مجھے

○

زُلفیں، سینہ، ناف، کمر
ایک ندی میں کتنے بھنور

صدیوں صدیوں میرا سفر
منزل منزل راہ گزر

کتنا مشکل، کتنا کٹھن
جینے سے جینے کا ہُنر

گاؤں میں آ کر شہر بسے
گاؤں بچارے جائیں کِدھر

لاکھ طرح سے نام ترا
بیٹھا لکھوں کاغذ پر

چھوٹے چھوٹے ذہن کے لوگ
ہم سے اُن کی بات نہ کر

○

آئے کیا کیا یاد نظر جب پڑتی اُن دالانوں پر
اُس کا کاغذ چپکا دینا گھر کے روشندانوں پر

آج بھی جیسے شانے پر تم ہاتھ میرے رکھ دیتی ہو
چلتے چلتے رک جاتا ہوں ساڑی کی دوکانوں پر

برکھا کی تو بات ہی چھوڑو، چنچل ہے پُروائی بھی
جانے کس کا سبز دوپٹّہ پھینک گئی ہے دھانوں پر

سستے داموں لے تو آتے لیکن دل تھا بھر آیا
جانے کس کا نام کھُدا تھا پیتل کے گلدانوں پر

اس کا کیا من بھید بتاؤں، اس کا کیا انداز کہوں
بات بھی میری سُننا چاہے، ہاتھ بھی رکھے کانوں پر

شعر تو اُن پر لکھے لیکن اوروں سے منسوب کئے
اُن کو کیا کیا غصّہ، نظموں کے عنوانوں پر

○

ایک تو نیناں کجرارے اور تس پر ڈوبے کاجل میں
بجلی کی بڑھ جائے چمک کچھ اور بھی گہرے بادل میں

پیاسے پیاسے نیناں اُسکے جانے پگلی چاہے کیا
تٹ پر جب بھی جاوے 'سوچے' ندیاں بھر لوں چھاگل میں

صبح نہانے جوڑا کھولے، ناگ بدن سے آ لپٹیں
اُس کی رنگت اُس کی خوشبو کتنی ملتی صندل میں

چاند کی پتلی نوک پہ جیسے کوئی بادل ٹِک جائے
ایسے اُس کا گرتا آنچل اٹکے آڑی ہیکل میں

کھڑکی کی باریک جھری سے کون یہ مجھ تک آ جائے
جسم چرائے، نین جھکائے، خوشبو باندھے آنچل میں

پیار کی یوں ہر بوند جلا دی میں نے اپنے سینے میں
جیسے کوئی جلتی ماچس ڈال دے پی کر بوتل میں

جاں نثار اختر

○

رُخوں کے چاند، لبوں کے گلاب مانگے ہے
بدن کی پیاس، بدن کی شراب مانگے ہے

میں کتنے لمحے نہ جانے کہاں گنوا آیا
تری نگاہ تو سارا حساب مانگے ہے

میں کس سے پوچھنے جاؤں کہ آج ہر کوئی
مرے سوال کا مجھ سے جواب مانگے ہے

دلِ تباہ کا یہ حوصلہ بھی کیا کم ہے
ہر ایک درد سے جینے کی تاب مانگے ہے

بجا کہ وضعِ حیا بھی ہے ایک چیز مگر
نشاطِ دل تجھے بے حجاب مانگے ہے

○

بہت دل کر کے ہونٹوں کی شگفتہ تازگی دی ہے
چمن مانگا تھا پر اُس نے بمشکل اک کلی دی ہے

مرے خلوت کدے کے رات دن یونہی نہیں سنورے
کسی نے دھوپ بخشی ہے کسی نے چاندنی دی ہے

نظر کو سبز میدانوں نے کیا کیا وسعتیں بخشیں
پگھلتے آبشاروں نے ہمیں دریا دلی دی ہے

مری آوارگی بھی اک کرشمہ ہے زمانے میں
ہر اک درویش نے مجھ کو دعائے خیر ہی دی ہے

کہاں ممکن تھا کوئی کام ہم جیسے دِوانوں سے
تمھیں نے گیت لکھوائے تمھیں نے شاعری دی ہے

جاں نثار اختر

> یہ غزلیں جاں نثار صاحب کے انتقال کے بعد ان کی جیکٹ کی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا پر لکھی ہوئی ملیں۔ مرحوم کو ان غزلوں پر نظرِ ثانی کا بھی موقع نہ مل سکا۔ (مدیر)

○

ہر ایک پل سے جواں رس نچوڑتے جاؤ
دلوں سے درد کا ناتا بھی جوڑتے جاؤ

اگر سکوت ہے لازم زباں سے کچھ نہ کہو
مگر نظر سے دلوں کو جھنجھوڑتے جاؤ

وہ کیا شراب جو ہر ہوش چھین لے ہم سے
بھرے ہیں جام تو ہر جام توڑتے جاؤ

لہو کی بوند بھی کانٹوں پہ کم نہیں ہوتی
کوئی چراغ تو صحرا میں چھوڑتے جاؤ

زمانہ یاد رکھے گا تو کس بہانے سے
کوئی تو شعر دماغوں میں چھوڑتے جاؤ

کسی کا درد ہو اپنا ہی درد ہے یارو
جہاں جہاں بھی ملے غم بٹورتے جاؤ

○

زندگی برقِ جنوں بن کے دلوں پر برسے
وہ جدھر جائے اُدھر آگ برابر برسے

سوچتا ہوں تری تقریر کا حاصل کیا ہے
پھول برسے نہ کسی شہر میں پتھر برسے

یہ جو ساقی نے تہی جام سجا رکھے ہیں
میں جو اک جام اُلٹ دوں تو سمندر برسے

تم نے اب ہاتھ مرے دل پہ جو رکھا بھی تو کیا
زندگی بھر تو میرے قلب پہ نشتر برسے

اے خدا چند گھرانوں پہ یہ اکرام ترا
بات تو جب ہے کہ رحمت تری گھر گھر برسے

احمد ندیم قاسمی

احترام، احترام، احترام... احمد ندیم قاسمی آرہے ہیں......
کچھ اسی قسم کا ماحول احمد ندیم قاسمی کے آتے ہی محفل میں پیدا ہو جاتا ہے "یہ بات اردو کے مشہور طنز نگار رنکر تونسوی نے قاسمی کے بارے میں کہی تھی۔ اس کا لطف وہی لوگ لے سکتے ہیں جو قاسمی کو ذاتی طور سے جانتے ہیں۔ قاسمی کا اصلی نام احمد شاہ ہے۔ ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو ضلع شاہ پور مشرقی پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں "انگا" میں پیدا ہوئے۔ پیرزادہ ہونے کے باوجود بھی گھر کی حالت مالی طور سے اچھی نہ تھی۔ کم عمری ہی میں والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا اسی لئے تعلیمی اخراجات رشتہ داروں نے برداشت کئے۔
۱۹۳۵ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد حالات نے ان کے ساتھ مذاق کیا۔ قاسمی صاحب جتنے اچھے افسانہ نگار ہیں اتنے ہی اچھے شاعر بھی ہیں۔ قاسمی صاحب نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے کلرکی، ایڈیٹری اور خدا جانے کیا کیا پیشے اختیار کئے۔
ان کے شعری مجموعے۔ دھڑکنیں، رم جھم اجلال وجمال، شعلۂ گل، دشتِ وفا شائع ہوئے۔ اور افسانوں کے کئی مجموعے بھی شائع ہو کر مقبول ہوئے ہیں۔ ان دنوں پاکستان میں مقیم ہیں اور ایک ادبی رسالہ "فنون" کے ایڈیٹر ہیں —

ہم نے ہر غم سے نکھاری ہیں تمہاری یادیں
ہم کوئی تم تھے جو وابستۂ غم بھی نہ ہوئے

احمد ندیم قاسمی

○

سانس لینا بھی سزا لگتا ہے
اب تو مرنا بھی روا لگتا ہے
سرِ بازار ہے یاروں کی تلاش
جو گزرتا ہے، خفا لگتا ہے
موسمِ گل میں سرِ شاخِ گلاب
شعلہ بھڑکے تو بجا لگتا ہے
مسکراتا ہے جو اس عالم میں
بخدا، مجھ کو خدا لگتا ہے
اتنا مانوس ہوں سناٹے سے
کوئی بولے تو بُرا لگتا ہے
نطق کا ساتھ نہیں دیتا ذہن
شکر کرتا ہوں، گلا لگتا ہے
اس قدر تند ہے رفتارِ حیات
وقت بھی رشتہ بپا لگتا ہے
انجم و ماہ کا کیا ذکر ندیم!
مہر محتاجِ ضیا لگتا ہے

○

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے
ہائے خوابوں کی خیاباں سازیاں
آنکھ کیا کھولی چمن مرجھا گئے
کس تجلی کا دیا ہم کو فریب
کس دھندلکے میں ہمیں پہنچا گئے
اُن کا آنا حشر سے کچھ کم نہ تھا
اور جب پلٹے قیامت ڈھا گئے
رہنماؤ! رات ابھی باقی سہی
آج سیارے اگر ٹکرا گئے
جن کو ہم سمجھا کئے ابرِ بہار
وہ بگولے کتنے گلشن کھا گئے
آدمی کے ارتقاء کا مدعا
وہ چھپاتے ہی رہے ہم پا گئے
اب کوئی طوفان ہی لائے گا سحر
آفتاب ابھرا تو بادل چھا گئے

کتنے خورشید بیک وقت نکل آئے ہیں
ہر طرف اپنے ہی پیکر کے گھنے سائے ہیں

ذہن پر تنگ ہوا جب بھی اندھیرے کا حصار
چند یادوں کے دریچے ہیں جو کام آئے ہیں

کون کہتا ہے محبت ہے فقط جی کا زیاں
ہم تو اک دل کے عوض حشر اُٹھا لائے ہیں

کتنے پل کے لئے وہ زینتِ آغوش رہے
کتنے برسوں کے مگر زخم نکھر آئے ہیں

داستانِ غمِ دنیا ہو کہ افسانۂ دل!
وہی قصے ہیں جو ہر دور نے دُہرائے ہیں

میں کب سے گوش بر آواز ہوں پکارو بھی
زمیں پر یہ ستارے کبھی اُتارو بھی

مری غیور اُمنگو، شباب فانی ہے
غرورِ عشق کا دیرینہ کھیل ہارو بھی

بھٹک رہا ہے دھندلکوں میں کاروانِ خیال
بس اب خدا کے لیے کاکلیں سنوارو بھی

مری تلاش کی معراج ہو نہیں لیکن
نقاب اُٹھاؤ، نشانِ سفر اُبھارو بھی

یہ کائنات ازل سے سپردِ انساں ہے
مگر ندیم تم اس بوجھ کو سہارو بھی

○

اُفق نہاں ہے تو حدِ نظر کا ذکر کریں
ستارے ڈوب رہے ہیں سحر کا ذکر کریں

فضا کا ذکر کریں بحر و بر کا ذکر کریں
بہت بلند ہے فردوس گھر کا ذکر کریں

صدف کو سامنے پاکر گہر کا ذکر کریں
نظر کے ساتھ ہی حُسنِ نظر کا ذکر کریں

تمام عمر کٹے، چاک دامنی کے گلے
بعزمِ بخیہ گری بخیہ گر کا ذکر کریں

مرے ندیم مری ذات کو سمجھ کر آپ
مرے کلام کے نقص و اثر کا ذکر کریں

○

پھُولوں سے لہو کیسے ٹپکتا ہوا دیکھوں
آنکھوں کو بجھاؤں کہ حقیقت کو بدل دوں

حق بات کہوں گا مگر اے جرأتِ اظہار
جو بات نہ کہنی ہو، وہی بات نہ کہہ دوں

ہر سوچ پہ خنجر سا گذر جاتا ہے دل سے
حیراں ہوں کہ سوچوں تو کس انداز میں سوچوں

آنکھیں تو دکھاتی ہیں فقط برف سے پیکر
جل جاتی ہیں پوریں جو کسی جسم کو چھُو لوں

چہرے ہیں کہ مرمر سے تراشی ہوئی لوحیں
بازار میں یا شہرِ خموشاں میں کھڑا ہوں

کیفی اعظمی

کیفی اور اُن کی شاعری کا تعارف فیض احمد فیض نے اس طرح کرایا ہے

"بنیادی طور سے کیفی کی شاعری کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے لیکن غنائیہ شاعری کے سطحی تکلفات اور مصنوعی زیبائشوں سے کیفی نے بہت کم سروکار رکھا ہے۔ غم جاناں کا ذکر ہو کہ غم دوراں کا، بوسۂ لب کی بات ہو کہ بوسۂ زنجیر کی۔ کیفی بات ہمیشہ کھری کرتے ہیں۔ نہ تلخیٔ مضمون سے گھبراتے ہیں نہ تلخیٔ کلام سے گریز کرتے ہیں۔ نہ زہر قند کو نیا کرشمہ کرنے کے قائل ہیں نہ قند کی حقیقت کے منکر اور اس کے باوجود کیفی کی شاعری زہر اور قند کا ملغوبہ نہیں ہے بلکہ ایک متوازن، ٹھہرے ہوئے دردمند، فکر انگیز اور حساس نظریۂ حیات و فن کا بلیغ اظہار ہے جس میں کوئی جھول مشکل ہی سے دکھائی دے گا۔"

"آخرِ شب" کیفی کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد "آوارہ سجدے" شائع ہوا۔ اس مجموعے پر انھیں ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ملا۔ اس کے بعد حکومت ہند نے اسی کتاب کو ممنوع قرار دیا۔

کیفی صاحب کے فلمی نغموں کے مجموعے کے علاوہ نئی گلستان اور منتخب نظمیں زیر طبع ہیں۔ اردو شاعری کی قابل قدر خدمات کے اعتراف میں مہاراشٹرا اکاڈمی نے آپ کو خصوصی انعام سے نوازا ہے۔

نئی زمین نیا آسمان بھی مل جائے
نئے بشر کا کہیں کچھ نشاں نہیں ملتا

کیفی اعظمی

○

خار و خس تو اٹھیں، راستا تو چلے
میں اگر تھک گیا، قافلہ تو چلے

چاند سورج بزرگوں کے نقشِ قدم
خیر بجھنے دو ان کو ہوا تو چلے

حاکمِ شہر، یہ بھی کوئی شہر ہے
مسجدیں بند ہیں، میکدہ تو چلے

اس کو مذہب کہو یا سیاست کہو!
خودکشی کا ہنر تم سکھا تو چلے

اتنی لاشیں میں کیسے اٹھا پاؤں گا!
آپ اینٹوں کی حرمت بچا تو چلے

بیلچے لاؤ، کھولو زمیں کی تہیں!
میں کہاں دفن ہوں، کچھ پتہ تو چلے

○

پتھر کے خدا وہاں بھی پائے
ہم چاند سے آج لوٹ آئے

دیواریں تو ہر طرف کھڑی ہیں
کیا ہو گئے مہرباں سائے

جنگل کی ہوائیں آ رہی ہیں!
کاغذ کا یہ شہر اڑ نہ جائے

لیلیٰ نے نیا جنم لیا ہے
ہے قیس کوئی جو دل لگائے

ہے آج زمیں کا غسلِ صحت
جس دل میں ہو جتنا خون لائے

صحرا صحرا لہو کے خیمے
پھر پیاسے لبِ فرات آئے

ساحر لدھیانوی

ساحر نے ۸ مارچ سنہ ۱۹۲۱ء کو لدھیانہ کے ایک جاگیردار خاندان میں آنکھ کھولی لیکن جاگیردارانہ نظام سے یہ باغی ہو گئے۔ اپنے انقلابی جذبات اور ترقی پسندانہ خیالات کی وجہ سے آپ کو بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ "تلخیاں" کے نام سے منظر عام پر آیا اور اتنا مقبول ہوا کہ اب تک اس کے ۲۳ ایڈیشن اردو میں اور بارہ ایڈیشن ہندی میں شائع ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں پنجابی ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے۔ ان کی شہرۂ آفاق طویل نظم "پرچھائیاں" کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے تراجم نہ صرف ہندی اور مراٹھی بلکہ انگریزی میں بھی کئے جا چکے ہیں اور اس نظم کے بہت سے حصے کئی لوگوں کو زبانی یاد ہیں۔ بقول ابن انشاء ساحر کی کتاب "تلخیاں" عاشق اپنی محبوبہ کو بطور تحفہ پیش کرتے ہیں۔ ساحر پہلا شاعر ہے جس نے فلمی گیتوں میں ادبی معیار کو ملحوظ رکھا۔ سنہ ۱۹۷۲ء میں ان کا ایک اور مجموعہ "آؤ کہ کوئی خواب بنیں" سامنے آیا جسے بین الاقوامی شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ اسی ادبی تخلیق پر ان کو سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، مہاراشٹر اردو اکیڈمی ایوارڈ اور مہاراشٹر لٹریری ایوارڈ حاصل ہو چکے ہیں۔ حکومت ہند نے سنہ ۱۹۷۱ء میں پدم شری کا اعزاز دیا۔

○ ہند و پاک جنگ کے بعد سنہ ۱۹۷۲ء میں ہمارے جوانوں نے کچھ فوجی چوکیوں کے نام ساحر کے نام پر رکھے۔ ○ ان کی پنڈت نہرو پر لکھی گئی نظم کو ستی پارک کرنال میں پنڈت نہرو کے مجسمہ کے نیچے ان کی وصیت کے ساتھ کندہ کیا گیا۔ ○ سینا سیوا کور بس کیلئے ترانہ "مارچنگ سانگ" ساحر کی تخلیق ہے۔ ○ سول لائن لدھیانہ میں ایک سڑک کا نام سنہ ۱۹۸۵ء میں ساحر روڈ رکھا گیا۔

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

ساحر لدھیانوی

○

جب کبھی اُن کی توجہ میں کمی پائی گئی ؎ ازسرِ نو داستانِ شوق دُہرائی گئی

بک گئے جب تیرے لب پھر تجھکو کیا شکوہ اگر ؎ زندگانی بادہ و ساغر سے بہلائی گئی

اے غمِ دنیا تجھے کیا علم تیرے واسطے ؎ کن بہانوں سے طبیعت راہ پر لائی گئی

ہم کریں ترکِ وفا، اچھا چلو یونہی سہی ؎ اور اگر ترکِ وفا سے بھی نہ رسوائی گئی

کیسے کیسے چشم و عارض گردِ غم سے بجھ گئے ؎ کیسے کیسے پیکروں کی شانِ زیبائی گئی

دل کی دھڑکن میں توازن آچلا ہے خیر ہو ؎ میری نظریں بجھ گئیں یا تیری رعنائی گئی

اُن کا غم، اُن کا تصور، اُن کے شکوے اب کہاں ؎ اب تو یہ باتیں بھی اے دل ہو گئیں آئی گئی

جراُتِ انساں پہ گو تادیب کے پہرے رہے ؎ فطرتِ انساں کو کب زنجیر پہنائی گئی

عرصۂ ہستی میں اب تیشہ زنوں کا دور ہے
رسمِ چنگیزی اٹھی، توقیرِ دارائی گئی

پیدائش کے دن سے موت کی زد میں ہیں ؎ اس مقتل میں کون ہمیں لے آیا ہے

اہلِ دل اور بھی ہیں، اہلِ وفا اور بھی ہیں ؎ ایک ہم ہی نہیں دنیا سے خفا اور بھی ہیں

فن اور شخصیت

ساحر لدھیانوی

○

بہت گھٹن ہے کوئی صورتِ بیاں نکلے
اگر صدا نہ اُٹھے، کم سے کم فغاں نکلے

فقیہِ شہر کے تن پر لباس باقی ہے
امیرِ شہر کے ارماں ابھی کہاں نکلے

حقیقتیں ہیں سلامت تو خواب بہتیرے
ملال کیوں ہو جو کچھ خواب رائیگاں نکلے

وہ فلسفے جو ہر اک آستاں کے دشمن تھے
عمل میں آئے تو خود وقفِ آستاں نکلے

اُدھر بھی خاک اُڑی ہے اُدھر بھی زخم پڑے
جدھر سے ہو کے بہاروں کے کارواں نکلے

ستم کے دور میں ہم اہلِ دل ہی کام آئے
زباں پہ ناز تھا جن کو وہ بے زباں نکلے

○

کل کے پھولوں سے تھا جس کا رشتہ آج کے غنچہ جبینوں میں کیوں ہو
سال خوردہ ایاغوں کی تلچھٹ، نو جواں آبگینوں میں کیوں ہو

ساعتِ فصلِ گل ہے جوانی، کیوں نہ جشنِ مے وہوشاں ہو
عاقبت کے عذابوں کا رونا، ان مبارک مہینوں میں کیوں ہو

بغض کی آگ، نفرت کے شعلے، میکشوں تک پہنچنے نہ پائیں
فصل یہ مندروں مسجدوں کی، میکدوں کی زمینوں میں کیوں ہو

میں زندہ ہوں یہ مشتہر کیجئے
مرے قاتلوں کو خبر کیجئے

"زمیں سخت ہے آسماں دور ہے"
بسر ہو سکے تو بسر کیجئے

ستم کے بہت سے ہیں ردِ عمل
ضروری نہیں چشم تر کیجئے

وہی ظلم بارِ دگر ہے تو پھر
وہی جرم بارِ دگر کیجئے

قفس توڑنا بعد کی بات ہے
ابھی خواہشِ بال و پر کیجئے

یہ زمیں جس قدر سجائی گئی
زندگی کی تڑپ بڑھائی گئی

آئینے سے بگڑ کے بیٹھ گئے
جن کی صورت جنہیں دکھائی گئی

دشمنوں ہی سے بیر نبھ جائے
دوستوں سے تو آشنائی گئی

نسل در نسل انتظار رہا
قصر ٹوٹے، نہ بے نوائی گئی

زندگی کا نصیب کیا کہئے
ایک سیتا تھی جو ستائی گئی

ہم نہ اوتار تھے، نہ پیغمبر
کیوں یہ عظمت ہمیں دلائی گئی

موت پائی صلیب پر ہم نے
عمر بن باس میں بتائی گئی

علی جواد زیدی

زیدی صاحب پہلے صابر تخلص فرماتے تھے بعد میں پتہ نہیں کیا بات ہوئی کہ یہ تخلص ترک کردیا
سنہ ۱۹۲۰ء کو محمود آباد ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ لکھنؤ
یونیورسٹی سے بی اے ایل ایل بی کی ڈگریاں لیں۔ سیاسیات سے بھی دلچسپی تھی۔ آل انڈیا فیڈریشن
کے جنرل سکریٹری تھے۔ انگریزوں کے زمانے میں سنہ ۱۹۴۲ء میں قید بھی کاٹی۔ صحافت میں بھی انھوں
نے نام کمایا۔ کئی اخبارات اور خبر رساں اداروں کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔

حکومتِ ہند کے مختلف عہدوں پر فائز رہے اور آج بھی انفارمیشن ڈپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسر ہیں۔ شاعری کے تین مجموعے "رگِ سنگ" "دیارِ سحر" اور "میری غزلیں" شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تنقیدی و تحقیقی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ہندی میں "غالب ایک پریچے" چھپ چکی ہے۔ کئی زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ آجکل انیس پر ایک کتاب انگریزی میں لکھ رہے ہیں۔

دیوانہ ہوں چُپ رہنے دو، راز نہ پوچھو وحشت کا
لاکھوں ہی فتنے اُٹھیں گے میں جو کہیں سچ بول دیا

علی جواد زیدی

یہ شفق، یہ شامِ غربت، یہ غبار ہلکے ہلکے
کہیں دور جیسے آنچل کسی ماہوش کا ڈھلکے

یہی یادِ یار اے دل، ہے غمِ جہاں کا حاصل
کوئی پھول ہو تو، پھر بھی کوئی پھینک دے مسل کے

مرا زہرخندِ جرأت سرِ دار دیکھتا جا
جو یہاں تک آ گیا تو، مری دشمنی میں چل کے

یہ غرورِ عاشقانہ، یہ حوادثِ زمانہ
غمِ دل جواں ہوا ہے انھیں گودیوں میں پل کے

یہی سرکشی کا صحرا، یہی گم رہی کی دلدل!
مرے کج مذاق ساتھی، یہی راستے ہیں کل کے

جو ہو خارزار کوئی تو رواں دواں چلے جا
کوئی صحنِ گلستاں ہو تو گزر سنبھل سنبھل کے

جو وہ خود پلائیں زیدیؔ، تو یہ شرط ہے عطا کی
نہ ذرا بھی ہاتھ کانپے، نہ ذرا بھی جام چھلکے

⁂

مجروحؔ سلطانپوری

جب ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک غزل دشمنی بالخصوص ترقی پسندوں میں بھی ترقی پسندی کا لائحۂ عمل غزل دشمنی نہ ہوتے ہوئے بھی غزل دشمنی اپنے عروج پہ تھی۔ اُس وقت میں نے اپنے یقین کی رہبری میں غزلیں کہیں اور سیاسی اور سماجی مضامین کو پہلی بار غزل میں کامیابی سے برتا اور ۱۹۵۰ء کے آخر میں جب میں جیل سے اپنی نئی غزلیں لیکے باہر آیا تو ہمارے رفیقوں کو غزل کے بارے میں نئے سرے سے رائے قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اُنہی دنوں پروفیسر احتشام حسین نے غزل اور اس کی تکنک کا نئے سرے سے جائزہ لیتے ہوئے ایک مضمون بھی لکھا جس میں انہوں نے غزل سے پُر اُمید رہنے کی تلقین کی۔

عام طور پر غزل میں سیاسی اور سماجی مسائل کا اور خصوصاً جبر سیاست کا ذکر غزل میں اس کی اپنی تمام مخصوص اشاریت اور غزلیہ طرز بیان کی اولیت کا مستحق لوگ فیض احمد فیضؔ کو سمجھتے ہیں۔ ہرچند میں فیضؔ کو اپنا بزرگ اور پیشرو مانتا ہوں لیکن یہاں میں یہ کہنے سے گریز نہیں کروں گا کہ ممکن ہے پاکستان میں ایسا رہا ہو۔ لیکن ہم ہندستانی شاعروں اور ادیبوں کو اُن دنوں یعنی ۱۹۵۰ء کے آخر تک اُن کی صرف ایک غزل کا علم ہو سکا تھا۔ اور وہ اُن کی بہت مشہور اور خوبصورت غزل ہے جسکے مطلع کا مصرعہ ہے "تم آئے ہو نہ شب انتظار گذری ہے۔" اگر ہمارے ملک میں ان کے کسی مخصوص دوست تک اُن کی کچھ اور غزلیں پہنچی ہوں جن کا امکان کم ہی ہے تو کم از کم ہم جیسے لوگ ان غزلوں اور اشعار سے ناواقف تھے۔ اس بات پر میں اصرار اس لئے کر رہا ہوں کہ سیاسی مضامین برتنے کے سلسلے میں میں نے صرف لائق ستائش ہی اشعار نہیں کہے بلکہ افراط و تفریط کا بھی شکار رہا ہوں۔ جس کی سزا مجھے اس حد تک مل رہی ہے کہ لوگ میری اصل شاعرانہ حیثیت کو آج بھی تسلیم کرنے میں تامل کرتے ہیں یعنی غزل کے موضوع میں پہلی بار ایک نئے موڑ کا اظہار میری شاعری کے ذریعہ ہوا۔

مجروح سلطانپوری

نوٹ:۔ اُصولاً اس صفحہ پر مجروحؔ صاحب کا تعارف چھپنا چاہیئے تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا جب ہم نے اُن سے "تعارف" کی فرمائش کی تو انھوں نے مندرجہ بالا تحریر ہمارے حوالے کی۔ اس تحریر کو ہم ایک نقطے کی بھی کمی بیشی کے بغیر شائع کر رہے ہیں۔

(ادارہ)

مجروح سلطانپوری

○

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اُٹھا سکے نہ جُھکا کے سر
اُڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں آگئی
وہی لب نہ میں جنھیں چھو سکا قدحِ شراب میں ڈھل گئے

وہی آستاں ہے وہی جبیں وہی اشک ہے وہی آستیں
دلِ زار تو بھی بدل کہیں کہ جہاں کے طور بدل گئے

تجھے چشمِ مست پتہ بھی ہے کہ شباب گرمیٔ بزم ہے
تجھے چشمِ مست خبر بھی ہے کہ سب آبگینے پگھل گئے

مرے کام آگئیں آخرش یہی کاوشیں یہی گردشیں
بڑھیں اس قدر مری منزلیں کہ قدم کے خار نکل گئے

○

ہم ہیں متاعِ کُوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

اس کوئے تشنگی میں بہت ہے کہ ایک جام
ہاتھ آگیا ہے دولتِ بیدار کی طرح

وہ تو کہیں ہے اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شے نگہِ یار کی طرح

سیدھی ہے راہِ شوق پہ یونہی کہیں کہیں
خم ہو گئی ہے گیسوئے دلدار کی طرح

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں !
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

اب جا کے کچھ کھلا ہنرِ ناخنِ جنوں
زخمِ جگر ہوئے لب و رخسار کی طرح

مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

○

سوئے مقتل کہ پئے سیرِ چمن جاتے ہیں
اہلِ دل جام بہ کف سر بہ کفن جاتے ہیں

آ گئی فصلِ جنوں، کچھ تو کرو دیوانو!
ایک صحرا کی طرف سایۂ فگن جاتے ہیں

بلبلو، اپنی نوا فیض ہے اُن آنکھوں کا
جن سے ہم سیکھنے اندازِ سُخن جاتے ہیں

جو ٹھہرتی تو ذرا چلتے صبا کے ہمراہ
یوں بھی ہم روز کہاں سوئے چمن جاتے ہیں

لُٹ گیا قافلۂ اہلِ جنوں بھی شاید
لوگ ہاتھوں میں لئے تارِ رسن جاتے ہیں

روک سکتی ہمیں زندانِ بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

○

ہمکو جنوں کیا سکھلاتے ہو، ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ
چاک کئے ہیں ہم نے عزیزو، چار گریباں تم سے زیادہ

چاکِ جگر محتاجِ رفو ہے، آج تو دامن صرف لہو ہے
اس موسم تھا ہمکو رہا ہے، شوقِ بہاراں تم سے زیادہ

عہدِ وفا یاروں سے نبھائیں، نازِ حریفاں ہنس کے اُٹھائیں
جب ہمیں ارماں تم سے سوا تھا، اب ہیں پشیماں تم سے زیادہ

ہم بھی ہمیشہ قتل ہوئے اور تم نے بھی دیکھا دور سے لیکن،
یہ نہ سمجھنا ہم کو ہوا ہے، جان کا نقصاں تم سے زیادہ

دیکھ کے اُلجھن زلفِ دوتا کی، کیسے اُلجھ پڑتے ہیں ہوا سے
ہم سے پوچھو، ہمکو ہے یارو، فکرِ نگاراں تم سے زیادہ

زنجیر و دیوار ہی دیکھی تم نے تو مجروحؔ، مگر ہم
کوچہ کوچہ دیکھ رہے ہیں، عالمِ زنداں تم سے زیادہ

○

خنجر کی طرح بوئے سمن تیز بہت ہے
موسم کی ہوا اب کے جنوں خیز بہت ہے

راس آئے تو ہر سر پہ بہت چھاؤں گھنی ہے
ہاتھ آئے تو ہر شاخِ ثمر بیز بہت ہے

منعم کی طرح پیرِ حرم پیتے ہیں وہ جام
رندوں کو بھی جس جام سے پرہیز بہت ہے

لوگو مری گلکاریٔ وحشت کا صلہ کیا
دیوانے کو اک حرفِ دل آویز بہت ہے

مصلوب ہوا کوئی سرِ راہِ تمنّا
آوازِ جرس پچھلے پہر تیز بہت ہے

مجروح سنے کون تری تلخ نوائی !
گفتارِ عزیزاں شکر آمیز بہت ہے

○

داغ سے مہکی ہوئی زخموں سے لالہ پیرہن
کس قدر رلتی ہے شاخِ درد سے شاخِ چمن

زشِ گل، مینائے مے، شمعِ سحر، سازِ سخن
سب اٹھے لیکن نہ اٹھا یں خرابِ انجمن

مژدہ اے یارانِ تشنہ، دل سے پھوٹا پھر لہو
اے شبِ تارِ عزیزاں، پھر جلا داغِ کہن

ساز میں یہ شورشِ غم لائے مطرب کس طرح
اس کی دھن پابند نے، نغمہ ہمارا نے شکن

دیکھئے کب تک بلائے جاں رہے اک حرفِ شوق
دل حریصِ گفتگو اور چشمِ خوباں کم سخن

سچ تو ہے مجروح نے اس گل سے کچھ پیماں لئے
یہ خبر لیکن کہاں سے لے اڑا مرغِ چمن

○

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

دیارِ شام نہیں منزلِ سحر بھی نہیں
عجب نگر ہے یہاں دن چلے نہ رات چلے

ہوا اسیر کوئی ہم نوا تو دور تلک
بپاسِ طرزِ نوا ہم بھی ساتھ ساتھ چلے

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

بچا کے لائے ہم اے یار پھر بھی نقدِ وفا
اگرچہ لٹتے ہوئے رہزنوں کے ہاتھ چلے

پھر آئی فصل کہ مانند برگِ آوارہ
ہمارے نام گلوں کے مراسلات چلے

بلا ہی بیٹھے جب اہلِ حرم تو اے مجروح
بغل میں ہم بھی لئے اک صنم کا ہاتھ چلے

○

مسرتوں کو یہ اہلِ ہوس نہ کھو دیتے
جو ہر خوشی میں تیرے غم کو بھی سمو دیتے

کہاں وہ شب کہ ترے گیسوؤں کے سائے میں
خیالِ صبح سے ہم آستیں بھگو دیتے

بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لئے
ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے

بچا لیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے

جو دیکھتے مری نظروں پہ بندشوں کے ستم
تو یہ نظارے مری بے بسی پہ رو دیتے

کبھی تو یوں بھی امنڈتے سرشکِ غم مجروح
کہ میرے زخمِ تمنا کے داغ دھو دیتے

○

گو رات مری، صبح کی محرم تو نہیں ہے
سورج سے ترا رنگِ حنا کم تو نہیں ہے

کچھ زخم ہی کھائیں چلو کچھ گُل ہی کھِلائیں
ہرچند کہ بہاراں کا یہ موسم تو نہیں ہے

چاہے وہ کسی کا ہو لہو دامنِ گُل پر
صیاد، یہ کل رات کی شبنم تو نہیں ہے

اتنی بھی ہمیں بندشِ غم کب تھی گوارا
پردے میں تری کاکلِ برہم تو نہیں ہے

اب کارگہِ دہر میں لگتا ہے بہت دل
اے یار، کہیں یہ بھی ترا غم تو نہیں ہے

صحرا میں بگولا بھی ہے مجروح صبا بھی
ہم سا کوئی آوارۂ عالم تو نہیں ہے

○

چمن ہے مقتلِ نغمہ اب اور کیا کہیے
بس اِک سکوت کا عالم جسے نوا کہیے

اسیرِ بندِ زمانہ ہوں صاحبانِ چمن
مری طرف سے گلوں کو بہت دعا کہیے

وہ ایک حرف ہے کہیے اُسے حکایتِ زُلف
کہ شکوۂ رسن و بندشِ بلا کہیے

رہے نہ آنکھ تو کیوں دیکھیے ستم کی طرف
کٹے زباں تو کیوں حرفِ ناسزا کہیے

پکاریے کفِ قاتل کو اب معالجِ دل
بڑھے جو ناخنِ خنجر، گرہ کشا کہیے

فسانہ جبر کا یاروں کی طرح کیوں مجروح
مزہ تو جب ہے کہ جو کہیے برملا کہیے

غلام ربانی تاباںؔ

نام غلام ربانی۔ تاباںؔ تخلص۔ تاریخ پیدائش ۱۵ فروری ۱۹۱۴ء اور وطن قائم گنج ضلع فرخ آباد ہے۔ میٹرک کے بعد مسلم یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ اور سینٹ جانسن کالج آگرہ سے بی اے پاس کیا۔ اس کے بعد آگرہ کالج سے ایل ایل بی پاس کرکے قریباً نو سال فتح گڑھ میں وکالت کی اور اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک سے منسلک بھی ہو گئے جس کی بناء پر ۱۹۴۹ء میں گرفتار کرلیئے گئے۔ چند مہینوں کے بعد دہلی آکر مکتبۂ جامعہ میں جنرل منیجر کے فرائض انجام دینے لگے۔

ہونٹ جلیں یا سینہ سلگے کوئی ترس کب کھاتا ہے
جام اُسی کا جس نے تاباںؔ جرأت سے کچھ کام لیا

غلام ربانی تاباں

لمحۂ درد کو افسانۂ تمنا جانو
ظرف کی بات ہے، قاتل کو مسیحا جانو

آپ ہیں موجِ صبا، موجِ شمیم، موجِ نمو
پھول کھل جائیں تو ظالم کا سراپا جانو

تم نے کب دیکھے وہ لمحے جو گزرتے ہی نہیں
درد کی رات کسے کہتے ہیں تم کیا جانو

وقت بے درد سہی، ساقی بے فیض سہی
مے کشو تلخیٔ ایام کو صہبا جانو

یوں تو ہر جلوۂ رنگیں کو تماشا سمجھو
اُن کی محفل میں مگر خود کو تماشا جانو

دل میں خوں گشتہ تمنا کے سوا کچھ بھی نہیں
اب یہ تم پر ہے چمن سمجھو کہ صحرا جانو

کیسے گزرو گے مراحل سے سفر کے تاباں
تم کہ منزل سے شناسا ہو نہ رستا جانو

٭٭٭

سکندر علی وجد

سکندر علی وجد ۲۲ جنوری ۱۹۱۴ء کو ویجاپور ضلع اورنگ آباد میں پیدا
ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں ہوئی اور وہیں ۱۹۲۹ء میں شاعری
کا آغاز ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں بی اے کے امتحان میں اردو اور فارسی میں عثمانیہ
یونیورسٹی حیدرآباد میں اول آنے پر وظیفۂ امتیاز ملا۔ آپ آندھرا کے بورڈ
اور سیکنڈری ایجوکیشن کے ممبر اور مہاراشٹر کے بورڈ میں اردو نصابیات کے ادبی
نگراں رہے ہیں۔

۱۹۶۴ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے لائف ممبر اور مہاراشٹر کی شاخ
کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں پدم شری کا اعزاز ملا۔ ۱۹۳۶ء میں حیدرآباد
سول سروس کے امتحانی مقابلہ میں کامیاب ہوئے اور ۱۹۳۷ء میں منصفی پر تقرر
ہوا۔ ترقی کرتے کرتے آپ سب جج اور اڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے
عہدوں پر فائز ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں ملک کی تنظیم جدید میں سیشن جج کی حیثیت
سے مہاراشٹر میں منتقل ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں وقت سے پہلے ملازمت سے
سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۷۲ء میں مہاراشٹر سے راجیہ سبھا کے ممبر منتخب ہوئے۔
آپ کا شمار نظم کے باکمال شاعروں میں ہوتا ہے۔ غزل بھی خوب کہتے ہیں۔ شاعری
کے چار مجموعے چھپ چکے ہیں۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی نے ان کے ایک مجموعے
"بیاضِ مریم" پر تین ہزار روپے کا پہلا انعام دیا ہے۔

وہ مقام میکدے ہیں وہ جہاں جہاں رکے ہیں
ہیں قدم قدم پہ گلشن وہ گذر گئے جدھر سے

سکندر علی وجدؔ

نہ آگہی کے لئے ہے نہ بے خودی کے لئے
سجی ہے بزمِ جہاں صرف دوستی کے لئے

چلو تو حسن و جوانی کے ساتھ ساتھ چلو
یہ وقت و موج ہیں، رکتے نہیں کسی کے لئے

بتا تعلقِ خاطر نہیں تو پھر کیا ہے
یہ نام خوب ملا تیری بے رخی کے لئے

رہِ حیات سراسر بھری ہے کانٹوں سے
قدم قدم پہ مصیبت ہے آدمی کے لئے

گراں فروش ہے کس درجہ کارگاہِ جہاں
ہزار اشک ہیں درکار اک ہنسی کے لئے

خوشی کو لعل و گہر سے خریدنے والے
تمام عمر تڑپتے رہے خوشی کے لئے

کلامِ وجدؔ سے دل کی کلی چٹکتی ہے
یہ ارمغاں ہے خیابانِ خامشی کے لئے

اعجاز صدیقی

حضرت سیماب اکبرآبادی جیسے بلند پایہ اُستاد شاعر و ادیب کے صاحبزادے تھے۔ ان کا اصلی نام اعجاز حسین صدیقی تھا ان کی پیدائش آگرہ میں ۱۹۱۲ء میں ہوئی۔ شعر و ادب کا ذوق ورثہ میں ملا۔ ۱۹۵۰ء میں بمبئی تشریف لائے اور یہیں وفات پائی۔ آخری سانس تک اُردو زبان اور ادب سے پیار کیا ۱۹۳۳ء سے ماہنامہ "شاعر" نکالتے رہے۔ ہر حالت میں اپنے رسالے کو جاری رکھا۔ اس کے ذریعہ ہر مکتبِ خیال کے ادیبوں اور شاعروں کو ادبی دُنیا سے واقف کرایا۔ چند ایک خصوصی نمبر بھی پیش کئے۔ اُردو زبان پر ان کے لکھے ہوئے اداریے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

اپنی تصانیف اور نظموں پر کئی انعامات حاصل کئے۔

مہاراشٹر اردو اکیڈیمی نے انھیں خصوصی انعام سے نوازا۔

سوئی ہوئی لگتی ہیں ۔۔ سبھی جاگتی آنکھیں
اوڑھے ہوئے تو بھی کوئی خوابوں کی رِدا چل

اعجاز صدیقی

رہ گئے بے نقاب ہوئے اِبر کھلے
کتنے ہی راز ہم پہ سرِ رہ گزر کھلے

پہنچا نہ بڑھ کے محملِ شب تک کسی کا ہاتھ
چاہا کئے کہ بندِ قبائے سحر کھلے

اکثر رہی ہے چھیڑ نسیمِ خیال سے
اکثر وہ بامِ شوق پہ آئے ہیں سر کھلے

جب تک تھے پستیوں میں، بڑے مضمحل سے تھے
اونچی ہوئی اڑان تو کچھ بال و پر کھلے

پہلے سے جانتا تو نہ چلتا میں ان کے ساتھ
اب دور آ گیا ہوں تو یہ ہمسفر کھلے

ہر ہر قدم ہے فطرتِ خود دار کارساز
بند ایک در ہوا تو کئی اور در کھلے

شمیم کرہانی کا شمار اس دور کے اچھے شاعروں میں ہوتا ہے
آپ کا سب سے پہلا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

دیکھ کر میکدے پر ابرِ بہار
رندِ مفلس کی آنکھ بھر آئی

ان کا وطن کرہان ضلع اعظم گڑھ ہے۔ عرصہ تک اعظم گڈھ میں معلمی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے ان کا پہلا مجموعہ "برق و باراں" کے نام سے ۱۹۳۹ء میں شائع کیا نظم پر انھوں نے زیادہ زور دیا اور غزلیں بھی ایک خاص رنگ میں کہتے رہے۔ شاعری کے علاوہ آپ نے ہندی ناولوں کے اردو میں ترجمے بھی کئے۔ بچوں کے لئے انگریزی نظموں کا ترجمہ بھی اردو والوں کے لئے پیش کیا۔ محکمہ تعلیمات ہند سے انھیں وظیفہ مقرر تھا۔ ابھی حال ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

جو ہم سفر سرِ منزل نظر نہیں آتے
جنونِ شوق میں آگے نکل گئے ہونگے

شمیم کرہانی

پی کر بھی طبیعت میں، تلخی ہے گرانی سے
اس دور کے شیشوں میں صہبا ہے کہ پانی ہے

اس شہر کے قاتل کو دیکھا تو نہیں، لیکن
مقتل سے جھلکتا ہے قاتل کی جوانی ہے

جلنا تھا جو گھر میرا کچھ لوگ یہ کہتے تھے
کیا آگ سنہری ہے کیا آنچ سہانی ہے

اس فن کی لطافت کو لے جاؤں کہاں آخر
پتھر کا زمانہ ہے، شیشے کی جوانی ہے

کیا تم سے کہیں کیا ہے آہنگ شمیم اپنا
شعلوں کی کہانی ہے، شبنم کی زبانی ہے

بیز

یاران سست گام سے مجبور ہو گئے
ورنہ ہوائے شوق سے پوچھو کہ کیا تھے ہم

جام چلنے لگے، دل مچلنے لگے، انجمن جھوم اٹھی بزم لہرا گئی
بعد مدت جو محفل میں تم آ گئے جیسے بے جان قالب میں جان آگئی

خورشید احمد جامی

مئی سنہ ۱۹۱۵ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ شعر گوئی سنہ ۱۹۳۵ء میں شروع کی۔ تین ابتدائی شعری مجموعے "شرارے"، "نشانِ راہ" اور "منزل کی طرف" تھے۔ چوتھا مجموعہ ان کی حیات ہی میں "رخسارِ سحر" کے نام سے سنہ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا اور پانچواں مجموعہ 'برگِ آوارہ' کے نام سے سنہ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ ایک مختصر مجموعہ ان کے انتقال ۲۸ مارچ سنہ ۱۹۷۰ء کے کچھ دن بعد "یاد کی خوشبو" کے نام سے ان کے شاگرد رشید محمود خاور نے شائع کیا اور ان کی یادگار کے طور پر محمود خاور حیدر آباد سے ایک ادبی ہفتہ وار "برگِ آوارہ" کے نام سے نکالتے ہیں جو ادبی حلقوں میں مقبول ہے۔

لپکے پھرتی ہیں آندھیاں جسکو
زندگی ہے وہ برگِ آوارہ

خورشید احمد جامی

رات چپ چاپ ہے راہوں کے مسافر ہیں اُداس
کوئی دل چسپ کہانی بھی نہیں وقت کے پاس

زندگی آج وہ تاریک مکاں ہے جس میں
منہ چھپائے ہوئے بیٹھا ہے سحر کا افلاس

اب بھی رُکتا ہے کسی یار کے دروازے پر!
چند بچھڑے ہوئے خوابوں کا سُلگتا احساس

کتنے چہروں پہ کڑی دھوپ ہے صحراؤں کی
کتنی آنکھوں میں نظر آتی ہے اک عمر کی پیاس

شہرِ امید بھی وہ دشتِ وفا ہے جامیؔ
اب جہاں کوئی نہیں چارہ گرِ درد شناس

⁂

جس طرف مجمعِ احباب کھڑا تھا جانی
ہم پہ آئے تو اسی سمت سے پتھر آئے

⁂

جس طرف دیکھئے ماحول کی پیشانی پر
ایک جلتی ہوئی تحریر نظر آتی ہے

⁂

○

چند جلتے ہوئے خوابوں کے خریدار بنے
ہم سبھی تو نئے دور کے فن کار بنے

یا ند نکلا تو کسی یاد نے دستک دی ہے
نگ بکھرے ہیں عکسِ لب و رخسار بنے

ل میں جو زخم ہے اک حرفِ تمنا کی طرح
کاش ایسا ہو کہ وہ جرأتِ اظہار بنے

دھوپ صدیوں کی لئے پھرتے ہیں بستی بستی
دیکھئے کون یہاں سایۂ دیوار بنے

ہائے اس طرح بھی اک عمر کٹی ہے جامی
بھی افسانے کا جیسے کوئی کردار بنے

○

شب کے ماتھے پہ کرن پیار کی لہراتی ہے
زندگی درد کے پہلو میں سمٹ آتی ہے

دن گزرتا ہے اُجالوں کی توقع کرتے
رات زخموں کی مدارات میں کٹ جاتی ہے

میری راتوں سے ترے خواب لپٹ جاتے ہیں
میرے گیتوں سے ترے جسم کی آنچ آتی ہے

جس طرف دیکھئے ماحول کی پیشانی پر
ایک جلتی ہوئی تحریر نظر آتی ہے

فاصلے اور بھی قربت کا نشاں ہیں جامی
تیرگی اور بھی افکار کو چمکاتی ہے

○

سحر کے ساتھ چلے روشنی کے ساتھ چلے
تمام عمر کسی اجنبی کے ساتھ چلے

تمہارے شہر میں انجان سا مسافر تھا
تمہارے شہر میں جس آدمی کے ساتھ چلے

خیالِ یار بھی آتا ہے اب تو یوں جیسے
ہوائے موسمِ گل بے دلی کے ساتھ چلے

سحر کے وقت اندھیروں نے آلیا ہم کو
شبِ فراق تو ہم روشنی کے ساتھ چلے

چلے تو ساغر و مینا کی بات بھی جامی
خلوصِ درد و غمِ آگہی کے ساتھ چلے

○

نہ دل کے داغ ہی چمکے نہ تم ہی یاد آئے
شبِ فراق کئی ماہتاب گہنائے

شعورِ غم کے سوا کچھ نہیں ہے غم کا علاج
مگر یہ بات زمانے کو کون سمجھائے

دلِ حزیں پہ جہاں کوئی حادثہ گزرا
مجھے گماں ہوا تم مرے قریب آئے

نئے غموں سے تعارف کرا دیا میرا
تمہاری یاد نے احساں ہی تو فرمائے

رہِ حیات ہے جامی غبار آلودہ
مرا خلوص مرا غم کسے نظر آئے

نازش پرتاب گڑھی

نام شیخ محمد احمد، نازش تخلص تھا۔ جائے ولادت پرتاب گڑھ ہے۔ تاریخ پیدائش سنہ ۱۹۲۲ء ہے۔ ابتدائی عمر سے شعر گوئی کی طرف رجحان رہا۔ تیرہ یا چودہ سال کی نازک عمر ۱۹۳۵ء میں آغازِ سخن فرمایا۔ شاعری کا اولین محرک ان کے اسکول کا انتہائی مشاعرہ ہے۔ ان کا ذوقِ سخن اتنی شدت سے بڑھا کہ "دائرہ جنوں" میں داخل ہو گیا۔ مجبوراً اسکول کی تعلیم ترک کرنی پڑی۔ ۱۹۴۰ء کے اواخر میں علامہ سیماب اکبرآبادی جیسے ماہر استاد کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ ان کے دو دیوان "ہندوستان جاگ اٹھا" اور "زندگی سے زندگی کی طرف" شائع ہو چکے ہیں۔ اردو ادب کے ایک قابلِ قدر ممتاز شاعر ہیں۔

آپ کی یاد اب آئے بھی تو محسوس نہ ہو
دل ہے دیہات کی سونی ہوئی راہوں کی طرح

نازش پرتاب گڈھی

خاموشیوں کو ندرتِ گفتار کہہ گئے
کیا لوگ تھے جو دار کو دلدار کہہ گئے

طوق و رسن کو نام دیا زلفِ دوست کا
زنداں کو سایۂ مژۂ یار کہہ گئے!

اپنی ہی طرح وہ بھی رہین ستم تھے، جو
شام و سحر کو کاکل و رخسار کہہ گئے

ہاں اے حیات سخت و گراں، ہم پہ ناز کر
ہم تھے کہ ہر ستم کو ترا پیار کہہ گئے

اب اور کیا رکھا تھا ترے وحشیوں کے پاس
اک حرف شوق تھا جو سرِ دار کہہ گئے

اپنی ذہانتوں نے دیا اس طرح فریب
خوابوں کو ہم بلندیٔ افکار کہہ گئے

اے زندگی، وہی قدر رعنائے حسن تھا
تیرے ادا پرست جسے دار کہہ گئے

نازشؔ وہ خود بھی آخری دم تک جیا کیے
جو لوگ زندگی کو اک آزار کہہ گئے

نشور واحدی

نام: حفیظ الرحمٰن، تخلص نشور، خاندانی نسبت واحدی۔ بلیا کے ایک گاؤں "شیخ پور" میں ۱۹۱۱ء میں جمیل احمد صدیقی کے گھر پیدا ہوئے۔ الٰہ آباد اور کانپور میں تعلیم حاصل کی۔

غزلیں اپنے الگ رنگ میں لکھتے ہیں۔ مشاعروں میں آپ کی شرکت مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

ہر ذرہ نشور ہے سفر میں
کہنے کو یہاں قیام سا ہے

نشورؔ واحدی

○

رنگ گلی کا اڑ چلے، گل کا خمار چھوٹ جائے
وہ جو چمن فروز ہوں، رنگ بہار چھوٹ جائے

جلوہ و رقص و رنگ میں حسن کا کیا مقابلہ
باد سحر بھی اک طرف گل بہ کنار چھوٹ جائے

وہ جو چلیں تو ساتھ ہوں انجم و ماہ و کہکشاں
پیچھے کہیں ہجوم میں فصل بہار چھوٹ جائے

رہبر منزل خرد، ایسی بھی کیا ترقیاں
ہونٹ سے گر پڑے ہنسی، آنکھ سے پیار چھوٹ جائے

○

فریب شوق کو تخیلات کہتے آئے ہیں
بکھر گئے تو گیسوؤں کو رات کہتے آئے ہیں

اسی کو زندگی کا ساز دے کے مطمئن ہوں میں
وہ حسن جس کو حسنِ بے ثبات کہتے آئے ہیں

یہ نوجواں تو زندگی کو زندگی نہ کہہ سکے
جوانیوں میں موت کو حیات کہتے آئے ہیں

غزل ہے نام حسن کے معاملاتِ خام کا!
خطا ہوئی کہ دلبروں کی بات کہتے آئے ہیں

قتیلؔ شفائی

اورنگ زیب خاں نام اور قتیلؔ تخلص ہے ۔ ۱۹۱۹ء میں ہری پور ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے ۔ راولپنڈی میں تعلیم حاصل کی ۔ اس کے بعد کاروبار میں لگ گئے ۔ مزاج میں شاعری رچی ہوئی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں نام پیدا کیا ۔ آجکل پاکستان میں فلمی دنیا سے متعلق ہیں ۔ "ہریالی" "گجر" "جل ترنگ" اور "جھومر" ان کے کلام کے مجموعے ہیں ۔

غزل اور نظم دونوں کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں ۔ ان کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مترنم بحروں کا انتخاب کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے شعر میں موسیقیت اور غنائیت ہوتی ہے ۔ اردو دنیا کے یہ مقبول ترین شاعر ہیں ۔

چلو اچھا ہوا کام آگئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

قتیل شفائی

○

تمہاری انجمن سے اُٹھ کے دیوانے کہاں جاتے
جو وابستہ ہوئے تم سے وہ افسانے کہاں جاتے

نکل کر دیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ میخانہ
تو ٹھکرائے ہوئے انساں خدا جانے کہاں جاتے

تمہاری بے رُخی نے لاج رکھ لی بادہ خانے کی
تم آنکھوں سے پلا دیتے تو پیمانے کہاں جاتے

چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی!
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

قتیلؔ اپنا مقدر غم سے بیگانہ اگر ہوتا
تو پھر اپنے پرائے ہم سے پہچانے کہاں جاتے

○

گرمیٔ حسرتِ ناکام سے جل جاتے ہیں
ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں

خود نمائی تو نہیں شیوۂ اربابِ وفا
جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں

شمع جس آگ میں جلتی ہے نمائش کے لیے
ہم اُسی آگ میں گمنام سے جل جاتے ہیں

جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

غزل نمبر

○

منظر سمیٹ لائے ہیں جو تیرے گاؤں کے
نیندیں چُرا رہے ہیں وہ جھونکے ہواؤں کے

پل بھر کو تیری یاد میں دھڑکا تھا دل مرا
اب دور تک بھنور پڑے ہیں صداؤں کے

تیری گلی سے چاند زیادہ حسیں نہیں
کہتے سُنے گئے ہیں مسافر خلاؤں کے

ہم نے لیا ہے جب بھی کسی راہزن کا نام
چہرے اُتر اُتر گئے کچھ رہنماؤں کے

دادِ سفر ملی ہے کِسے راہِ شوق میں
ہم نے مٹا دیئے ہیں نشاں اپنے پاؤں کے

زندہ تھے جن کی سرد ہواؤں سے ہم قتیل
اب زیرِ آب ہیں وہ جزیرے وفاؤں کے

○

ہر بے زباں کو شعلہ نوا کہہ لیا کرو
یارو، سکوت ہی کو صدا کہہ لیا کرو

گر چاہتے ہو خوش رہیں کچھ بندگانِ خاص
جتنے صنم ہیں، اُن کو خدا کہہ لیا کرو

انسان کا اگر قد و قامت نہ بڑھ سکے
تم اس کو نقصِ آب و ہوا کہہ لیا کرو

دکھلائے جا سکیں جو نہ کانٹے زبان کے
تم داستانِ کرب و بلا کہہ لیا کرو

لے دے کے اب یہی ہے نشانِ ضیا قتیل
جب دل جلے تو اس کو دیا کہہ لیا کرو

غــزل نمبر

○

نگ جدا، آہنگ جدا، مہکار جدا
پہلے سے اب لگتا ہے گلزار جدا

نموں کی تخلیق کا موسم بیت گیا
ٹوٹا ساز تو ہو گیا تار سے تار جدا

بیزاری سے اپنا اپنا جام لیے
بیٹھا ہے محفل میں ہر مے خوار جدا

سوچتا ہے اک شاعر بھی اک تاجر بھی
لیکن سب کی سوچ کا ہے معیار جدا

مل جاتا ہے موقع خونی لہروں کو
ہاتھوں سے جب ہوتے ہیں پتوار جدا

کس نے دیا ہے سدا کسی کا ساتھ قتیلؔ
ہو جاتا ہے سب کو آخر کار جدا

○

انگڑائی پر انگڑائی لیتی ہے رات جدائی کی
تم کیا سمجھو، تم کیا جانو بات مری تنہائی کی

ٹوٹ گئے سیال نگینے پھوٹ بہے رخساروں پر
دیکھو میرا ساتھ نہ دینا بات ہے یہ رسوائی کی

کون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں
میں نے آنکھ جھکی دیکھی ہے آج کسی ہرجائی کی

وصل کی رات نجانے کیوں اصرار تھا ان کو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

مجید امجد

اصلی نام عبدالمجید اور تخلص امجدؔ جھنگ (مگھیانہ) میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ آٹھ نو برس اخبار "عروج" کے ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد سرکاری ملازمت میں آ گئے۔ محکمۂ خوراک میں اے ایف سی بھی تھے۔ غزلوں اور نظموں میں کلاسیکی رچاؤ کے قائل نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "شب رفتہ" ۱۹۵۸ء میں چھپ چکا ہے۔

نگہ اُٹھی تو زمانے کے سامنے ترا رُوپ
پلک جھکی تو مرے دل کے رُوبرو، ترا غم

مجید امجد

جنونِ عشق کی رسم عجیب کیا کہنا
میں اُن سے دور وہ میرے قریب کیا کہنا

یہ تیرگیٔ مسلسل میں ایک وقفۂ نور
یہ زندگی کا طلسمِ عجیب کیا کہنا

جو تم ہو برقِ نشیمن، تو میں نشیمنِ برق
الجھ پڑے ہیں ہمارے نصیب کیا کہنا

ہزار قافلۂ زندگی کی تیرہ شبی
یہ روشنی سی افق کے قریب کیا کہنا

لرز گئی تری لَو میرے ڈگمگانے سے
چراغِ گوشۂ کوئے حبیب کیا کہنا

☆

بچا کے رکھتا ہے جس کو غروبِ جاں کیلئے
یہ ایک صبح تو ہے سیرِ بوستاں کیلئے

گوپال مِتّل

۵ر جون ۱۹۰۹ء کو ریاست مالیر کوٹلہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں لاہور سے گریجویشن کیا۔ شاعری کا آغاز طالب علمی کے زمانے ہی میں ہو گیا تھا۔ لدھیانے سے "صبحِ امید" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ پھر بالترتیب "شاہکار" اور "ادبِ لطیف" لاہور کے مدیر رہے۔ تقسیم کے بعد دلی آ گئے اور ۱۹۵۳ء میں ماہنامہ "تحریک" جاری کیا۔ کلام کے دو مجموعے "دو راہا" اور "صحرا میں اذاں" شائع ہوئے ہیں۔ نثر میں بھی دو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ "ادب میں ترقی پسندی" اور "لاہور کا جو ذکر کیا"۔ تراجم ان کے علاوہ ہیں جن میں الیگزنڈر سولزے نتسن کے مشہور ناول "کینسر وارڈ" کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ کچھ کتابیں تالیف بھی کی ہیں۔

مجھے زندگی کی دُعا دینے والے
ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر

گوپال متّل

○

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
میں سونے مکان کا دیا ہوں

منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی
آشوبِ سفر میں مبتلا ہوں

محمل بھی نہیں کوئی نظر میں
صحرا کی بھی خاک چھانتا ہوں

منصور نہ دعویٔ انا الحق!
سولی پہ مگر لٹک رہا ہوں

اے اہلِ کرم نہیں میں سائل
رستے پہ یونہی کھڑا ہوا ہوں

مشکل نہیں ترکِ عشق لیکن!
اِس کا بھی مآل جانتا ہوں

○

بے مہریٔ حبیب کا مشکل تھا اعتراف
یاروں نے اس کا نازو ادا نام رکھ دیا

فطرت میں آدمی کی ہے مبہم سا ایک خوف
اس خوف کا کسی نے خدا نام رکھ دیا

یہ روح کیا ہے جسم کا عکسِ لطیف ہے
یہ اور بات ہے کہ جدا نام رکھ دیا!

میکش اکبرآبادی

نام محمد علی، میکش تخلص، وطن آگرہ، سال ولادت ۱۹۰۵ء اکبرآباد کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُردو، فارسی، عربی، ہندی اور انگریزی پر عبور رکھتے ہیں۔ اُردو کے کہنہ مشق شاعر اور ادیب ہیں۔ کلام کے دو مجموعے "میکدہ" اور "حرفِ تمنا" چھپ کر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کی کامیاب تصنیف "نقدِ اقبال" نے انھیں کافی شہرت بخشی۔

میں نہ دیکھوں تو ترے حُسن کی قیمت کیا ہے
میں نہ تڑپوں تو یہ اندازِ جفا کچھ بھی نہیں

میکش اکبرآبادی

○

گزر گیا ہوں حدِ مرسے ترا خیال لئے
چمن سے پھول، حسینوں نے دل نثار کئے

تری نظر کو نہ دیکھا، جہاں نے یہ دیکھا
کہ خار کس کو چبھائے ہیں، پھول کس کو دئے

زباں سے جنگ، نگاہوں سے صلح ساری عمر
نہ جل سکے نہ بجھے میری آرزو کے دیئے

○

یہی سوچتا رہا میں کہ ہے گل حسیں کہ شبنم
مجھے پوچھنا تھا اُن سے کہ یہ آنکھ کیوں ہوئی نم

یہ نظر نظر، یہ نفس نفس ترانہ
یہی عشق کا زمانہ، یہی دلبری کا موسم

○

بدل گیا ہے چمن میں مزاج لالہ و گل
ہے اک مجھی میں تری بوئے پیرہن باقی!

ہوا زمانہ کہ رستے ہیں عشق کے ویراں
نہ راہرو ہی کوئی ہے نہ راہزن باقی

نہ بتکدے میں برہمن، نہ شیخ کعبہ میں
مگر ہے معرکۂ شیخ و برہمن باقی

مجھی کو قدرِ زمانہ نہیں ہے اے میکش
وگرنہ ہے تو زمانے میں قدرِ فن باقی

آل احمد سرور — سری نگر

مکرمی — تسلیم!

آپ کا ۴ فروری کا خط مجھے پرسوں سری نگر واپس آنے پر ملا۔ یہ معلوم کرکے مسرت کہ آپ غزل نمبر شائع کر رہے ہیں جو اُس انتخاب پر مشتمل ہوگا جو جاں نثار مرحوم نے ولی سے ترقی پسند تحریک ور تک کیا تھا۔ اُمید ہے کہ یہ نمبر ہر لحاظ سے جامع ہوگا۔ جاں نثار کی نظر ہمارے شعری سرمائے پر گہری تھی اور ذوق بھی بلند تھا۔ میں چونکہ اب سری نگر میں ہوں اس لئے اس پتے پر لکھیئے۔

مختصر حالات:

(۱) پیدائش: ۷ اکتوبر ۱۹۱۲ء　(۲) تعلیم: ایم۔اے (انگریزی) ایم۔اے (اردو)

(۳) ملازمت: لیکچرر انگریزی۔ لیکچرر اردو (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۳۴ء–۱۹۴۳ء)
ریڈر اردو لکھنؤ یونیورسٹی (۱۹۴۶ — ۱۹۵۵ء)

(۴) سید حسین ریسرچ سروسیز۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (دسمبر ۱۹۵۵ء تا اگست ۱۹۵۸ء) (۵) پروفیسر و صدر ہ اردو۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ستمبر ۱۹۵۸ء سے اکتوبر ۱۹۷۳ء) (۶) وزیٹنگ فیلو۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ ٹڈی (مارچ ۱۹۷۴ء سے مارچ ۱۹۷۷ء) (۷) اقبال سروسیز۔ کشمیر یونیورسٹی مئی ۱۹۷۷ء سے (۸) اعزازی سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند (۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۴ء) (۹) ایڈیٹر "ہماری زبان" انجمن ترقی اردو ہند (۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۴ء) ایڈیٹر "اردو ادب" انجمن ترقی اردو ہند (۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۴ء) (۱۱) ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ۔ ۱۹۷۴ء (۱۲) یو۔ پی اردو ڈمی ایوارڈ۔ ۱۹۷۶ء (۱۳) وزیٹنگ سروسیز۔ شکاگو یونیورسٹی (۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۰ء) (۱۴) ہارورڈ۔ وِس کانسن، سوٹا، پین سلوانیا اور میک گل یونیورسٹیوں میں لیکچر (۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۰ء) (۱۵) سوویت یونین، رومانیہ، ہنگری، افغانستان سفر — تصانیف: (۱) تنقیدی اشارے (۲) نئے اور پرانے چراغ (۳) تنقید کیا ہے (۴) ادب اور نظریہ نظر اور نظریے (۶) مسرت سے بصیرت تک — انتخاب: انتخاب جدید (۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۲ء تک) عزیز احمد کے ساتھ عری: (۱) سلسبیل (۲) ذوقِ جنوں — تیسرا مجموعہ زیر ترتیب — تدوین: (۱) تنقید کے بنیادی مسائل (۲) ادب اور جدیدیت ، عرفانِ غالب (۴) عکسی غالب (۵) اردو فکشن — کل ۱۴ کتابیں۔

مخلص
آل احمد سرور
۲ مارچ ۱۹۷۸ء

آل احمد سرور

لو دھندلکوں سے بھی انداز اجالوں کے لئے
نئی افتاد پڑی دیکھنے والوں کے لئے

کام ماضی کی وہ سادہ نگہی کیا آتی
عصرِ حاضر ترے پیچیدہ سوالوں کے لئے

شمعیں کیا کیا بجھیں نادیدہ سحر کی خاطر
کتنے سورج گئے، موہوم اجالوں کے لئے

کتنے سنگین حقائق سے پنجہ لڑا ہے ہمو
چند خوابوں کے لئے، چند خیالوں کے لئے

گو نگہ داریٔ آدابِ جنوں مشکل ہے
پھر بھی آساں ہے ترے چاہنے والوں کے لئے

سو سو طرح سے تجھ کو سزاوار ہے حسنِ دوست
سو سو طرح سے رنگ بدلتے رہے ہیں ہم

جہاں میں کس کو گوارا ہوئی ہے فکر کی دھوپ
ہر اک، کوئی شجرِ سایہ دار مانگے ہے

جگن ناتھ آزاد

جگن ناتھ آزاد دسمبر ۱۹۱۸ء میں بمقام عیسیٰ خیل (پنجاب) پیدا ہوئے۔ ادبی ذوق وراثت میں ملا۔ ان کے والد جناب تلوک چند محروم اُردو کے نامور شاعر تھے۔ آزاد نے تعلیم و تربیت انھیں سے حاصل کی۔ لاہور میں مولانا تاجور نجیب آبادی اور ڈاکٹر سید محمد عبداللہ سے اکتساب فیض کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا۔ تقسیم کے بعد دہلی میں چند سال "آج کل" کے مدیر معاون بھی رہے ۱۹۵۵ء میں وزارت اطلاعات و نشریات میں اُردو کے انفارمیشن آفیسر مقرر ہوئے۔ آپ کا کلام معیاری ادبی رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ بڑے بڑے مشاعروں میں بھی شرکت کرتے رہتے ہیں۔ "بیکراں"۔ "ستاروں سے ذروں تک"۔ "وطن میں اجنبی"۔ "آر دو" "نشانِ منزل" کے نام سے ان کے شعری اور نثری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

مری نگاہ کو سجدے کا حوصلہ نہ تھا
اگرچہ میں بھی ترے آستاں سے گزرا ہوں

فن اور شخصیت

جگن ناتھ آزاد

○

نسیم شعلہ بنی اور شاخِ گل تلوار
کچھ اس طرح سے گلستاں میں آئی فصلِ بہار

سکوں ملا جو نظر کو تو دل تڑپ اٹھا
دل و نظر کو بہم مل سکا کبھی نہ قرار

خزاں کو صحنِ چمن سے گئے زمانہ ہوا!
ابھی فضائے گلستاں میں اڑ رہا ہے غبار

○

مری نگاہ کو سجدے کا حوصلہ ہی نہ تھا
اگرچہ میں بھی ترے آستاں سے گذرا ہوں

کہیں مذاقِ نظر کو قرار مل نہ سکا
کبھی چمن سے، کبھی کہکشاں سے گذرا ہوں

ترے قریب سے گذرا ہوں اس طرح کہ مجھے
خبر بھی ہو نہ سکی میں کہاں سے گذرا ہوں

٭٭٭

سلام مچھلی شہری

قصبہ مچھلی شہر ضلع جونپور کے ایک محلہ مولویانہ میں ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی مذہبی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر ۱۹۳۵ء میں انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے اودھ آ گئے اور یہیں پر ان میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ کئی امتحانات بھی پاس کئے اور الہ آباد میں ملازم ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں گیت کار کی حیثیت سے کام کیا۔ ریڈیو کشمیر سری نگر میں نیچر رائٹر بھی رہے۔ اس کے بعد لکھنؤ ریڈیو اور اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو دہلی میں کام کرنے لگے۔ پہلا مجموعہ کلام "میرے نغمے" دو حصّوں میں ترتیب دیا۔ پہلا حصّہ "پھول" شائع ہو گیا مگر دوسرا حصّہ "انگارے" شائع نہ ہو سکا۔ دوسرا مجموعہ "وسعتیں" لاہور سے شائع ہوا۔

شاعری میں انھوں نے کئی تکنیکی تجربے کئے جو قابلِ قدر بھی ہیں قابلِ تقلید بھی ہیں۔ حال ہی میں ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔

میری موت اے ساقی! اِرتقاء ہے مستی کا
اک سلام جاتا ہے ایک آنے والا ہے

سلام مچھلی شہری

کہاں ہم اور کہاں یہ جلوہ ہائے جام جم ساقی
یونہی بس رکھ لیا کرتے ہیں جینے کا بھرم ساقی

نہیں میں، شادماں ہوں، زندگی پر ہنس بھی سکتا ہوں
اب اس کو کیا کروں گر ہو گئی ہے آنکھ نم ساقی

نہ جانے زندگی کی کتنی مبہم رہ گزاروں میں
لئے پھرتی ہے مجھ کو تیری زلفِ خم بہ خم ساقی

زمانہ اُڑ رہا تھا آسماں تا آسماں، لیکن
حضورِ جام و مینا ہو گئی رفتار کم ساقی

سویرا ہوتے ہوتے میکدے سے اُٹھ ہی جاؤں گا
ابھی تھوڑا بہت باقی ہے ان آنکھوں میں دم ساقی

مطرب! بس ایک گیت کہ ڈھلنے لگی ہے رات
ساقی! بس ایک جام کہ زندہ رہیں گے ہم

اختر سعید   بھوپال

بھائی صابر دت!

میرا نام —— اختر سعید۔

ولدیت —— حامد سعید خاں صاحب مرحوم۔

تاریخ پیدائش —— ۲ اکتوبر ۱۹۲۳ء۔

مقام —— بھوپال۔

تعلیم —— بی۔اے۔ ایل۔ایل۔بی۔ دلی، لاہور اور علی گڑھ میں پڑھا۔

مشاغل —— پیشہ ورانہ مصروفیات کے بعد شعر و ادب۔

غالباً [illegible] میں شعر کہنا شروع کیا۔ ۱۹۳۶ء سے ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستہ ہوں۔ ان دنوں کل ہند ترقی پسند مصنفین کا سکریٹری بھی ہوں۔ ۱۹۵۰ء سے کمیونسٹ پارٹی کے حامیوں میں ہوں۔ عرصہ دراز تک عملی طور پر سرگرم رہا۔ سال بھر جلاوطنی کی زندگی گزاری۔ دس گیارہ برس میونسپل کونسل بھوپال کا ممبر رہا۔ ورلڈ پیس کونسل، انڈو سوویت کلچرل سوسائٹی انجمن ترقی اردو اور خدا جانے کن کن جماعتوں سے منسلک اور ان کا عہدیدار رہا۔ بار ایسوسی ایشن بھوپال کا سکریٹری —— ۱۹۵۷ء سے ریڈیو کے لئے ہر طرح کے مضامین لکھتا رہتا ہوں۔

باقاعدہ مضمون نگاری کی فرصت کہاں اس لئے لکھنے کے بجائے بولتا زیادہ ہوں۔ زندگی بھر کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دے پایا جس پر فخر کروں۔ نہ کوئی ایسی حرکت سرزد ہو سکی جس کی وجہ سے شرم سے گردن جھکائے رہوں۔

جو کچھ پایا اپنے باپ حامد سعید خاں صاحب مرحوم کی توجہ اور اپنے بھائی اظہر سعید خاں کی رفاقت سے۔

والسلام

اختر سعید
10-2-78

اختر سعید

○

اک کرن دہر کی ظلمات پہ بھاری ہوگی
رات اُن کی ہے مگر صبح ہماری ہوگی

اسی نسبت سے سحر نکھری ہوئی آئے گی
جس قدر رات یہ بیمار پہ بھاری ہوگی

یہ جو ملتی ہے ترے غم سے غمِ دہر کی شکل
دل نے تصویر سے تصویر اُتاری ہوگی

اس طرف بھی کوئی خوشبو سے مہکتا جھونکا
اے صبا تو نے تو وہ زلف سنواری ہوگی

ہمصفیرانِ چمن آؤ پکاریں مل کر!!
یہیں خوابیدہ کہیں بادِ بہاری ہوگی

بُوئے گل آتی ہے مٹّی سے چمن کی جبتک
ہم پہ دہشت نہ خزاں کی کبھی طاری ہوگی

○

قیمتِ دل کا مجھے اندازہ کچھ ہو تو سہی
پھر چُرا لینا نگاہیں پہلے دیکھو تو سہی!

سرسری گزرو نہ شہرِ دل سے نا پُرسانِ غم
بات بھی کرنی مجھے آتی ہے پوچھو تو سہی!

پَل رہا ہو لائقِ تعبیر شاید کوئی خواب
میری ان اُجڑی ہوئی آنکھوں میں جھانکو تو سہی

اب جو ہم اس موڑ پر بچھڑے تو جائیں گے کدھر
کتنے آگے بڑھ چکے ہیں، مُڑ کے دیکھو تو سہی

بند رکھو گے دریچے دل کے یارو کب تلک
کوئی دستک دے رہا ہے اُٹھ کے دیکھو تو سہی

رائے سرب سنگھ دیوانہ، گاگاجی پروانہ، مرزا جعفر علی حسرت، میر حیدر علی حیران
... بیگ مائل، میر شیر علی افسوس، میاں حاجی تجلی، سعادت یار خاں رنگین
راجا رام نرائن موزوں، میر حسن لطیفی، میر امانی اسد، صاحب میر الم
... ولی اللہ محب، میر انیس، پیارے صاحب رشید، وحید الدین وحید
کرامت علی شہیدی، نواب مرزا محمد تقی ہوس، منور خاں غافل، شاہ مبارک آبرو
میر شرف الدین مضمون، محمد شاکر ناجی، مصطفیٰ خاں یکرنگ، شاہ قدرت اللہ قدرت
میر محمدی بیدار، شیخ بقاء اللہ بقا، میر محمد اثر، حافظ عبد الرحمٰن راسخ، نواب صفدر الدولہ آصف
ولی اللہ اشتیاق، محمد اشرف اشرف، حیدر بخش حیدری، ... کلاذعی، خواجہ برہان الدین آتش
مرزا احسن علی احسن، میر زین العابدین آشنا، شرف الدین ایہام، احسن اللہ خاں بیان۔
میر صلاح الدین تمکین، خواجہ حسن حسن، مرزا علی رضا رضا، میر سوز، لالہ شیو سنگھ ظہور
شاہ فضل علی فضل، نسمت، حکیم سعید احمد ناطق لکھنوی، وحشت کلکتوی، بیخود دہلوی
آل رضا لکھنوی، سہا مجددی، اقبال سہیل، عندلیب شادانی، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم
تاجور نجیب آبادی، ظہیر کاشمیری، ابن انشا، پنڈت امرناتھ ساحر، سائل دہلوی، بہزاد لکھنوی
بیدم وارثی، کرشن چند حیرت گونڈوی، احمد ریاض، حفیظ ہوشیارپوری، شاہد صدیقی
راہی معصوم رضا، نیاز حیدر، سراج لکھنوی، میرا جی، نرتیش کمار شاد، گنیش بہاری طرز
سلیمان اریب، حبیب اشعر، بسمل سعیدی، ماہر ہوشیارپوری، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، کالیداس گپتا رضا

... انداز بیاں اور

مرتب:-

صابر دت

"غزل کا سفر" میں مجھے جو بھی کمی نظر آئی اُس کو پُر کرنے
کے لئے میں نے چند شعراء کے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ میرا خیال
ہے کہ یہ شعراء اگر شامل نہ ہوتے تو ان کے ساتھ ناانصافی ہوتی۔
مجھے اُمید ہے کہ اُردو ادب کے شائقین، ادیب، شاعر اور نقاد
میرے اس خیال سے اتفاق کریں گے۔

صابر دت

⁂

نوٹ:۔ صفحات کی کمی کی وجہ سے بہت سارے شعراء
رہ گئے ہیں جس کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔

رائے سرب سُکھ دیوانہ

بعض تذکروں میں سرب سنگھ لکھا ہے، تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہو سکی ہاں تاریخ وفات کہیں ۱۸۱۶ء اور کہیں ۱۸۱۹ء ملتی ہے۔ دہلی کے کھتری ہندو گھرانے سے تعلق تھا۔ وضع قطع بالکل ایرانیوں جیسی رکھتے تھے۔ اردو اور فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ دہلی اُجڑی تو لکھنؤ چلے آئے۔ نفیس مزاج، وجیہہ اور خشکیل جوان تھے اور بڑی امیرانہ شان سے رہتے تھے۔ "عشقیہ" "دردیہ" اور "زرقیہ" ان کے تین فارسی دیوان ہیں اور "خم خانۂ جاویداں" کا اردو دیوان ہے۔ اپنے وقت کے مستند اور استاد شاعر تھے۔ افسوس کہ تذکروں میں انھیں اکثر نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ ان کا اردو اور فارسی ادب میں چھوڑا ہوا سرمایہ گرانقدر ہے لیکن بہت ہی کم کلام محفوظ ہے۔ ان کے شاگردوں میں جعفر علی حسرت نے کافی شہرت پائی اور حسرت صاحب کے کئی شاگرد ہوئے۔ پھر ان سے اُستادی شاگردی کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ یہ سلسلہ رضا علی وحشت پر آکر رُکتا ہے۔

جب نہ تب سُنئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر ؛ گفتگو ہم سے اسے پر نہیں انکار بغیر

بزم میں رات بہت سادہ و پرفن تھے، ولے ؛ گرمیٔ بزم کہاں اس بُتِ عیّار بغیر

دیکھ بیمار کو تیرے، یہ طبیبوں نے کہا ؛ ہو چکی اسکو شفا شربتِ دیدار بغیر

جان پر آبنی ہمدم، میری خاموشی سے ؛ بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر

جس کی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوئے ؛ کیونکر دیوانہ بھلا رہیئے اب اس یار بغیر

کاکاجی پروانہ

کاکاجی، سرب سُکھ دیوانہ کے شاگرد اور جعفر علی حسرت کے ہمعصر تھے۔ افسوس ہے کہ ان کے حالات دستیاب نہیں۔ کلام صاف اور سادہ ہے۔

ضعف ہے عشق ہے، ناتوانی ہے ؛ بن ترے موت زندگانی ہے
کون مدفون ہے چمن میں صبا ؛ جس کی تربت پہ گلفشانی ہے

مرزا جعفر علی حسرت

مرزا جعفر علی حسرت، رائے سرب سکھ دیوانہ کے شاگرد اور جرأت کے استاد تھے، قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کا دیوان دستیاب نہیں ہو سکا۔

ہے کس کا جگر جس پہ یہ بیداد کروگے ؛ لو ہم تمہیں دل دیتے ہیں کیا یاد کروگے

تمہیں غیروں سے کب فرصت، ہم اپنے غم سے کب خالی
چلو بس ہو چکا ملنا، نہ تم خالی نہ ہم خالی

یہ بھی اک ستم تھا کہ خواب میں مجھے اپنی شکل دکھا گئے
کبھی نیند برسوں میں آئی تھی، سو وہ اسطرح سے جگا گئے

میر حیدر علی حیراں

حیراں بھی رائے سرب سکھ دیوانہ کے شاگرد تھے۔

صبح ہر روز اسی غم میں ہمیں ہوتی ہے شام ؛ آہ، جاگیں گے مرے کون سی اب رات نصیب

سجدوں میں پھرے نت سبحہ پھراتے حیراں ؛ شیخ جی پر نہ ہوئی تم کو کرامات نصیب

مرزا محمد یار بیگ مائل

مرزا محمد یار بیگ نام، مائل تخلص، جرأت کے شاگرد تھے۔

فانوس میں کب دیکھا یوں شمع کے شعلہ کو ⁂ جھمکے ہے بدن اُس کا جن کرتے میں والے کے
وہ زلف جو ڈس جاوے تو خاک جئے کوئی ⁂ بچتے ہیں کہیں مائل کاٹے ہوئے کالے کے

میر شیر علی افسوس

افسوس (۱۷۳۵ء - ۱۸۰۹ء) میر حیدر علی حیراں کے شاگرد تھے۔ شعر و شاعری سے زیادہ اپنی نثر نگاری کے لئے مشہور ہوئے۔ فورٹ ولیم کالج میں ملازم رہے۔ تصانیف میں اردو ترجمہ گلستانِ سعدی اور آرائش محفل مشہور ہیں۔

ہے یاں تلک تو نزاکت گلوں کے گجرے سے ⁂ لچکنے لگتا ہے اس گلعذار کا پہونچا
قفس سے چھٹنے کی امید ہی نہیں افسوس ⁂ حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہونچا

میاں حاجی تجلّی

میاں حاجی۔ میر تقی میر کے بھتیجے اور شاگرد تھے۔

طرب کا رنگ رُخِ گل پہ آشکار آیا ⁂ کلی سی کھل گئی جو ہنی وہ گل عذار آیا
یہ شوق دیکھو پس مرگ بھی تجلّی نے ⁂ کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یار آیا

سعادت یار خاں رنگین

سعادت یار خاں، سرہند میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد دربارِ دہلی کے منصب داروں میں تھے۔ رنگین اور ان کے دوست انشاء نے مل کر ریختی ایجاد کی۔ عورتوں کی زبانی شاعری محض تفریحِ طبع کی ایک چیز تھی لیکن ان صاحبانِ کمال نے اس میں طرح طرح کی شوخیاں اور دلچسپیاں پیدا کیں۔ دیگر تصنیفات میں چند مثنویاں، ایک تذکرۂ شعرا بنام "مجالسِ رنگین" اور منظوم سبق آموز کہانیوں کا ایک مجموعہ بنام "حکایاتِ رنگین" مشہور ہیں۔

قطع چولی کی عجب، گھیرے دامن کا طلسم ؛ آستیں چست بہت اور چناوٹ خاصی

کیوں نہ ایسے میں پھنسے دل، اجی انصاف کرو ؛ گفتگو سحر، کمر خوب، لگاوٹ خاصی

سب سے سب بات جدی سب سے انوکھی رفتار ؛ سب سے پوشاک الگ سب سے کھچاوٹ خاصی

اس کا اظہار کروں تجھ سے میں کیا کیا رنگیں ؛ دست و پا تجھ میں مہندی کی رچاوٹ خاصی

راجا رام نرائن موزوں

موزوں فارسی کے شاعر تھے اور حزیں کے شاگرد، فارسی دیوان پٹنہ میں چھپا۔ اردو میں ایک دو شعر ملتے ہیں

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی ؛ دِوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

ابر تو ہوگا خجالت ستی پانی پانی ؛ مت مقابل ہو مرے دیدۂ خوں بار کے ساتھ

م حسن لطیفی

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں ؛ اچھا کیا کہ مجھ کو فراموش کر دیا

میر امانی اسد

اسد، سودا کے شاگرد تھے۔

پی کر شراب درد تہ جام دے گیا ٭ وہ شوخ ہم کو بوسہ بہ پیغام دے گیا
کھانے کو غم ہے پینے کو خوں، دیکھنے کو داغ ٭ سب عشق کا وہ ہم کو سرانجام دے گیا

صاحب میر الم

خواجہ میر درد کے صاحبزادے تھے۔

ہنگام فغاں تھا خس و بنبہ قفس و دام ٭ تار رگ گل نے ہے رکھا ہم کو جکڑ کر
جب نام خدا در سے وہ جلوہ نما ہو ٭ مرجائیں صنعوں کی صفیں حسرت سے بچھڑ کر

شیخ ولی اللہ محب

سودا کے شاگرد تھے۔

اُس بُت نے گلابی جو اٹھا منہ سے لگائی ٭ شیشے میں عجب آن سے جھمکے تھی خدائی
واللہ ہمیں عشق کی سب بھولی ہوئی چال ٭ کافر تری رفتار نے اب یاد دلائی
ہم جھوٹ کہیں تو نہ ہو دیدار خدا کا ٭ ہے روز قیامت تری اک شب کی جدائی

منیرؔ شکوہ آبادی کی طرح شہیدیؔ بھی مشکل زمینوں میں اکثر طولانی غزلیں لکھتے تھے اور ان کی قدرت کلام کے سب قائل تھے۔ ذوقؔ کی طرح شہیدیؔ کے بھی بعض اشعار ضرب المثل ہو گئے ہیں۔

ایّام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے ؛ دن عیش کے گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں کیسے

بیمارِ محبّت کو اب اللہ شفا دے ؛ سنتے ہیں کہ ہاتھ اس سے مسیحا نے اٹھایا

نواب مرزا محمد تقی ہوسؔ

ہوسؔ، مصحفیؔ کے شاگرد تھے۔ کلام میں اکثر تصوّف اور اخلاق کے مضامین خوبی کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ عاشقانہ اشعار بھی پُر لطف ہیں۔

دل میں اک اضطراب باقی ہے ؛ یہ نشانِ شباب باقی ہے

جہاں ہے آج آبادی وہاں کل ہوگا ویرانہ ؛ اگر اک دم کی خاطر ہم ہوئے آباد کیا حاصل

منوّر خاں غافلؔ

غافلؔ، مصحفیؔ کے شاگرد تھے۔

مقامِ عشق میں شاہ و گدا کا ایک رتبہ ہے ؛ زلیخا ہر گلی کوچہ میں بے توقیر پھرتی ہے

کبھی تو کھینچ لائے گی اُسے گورِ غریباں تک ؛ کہ مدت سے ہماری خاک دامنگیر پھرتی ہے

خدا شاہد ہے اس کا پھر نہیں ملتی نہیں ملتی ؛ طبیعت جس سے اپنی اوبت بے پیر پھرتی ہے
ترا دیوانہ جب سے اُٹھ گیا صحرائے وحشت سے ؛ بگولے کی طرح سے ڈھونڈتی زنجیر پھرتی ہے

شاہ مبارک آبرو

نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو کا وطن گوالیار تھا۔ لیکن جوانی میں دلی آ گئے۔ شعر وسخن میں خان آرزو سے مشورہ کرتے تھے۔ غزلیات کے علاوہ مثنوی "آرائش معشوق" مشہور ہے۔

دور خاموش بیٹھ رہتا ہوں ؛ اس طرح حال دل کا کہتا ہوں

زندگانی تو ہر طــرح کاٹی ؛ مر کے پھر جیونا قیامت ہے

مضمون

میر شرف الدین مضمون اکبر آباد کے قریب قصبۂ جاجو کے باشندے تھے۔ لیکن دلی میں آبسے میر تقی میر ان کو "حریف ظریف، ہشاش بشاش، ہنگامہ گرم کن مجلسہا" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔

چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے ؛ کبھو آنکھیں بھر آتی ہیں کبھو جی ڈوب جاتا ہے

کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں ؛ ایک تو گل بے وفا اور تس پہ جور باغباں

محمد شاکر ناجی

یہ اپنی ہزل گوئی کے لئے زیادہ مشہور تھے۔ لیکن غزلیات بھی موجود ہیں۔

کرے کرم اے مہرباں پھر ہم کہاں اور تم کہاں
نہیں دیکھ سکتا آسماں پھر ہم کہاں اور تم کہاں

مصطفیٰ خاں یکرنگ

یکرنگ، شاہ مبارک آبرو کے ہمعصر دوست تھے۔ کلام انہیں کی طرز کا ہے۔

پارسائی اور جوانی کیونکہ ہو ✤ ایک جاگہ آگ پانی کیونکہ ہو

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے ✤ دل سے صبر و قرار جاتا ہے

جگر کسی کا جلے، دل جلے، دماغ جلے ✤ وہ کہہ گئے ہیں کہ آئینگے ہم چراغ جلے

شاہ قدرت اللہ قدرت

قدرت، مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد تھے

لے گئی اک بار گی گورِ غریباں کی طرف ✤ جس جگہ جانا تمنا سو طرح مایوس ہے

میر محمدی بیدار

بیدار، پہلے شاہ حاتم، پھر خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے تھے۔ آخری عمر میں دلی سے آگرہ چلے گئے تھے اور وہیں انتقال کیا۔ کلام میں پختگی ہے۔

بہار آئی نکلوا تے پھر لگے زنجیر دیوانے ٭ ہوا شور جنوں برپا اہاہاہا اہاہاہا

جن آنکھوں نے نہ دیکھا تھا کبھی اک اشک کا قطرہ ٭ رواں ہے اُن سے اب دریا اہاہاہا اہاہاہا

بقاؔ

شیخ بقاء اللہ بقاؔ اکبر آبادی پہلے حاتم اور پھر خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے تھے۔ مرشاعرہ میر اور سودا سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

خواہشِ سُود تھی سودے میں محبت کے ولے ٭ سر بسر اس میں زیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

میں تو آیا تھا بقاؔ باغ میں سُن جوشِ بہار ٭ پر یہ ہنگامِ خزاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

میر محمد اثرؔ

اثرؔ، خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی اور شاگرد تھے۔ ان کی مثنوی "خواب و خیال" اُردو زبان کی پہلی مشہور مثنوی ہے۔

بے وفائی پہ تیری جی ہے فدا ٭ قہر ہوتا جو باوفا ہوتا

کبھی دوستی ہے کبھی دشمنی ! ٭ تری کون سی بات پر جا ہیے

حافظ عبدالرحمن راسخ

راسخ، مولوی محمد حسین فقیر کے شاگرد تھے۔

کہاں تھے شب؟ اِدھر دیکھو، حیا کیوں ہے نگاہوں میں
اگر منظور ہے، رکھ لو مجھے جھوٹے گواہوں میں
نظر مجھ سے چرا کر، منہ چھپا کر کہتے جاتے ہیں
کہ یہ چوری بھی لکھی جائے گی تیرے گناہوں میں
وہی راسخ تو ہیں کل تک جو میخانے کے درباں تھے!
بنے بیٹھے ہیں حضرت چار دن سے دیں پناہوں میں

نواب آصف الدولہ آصف

پوچھئے کیا ہو شبِ ہجر کی حالت یارو ؎ میں ہوں اور رات ہے اور عالمِ تنہائی ہے

ولی اللہ اشتیاق

چھوڑ کر تجھ کو ہمیں اور سے جو لاگ لگی ؎ نہیں مہندی یہ ترے تلوؤں سے ہے آگ لگی

محمد اشرف اشرف

آ بیٹھو تو دو باتیں کریں تم سے میاں ہم ؎ پھر دیکھئے اک دم میں کہاں تم ہو کہاں ہم

حیدر بخش حیدری

ہے شب تیرہ فلک اے شمعِ درخشاں مددے ٭ راہ گم کردہ ہوں اے خضرِ بیاباں مددے

آتشِ ہجر تو پہنچی ہے جگر کے نزدیک ٭ جائے تاخیر نہیں دیدۂ گریاں مددے

تیغِ ابرو نے مجھے کو کہ سسکتا چھوڑا ٭ تو تو ناکام نہ رکھ خنجرِ مژگاں مددے

ہے ترے حیدری کو لشکرِ اعدا گھیرے ٭ فاتحِ بدر و حنین اے شہِ مرداں مددے

برابری کا ترے گُل نے جب خیال کیا ٭ صبا نے مار طمانچہ منہ اس کا لال کیا

ناطق گلاؤٹھی

ڈھونڈتی ہے اضطرابِ شوق کی دنیا مجھے ٭ آپ نے محفل سے اٹھوا کر کہاں رکھا مجھے

اے نگاہِ مست! اسکا نام ہے کیف سرور ٭ آج تو نے دیکھ کر میری طرف دیکھا مجھے

یار سے ہو کر جدا، جورِ فلک کا غم نہیں ٭ ہو چکی وہ بات تھی جس بات کی پروا مجھے

ساتھ بھی چھوڑا تو کب جب سب بچھڑ کر گئے ٭ زندگی تو نے کہاں آکر دیا دھوکا مجھے

کیا ارادے ہیں وحشتِ دل کے ٭ کس سے ملنا ہے، خاک میں مل کے

اے دلِ شکوہ سنج! کیا گزری ٭ کس لئے ہونٹ رہ گئے سل کر

مٹتے جاتے ہیں راہ عمر میں دوست ٭ مل رہے ہیں

خواجہ برہان الدین آثمؔ

صاف دل ہونا بہت دشوار ہے ؛ آئینہ بھی عکس سے خالی نہیں

مرزا احسن علی احسنؔ

تم تو دل مانگو ہو یاں جان تلک حاضر ہے ؛ بات یہ بھی ہے کوئی آپ کے فرمانے کی

میر زین العابدین آشناؔ

گر ہم سے دِوانوں کو تم آزاد کرو گے ؛ ویرانے میاں کتنے ہی آباد کرو گے

شرف الدین الہامؔ

اری بے کسی تیرے قربان جاؤں ؛ برے وقت میں ایک تو رہ گئی ہے

احسن اللہ خاں بیاںؔ

جادو تھی کہ سحر تھی ، بلا تھی ؛ ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی

میر صلاح الدین تمکینؔ

حسن اور عشق کو جس رونہ کہ ایجاد کیا ؛ مجھ کو دیوانہ کیا تجھ کو پری زاد کیا

خواجہ حسن حسنؔ

ہم صفیرانِ چمن، ہم سے چمن چھوٹ گیا ؛ کیا کریں کس سے کہیں ہائے وطن چھوٹ گیا

مرزا علی رضا رضاؔ

اِک دم تو رضاؔ کے پاس تو بیٹھ ؛ آج وہ اس جہاں سے اٹھتا ہے

میر سوزؔ

عشق نے تیرے مجھے رسوا کیا ؛ جو کیا صاحب بہت اچھا کیا

لالہ شیو سنگھ ظہورؔ

کچھ کٹے وصل میں کچھ یاد میں گریاں گزرے ؛ کیا مری عمر کے اوقات پریشاں گزرے

شاہ فضل علی فضلؔ

مصوّر گر تری تصویر کو چاہے کہ اب کھینچے ؛ لگا دے ایک سارا چاند چہرے کے بنانے کو

قسمتؔ

زمیں پر مت پٹک اسکو کہ یہ سنگ نہ گل ہے ؛ ارے اے بے مروت یہ کسی کم بخت کا دل ہے

حکیم سعید احمد ناطق لکھنوی

کبھی دامانِ دل پر داغِ مایوسی نہیں آیا ＊ ادھر وعدہ کیا اس نے ادھر دل کو یقیں آیا

کیا بتاؤں دل کہاں ہے اور کس جا درد ہے ＊ میں سراپا دل ہوں دِل میرا سراپا درد ہے

میرے چُپ رہنے سے تو غافل ہوا ظاہر پرست ＊ ظرف بھی اتنا ہی میں رکھتا ہوں جتنا درد ہے

ہر تڑپ پر قالبِ مردہ میں آجاتی ہے روح ＊ مجھ مریضِ ناتواں کی جان گویا درد ہے

بچ گئے تو انتہائے عشق میں لطف آئے گا ＊ اور ابھی تو ابتدا میں انتہا کا درد ہے

اپنا اپنا حال کہہ لیتے ہو ناطق سب کو تم ＊ جانتا ہے وہ کہ کس کے دل میں کتنا درد ہے

وحشت کلکتوی

درد کا میرے یقیں آپ کریں یا نہ کریں ＊ عرض اتنی ہے کہ اس راز کا چرچا نہ کریں

لاکھ غافل ہوں پر ایسے بھی ہم کور نہیں ＊ کہ چمن دیکھ کے ذکرِ چمن آرا نہ کریں

عقل و دانش سے تو کچھ کام نہ نکلا اپنا ＊ کب تک آخر دلِ دیوانہ کا کہنا نہ کریں

وہ نگاہیں عجب انداز سے ہیں عشوہ فروش ＊ غمِ پنہاں کو ہمارے کہیں رسوا نہ کریں

تیرے آشفتہ سر ایسے بھی نہیں سودائی ＊ کہ دل و دیں کے لئے زلف کا سودا نہ کریں

میرے ارمانوں کو کاش اتنی سمجھ ہو وحشت ＊ کہ اُن آنکھوں سے مروت کا تقاضا نہ کریں

بیخود دہلوی

تڑپاؤں گا عمر بھر دلِ مرحوم کے لئے ؛ کم بخت نامراد لڑکپن کا یار تھا
سودائے عشق اور ہے وحشت کچھ اور شئے ؛ مجنوں کا کوئی دوست فسانہ نگار تھا
جادو ہے یا طلسم تمہاری زبان میں ؛ تم جھوٹ کہہ رہے تھے مجھے اعتبار تھا

اجل کا نام دشمن دوسرے معنی میں لیتا ہے ؛ تمہارے چاہنے والے تمنا اسکو کہتے ہیں
نمک بھر کر مرے زخموں میں تم کیا مسکراتے ہو ؛ مرے زخموں کو دیکھو مسکرانا اسکو کہتے ہیں
زمانے سے عداوت کا سبب تھی دوستی جن کی ؛ اب انکو دشمنی ہے ہم سے دنیا اسکو کہتے ہیں

آل رضا لکھنوی

کچھ میری نظر نے اُٹھ کے کہا، کچھ اُن کی نظر نے جُھک کے کہا
برسوں میں نہ چکتا جو جھگڑا طے ہو گیا باتوں باتوں میں
اک خواب سا ہم نے دیکھا تھا، ہاں سچ ہے تمہیں کیوں یاد آئے
باتوں کا وہ بڑھنا راتوں میں، راتوں کا وہ کٹنا باتوں میں

قسمت میں خوشی تھی جتنی ہوئی اور غم ہے جتنا ہونا ہے
گھر پھونک تماشا دیکھ چکے اب جنگل جنگل رونا ہے

رضا کتنی حسین و مختصر شرحِ محبت ہے ؛ نہ راس آئے تو دوزخ ہے جو راس آئے تو جنت ہے

سہا مجددی

چلی ہی آتی ہیں شوق میں یاں زبان پہ بے اختیار باتیں
سکوتِ نخوت بھی مسکرا دے سُنے جو دیوانہ وار باتیں
اُدھر غضب حُسنِ عالم آرا، اِدھر قیامت جنونِ رسوا
ہوا ہے کس کس طرح سے چرچا، ہزار منہ اور ہزار باتیں
رقیب کو بزم میں بلایا، کسی کو کیا اعتراض کی جا
مگر ترا التفاتِ پیہم، مگر تری بار بار باتیں
سہا خیالی ہے اپنی دنیا، سہا نرالی ہے اپنی ہستی
لگائے یادِ خرام ٹھوکر، سُنائے تصویرِ یار باتیں

اقبال سہیل

چشمک گری تجلی سے یہ ایسی کہاں کی ہے ٭ بجلی تو خانہ زاد مرے آشیاں کی ہے
صیاد اب قفس سے ڈراتا ہے کیا مجھے ٭ تیرے کرم سے شکل وہی آشیاں کی ہے

چمن کو ہے ہجومِ رنگ و بو کا انتظار اب تک ٭ نہاں ہے گردِ رہ میں کاروانِ نو بہار اب تک
شبِ غم کاٹ دی تھی جس کے جاں پرور تصور میں ٭ چھپی ہے کُہر کی تہ میں وہ صبحِ زرنگار اب تک
صبا نے جاتے جاتے جانے کیا سرگوشیاں کی ہیں ٭ نہ بھولا ایک برگِ گل بھی درسِ انتشار اب تک
قفس کے تنگنائے تیرہ میں عمریں بسر کی ہیں ٭ نشیمن کی فضا ہمکو نہیں ہے سازگار اب تک

عندلیب شادانی

کوئی ادا شناسِ محبت ہمیں بتائے ؛ جو ہم کو بھول جائے، وہ کیوں ہم کو یاد آئے
اک دل نشیں نگاہ میں اللہ یہ خلش ؛ نشتر کی نوک جیسے کلیجے میں ٹوٹ جائے
ناداں سہی پر اتنے بھی ناداں نہیں ہیں ہم ؛ خود ہم نے جان جان کے کتنے فریب کھائے
مایوسیوں کا دل میں وہ عالم دمِ وداع ؛ بجھتے ہوئے چراغ کی لو جیسے تھرتھرائے
تم تو ہمیں کو کہتے تھے، یہ تم کو کیا ہوا ؛ دیکھو کنول کے پھولوں سے شبنم چھلک نہ جائے
اک نا تمام خواب مکمل نہ ہو سکا ! ؛ آنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

ایسا نہ ہو یہ درد بنے دردِ لازوال ؛ ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو
شاید تمہیں بھی چین نہ آئے مرے بغیر ؛ شاید یہ بات تم بھی گوارا نہ کر سکو
اللہ کرے جہاں کو مری یاد بھول جائے ؛ اللہ کرے کہ تم کبھی ایسا نہ کر سکو

ہزار گردشِ شام و سحر سے گذرے ہیں ؛ وہ قافلے جو تری رہ گزر سے گذرے ہیں
ابھی ہوس کو میسر نہیں دلوں کا گداز ؛ ابھی یہ لوگ مقامِ نظر سے گزرے ہیں
نہ جانے کون سی منزل پہ جا کے رُک جائیں ؛ نظر کے قافلے دیوار و در سے گزرے ہیں
ہر ایک نقش پہ تھا تیرے نقشِ پا کا گماں ؛ قدم قدم پہ تری رہگذر سے گزرے ہیں

تاجور نجیب آبادی

حسنِ شوخ چشم میں نام کو وفا نہیں ٭ درد آفریں نظر درد آشنا نہیں

آہ اس کی بیکسی تو نہ جس کے ساتھ ہو ٭ ہائے اس کی بندگی جس کا تو خدا نہیں

حیف وہ الم نصیب جس کا درد تو نہ ہو ٭ اُف وہ دردِ زندگی جس کی تو دوا نہیں

دوست یا عزیز ہیں خود فریبیوں کے نام ٭ آج آپ کے سوا کوئی آپ کا نہیں

اپنے حسن کو ذرا تو مری نظر سے دیکھ ٭ دوست! شش جہات میں کچھ ترے سوا نہیں

ظہیر کاشمیری

وہ حکایت جو بایں ہوش تجھے یاد نہیں ٭ تیرے اپنے ہی تغافل کی تو روداد نہیں

آج بھی کاہشِ بے نام وہی ہے کہ جو تھی ٭ دل کی دنیا ترے آنے سے بھی آباد نہیں

حسن تنہائی سے گھبرائے تو اتنا ہمدرد ٭ عشق پابستۂ زنجیر ہے آزاد نہیں

تیری ہر بات میں ہے عذرِ جفا کا پہلو ٭ تیری محفل میں کوئی صورتِ فریاد نہیں

جب کبھی تذکرۂ شعلہ رخاں ہوتا ہے ٭ دامنِ دل پہ سلگنے کا گماں ہوتا ہے

ہم سمن پوشوں میں اس طرح رہے آشفتہ ٭ جس طرح شام کو باغوں میں دھواں ہوتا ہے

حسن کا عکس بھی تسکینِ دل و جاں ہے ظہیر ٭ حسن پر سایۂ صاحب نظراں ہوتا ہے

ابن انشا

دل سی چیز کے گاہک ہوں گے دو یا ایک ہزار کے بیچ
انشا جی کیا مال لیے بیٹھے ہو تم بازار کے بیچ

پینا پلانا عین گنہ ہے، جی کا لگانا عین ہوس
آپ کی باتیں سب سچی ہیں، لیکن بھری بہار کے بیچ؟

منت قاصد کون اٹھائے، شکوۂ درباں کون کرے
نامۂ شوق غزل کی صورت چھپنے کو دو اخبار کے بیچ

ساون بھادوں ساٹھ ہی دن ہیں پھر وہ رُت کی بات کہاں
اپنے اشک مسلسل برسیں اپنی سی برسات کہاں

چاند نے کتنی باتیں کرلیں، نکلا، چمکا، ڈوب گیا
ہم بھی آنکھ جھپک لیں، سولیں، اے دل ہم کو رات کہاں

قیس کا نام سنا ہے تم نے ہم سے اب ملاقات کرو
عشق و جنوں کی منزل مشکل سب کی یہ اوقات کہاں

پنڈت امرناتھ ساحر

جلا ہے کسقدر دل ذوقِ کاوش ہائے مژگاں پر ٭ کہ سو سو نشتروں کی نوک ہے ایک ایک رگِ جاں پر

طریقِ عشق میں ہے رنج پہلے اور خوشی پیچھے ٭ مدارِ صبح روزِ وصل ہے اک شامِ ہجراں پر

مری دیوانگی روزِ قیامت میرے کام آئی ٭ قلم رحمت کا کھینچا اس نے آخر میرے عصیاں پر

ساؔئل دہلوی

محتسب تسبیح کے دانوں پہ یہ گنتا رہا ٭ کِن نے پی، کِن نے نہ پی، کِن کِن کے آگے جام تھا

بہزاؔد لکھنوی

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے ٭ منزل کیلئے دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے

اے برقِ تجلی کیا تو نے مجھکو بھی موسیٰ سمجھا ہے ٭ میں طور نہیں جو جل جاؤں جو چاہے مقابل آجائے

اس جذبۂ دل کے بارے میں اک مشورہ تم سے لیتا ہوں ٭ اسوقت مجھے کیا لازم ہے جب تم پہ مرا دل آجائے

بیدؔم وارثی

اہلِ بیداد کے جب نام پکارے جائیں ٭ تم نہ گھبرا کے سرِ حشر کہیں چلے آنا

محفل میں تو شوخی سے کئے قتل ہزاروں ٭ خلوت میں جو آئے ہیں تو شرمائے ہوئے ہیں

کرشن چند حیرؔت گونڈوی

یہ کہہ دو جا کے واعظ سے اگر سمجھانے آئے ہیں ٭ کہ ہم دیر و حرم ہوتے ہوئے میخانے آئے ہیں

احمد ریاؔض

کچھ اسطرح سے لٹی ہے متاعِ دیدہ و دل ٭ کہ اب کسی سے بھی ذکرِ وفا نہیں کرتے

حفیظ ہوشیارپوری

تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے ٭ محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
شریکِ گریۂ شبنم نہ ہوں گے ٭ میں اکثر سوچتا ہوں پھول کب تک
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے ٭ دلوں کی الجھنیں بڑھتی رہیں گی!
یہ غم ہوگا تو کتنے غم نہ ہوں گے ٭ زمانے بھر کے غم یا اک ترا غم
تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے ٭ اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
وہ مجھ سے اس قدر برہم نہ ہوں گے ٭ حفیظ ان سے میں جتنا بدگماں ہوں

شاہد صدیقی

یہ کیا ستم ہے کہ احساسِ درد بھی کم ہے ٭ شبِ فراق ستاروں میں روشنی کم ہے
کہ اسکے بعد سے طوفانِ تشنگی کم ہے ٭ یہ کیسی موجِ کرم تھی نگاہِ ساقی میں
کبھی بہت ہے غمِ جستجو، کبھی کم ہے ٭ قریب و دور سے آتی ہے آپ کی آواز
مگر یہ رنج رہے گا کہ زندگی کم ہے ٭ تمام عمر ترا انتظار کرلیں گے
ہنوز عظمتِ انساں سے آگہی کم ہے ٭ عروجِ ماہ کو انساں سمجھ گیا، لیکن
نئے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے ٭ نہ ساتھ دیں گی یہ دم توڑتی ہوئی شمعیں

راہی معصوم رضا

موسم بدلا، چلنے لگی پُروائی! ❊ ہم آئے تو جان بدن میں آئی
ہم نے دار سے یہ آواز لگائی ❊ اہلِ خرد نے کیا قیمت ٹھہرائی
ویرانوں کی سیر نہ کر دیوانے ❊ موقع پا کر ڈس لیگی تنہائی
زنجیرِ دل میں جان پڑی، خون دوڑا ❊ موسمِ گُل نے اتنی دیر لگائی
ایسا لگتا ہے کہ اندھیرا جیتا ❊ پروانوں نے ناحق جان گنوائی
ہم جسکے پیچھے بھاگے ہیں اتنا ❊ شاید پرچھائیں تھی ہاتھ نہ آئی

نیاز حیدر

سفر ہے، راستہ ہے، فاصلہ ہے ❊ قدم منزل، قدم ہی رہنما ہے
یہ مانا ہے نظر گستاخ میری ❊ سِتم لیکن تمہارا دیکھنا ہے
وہیں آئے ہیں لے کر ہم بھی اک دل ❊ جہاں پر عشق ٹیپو نے کیا ہے
تجھے دیکھے نہ کوئی اور نہ سمجھے ❊ مگر کہتے ہیں سب تو ہی خدا ہے
جو ساحل سے اٹھا میں لوگ بولے ❊ کہ یہ طوفان ساحل سے اُٹھا ہے
نیازِ رند ہے بربادِ الفت ❊ مگر وہ کون ہے جو ہنس رہا ہے

موہوم ہے اُمید، بھروسہ نہ کیجئے ❊ اب اور انتظار مسیحا نہ کیجئے
قائل نہیں ہے تیرِ نظر کا دلِ حزیں ❊ حسنِ نظر کے فیض کو رسوا نہ کیجئے

سراج لکھنوی

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے ٭ اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

میراجی

چاند ستارے قید ہیں سارے وقت کے بندی خانے میں
لیکن میں آزاد ہوں ساقی چھوٹے سے پیمانے میں
خوشیاں آئیں؟ اچھا آئیں، مجھ کو کیا احساس نہیں
سدھ بدھ ساری بھول گیا ہوں دکھ کے گیت سنانے میں
اپنی بیتی کیسے سنائیں، بدمستی کی باتیں ہیں!
میراجی کا جیون بیتا پاس کے اک میخانے میں

نریش کمار شاد

زندگی نام ہے جدائی کا ٭ آپ آئے تو مجھ کو یاد آیا

اے شیخ! ہم سے بادہ کشانِ شکستہ دل ٭ پیتے ہیں آنسوؤں کو ملا کر شراب میں
اے شاد زندگی میں جنہیں کوئی غم نہیں ٭ وہ بھی تو خوش نہیں ہیں جہانِ خراب میں

گنیش بہاری طرز

میں تو چپ تھا بزم میں افسانہ کہہ دینے کے بعد ٭ داستاں کے سننے والے داستاں بن کر چلے

ان کو میری کمی ہوئی محسوس ٭ زندگی، زندگی ہوئی محسوس
حال اس سے کہا جو واقف تھا ٭ طرز شرمندگی ہوئی محسوس

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

۹ مارچ سنہ ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب گرونانک تک پہنچتا ہے۔ دہلی میں رہتے ہیں۔ انھوں نے شاعروں کی مالی اعانت اور سرپرستی کے ساتھ ساتھ ہندستان بھر میں مشاعروں کے ذریعہ اردو زبان کی توسیع و ترویج کی ــ انگلینڈ میں جب جشنِ غالب منایا گیا تو سحر صاحب نے بیگم اختر، ہلال سیوہاروی اور جمیلہ بانو کے ساتھ ہندستان کے شعراء کی نمایندگی کی۔ اگر آپ سحر صاحب کی شخصیت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو جوش ملیح آبادی کا یہ شعر پڑھ لیجئے ؎

اگر نظّارۂ خیرِ مجسم کی تمنّا ہے
مہندر سنگھ کو اے ناظرانِ دیدہ ور دیکھو

نمونۂ کلام :-

ہر لحظہ کسی دل میں تری یاد رہے گی ٭ بستی یہ اجڑنے پہ بھی آباد رہے گی

ہے ہستیٔ عاشق کا بس اتنا ہی فسانہ ٭ برباد تھی، برباد ہے، برباد رہے گی

ہے عشق وہ نعمت جو خریدی نہیں جاتی ٭ یہ شئے ہے خداداد، خداداد رہے گی

وہ زلفِ پریشاں کا سنوارے نہ سنورنا ٭ وہ ان کے بگڑنے کی ادا یاد رہے گی

کسی ایک آدھ میکش سے خطا کچھ ہو گئی ہوگی ٭ مگر کیوں میکدے کا میکدہ بدنام ہے ساقی

کروڑوں سال سے یوں تو ہے آدمی کا وجود ٭ نگاہ اب بھی ترستی ہے آدمی کے لئے

پریشان تھے تری محفل سے باہر ٭ پشیمان ہیں تری محفل میں آکر

ہماری بزم سے نوشاں میں رات آتی نہیں واعظ ٭ کہ چھپ جاتا ہے جب سورج تو پیمانہ نکلتا ہے

کالیداس گپتا رضا

اُردو ادب کی تاریخ میں پنجاب کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ پنجاب کے ماضی کی شاندار ادبی روایات کی کچھ نشانیاں آج بھی زندہ جاوید ہیں۔ انھیں میں ایک اہم نام کالیداس گپتا رضا کا ہے جنکی پیدائش ۱۹۲۵ء میں مکند پور ضلع جالندھر (پنجاب) میں ہوئی۔ چودہ برس کی عمر سے ہی باقاعدہ شعر کہنے لگے۔ مطالعہ کا شوق بھی ساتھ ساتھ پروان چڑھتا گیا۔ اُردو کے علاوہ فارسی ہندی اور انگریزی زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ فن شاعری میں رضا صاحب حضرت جوش ملسیانی کے شاگرد ہیں۔ میٹرک کے بعد منشی فاضل اور ادیب فاضل کرنے کے بعد یہ مشرقی افریقہ چلے گئے وہاں سینئر کیمبرج اور ریاضی کے کچھ امتحانات پاس کئے۔ عملی زندگی میں انھوں نے تجارت کو اہمیت دی اور آج تک تاجر ہیں۔

۱۹۶۰ء میں مشرقی افریقہ سے واپس ہندوستان آگئے اور بمبئی میں سکونت اختیار کر لی۔ مشاعروں اور دیگر اجتماعوں سے الگ ہی رہتے ہیں۔ نام و نمود کی بالکل پرواہ نہیں ہے۔ اپنے تجارتی کاموں سے انھیں جب بھی فرصت ملتی ہے یہ تخلیق یا تحقیق میں لگ جاتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان کے ذاتی کتب خانے میں تقریباً سات ہزار کتابیں ہیں جن میں کئی نایاب نسخے ہیں۔ غالبیات کا ان کے پاس جو کلیکشن ہے وہ شاید ہی کہیں ہو۔ ہندوستان تو کیا ساری دنیا میں اس کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔

اُردو کلام کے چار مجموعے چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی انگریزی شاعری کا بھی ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے اور چار پانچ تحقیقی کتابیں بھی چھپیں۔ یوپی اور مہاراشٹر کی اکیڈمیوں اور مرکزی حکومت کی طرف سے انعامات بھی حاصل کر چکے ہیں۔

ممکن ہے کہ دلِ وا نہ کوئی چین سے رہ لے
اِس دور میں انسان تو خوش رہ نہیں سکتا

کالیداس گپتا رضا

○

تم پکارو کہیں محبت سے
منتظر ہیں ہم ایک مدت سے

پھر زمانا مجھے غلط سمجھا
جھوٹ پھر بڑھ گیا صداقت سے

آگ پانی میں لگ گئی یہ کیا ؟
شعلے اٹھتے ہیں آ دمیت سے

عمر بھر دل بجھا بجھا سا رہا
آپ کی ایک پل کی نفرت سے

کیوں رضا خواہش پذیرائی
وقت تکتا ہے مجھ کو حیرت سے

متفرق اشعار

تم بنتے رہو دشمن جاں لاکھ مگر ہم
دشمن کو بھی جینے کی دعا دیتے رہیں گے

چمن کا حسن سمجھ کر سمیٹ لائے تھے
کسے خبر تھی کہ ہر پھول خار نکلے گا

بدلتے ہوئے وقت کی گونج سن کر
کوئی بد مقدر ہی سوتا رہے گا

گدا لے گیا کب مرے در سے بھیک
صدا میرے لب کی چرا لے گیا

تم شوق سے ہر نقش کہن دل سے مٹا دو
ہم اگلی شرافت کا پتہ دیتے رہیں گے

بچھڑ کر کارواں سے راہرو ایسا ہوا تنہا
تھکا تنہا، گرا تنہا، اٹھا تنہا، چلا تنہا

بیاتا گل برافشانیم

مرتبہ:
قرۃ العین حیدر

میں اب بھی "لیڈیز کمپارٹمنٹ" اور "صرف عورتوں اور بچوں کے لئے" کی قسم کی تخصیص کی ہمیشہ سے مخالف ہوں۔ لیکن اس غزل نمبر میں ایک "زنانہ ڈبہ" شامل ہے کیوں کہ بیشتر تذکروں میں پرانی شاعرات کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ یا ان کے اکا دکا شعر شامل کئے جاتے ہیں۔ یا ان کا کلام محفوظ نہیں رہ سکا۔ اس بے اعتنائی کی بڑی وجہ ہماری سماجی اقدار تھیں۔ خواتین کی ادبی کاوشوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ ان کے نام تک کا پردہ لازمی تھا۔ اور شاعری بھی عموماً رقص و موسیقی کی طرح محض طوائفوں کا فن تھا۔ ہمارے ہاں ارباب نشاط کو وہی تمدنی حیثیت حاصل تھی جو فیوڈل جاپان میں ماہر فن گیشاؤں اور اٹھارہویں صدی فرانس میں COURTESANS کی تھی۔ لیکن اٹھارہویں صدی سے آج تک پردہ نشین عورتیں، مغل شہزادیاں، نوابوں کی بیگمات اور متوسط طبقے کی گرہستنیں اردو اور فارسی میں مروجہ انداز کی روایتی غزلیں کہتی رہی ہیں جن میں سے بعض قابل توجہ ہیں۔

متعدد مشہور اشعار ان شاعرات کے ہیں جن کے ناموں سے لوگ واقف نہیں۔ مولانا عبدالباری آسی جو میرے ذخیرہ کتب میں موجود ہے کا "تذکرۃ الخواتین" مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اس میں ۱۹۲۷ء تک کی دو سو اردو اور بانوے فارسی شاعرات کے کلام کے نمونے شامل ہیں۔ ان دو سو اردو شاعرات میں چھیاسی طوائفیں تھیں۔ عہد رفتہ کی خواتین کے حالات مولانا آسی نے چند قدیم تذکروں میں سے اخذ کیے ہیں لیکن وہ زیادہ تر ناکافی ہیں مثلاً جینا بیگم کے متعلق لکھا ہے کہ وہ "جہاندار شاہ بہادر ولیعہد بادشاہ دہلی کی خاص محل تھیں اور مصنف چمن انداز کا بیان ہے کہ مرزا رفیع سودا کی شاگرد تھیں"۔ جہاندار شاہ کون سے بادشاہ کے ولیعہد تھے؟ ایک جہاندار شاہ دلی کے تخت پر سال بھر کے لئے بیٹھے۔ اور ۱۷۱۳ء میں مارے۔ اگر جینا بیگم اُن کی خاص محل تھیں تو مرزا رفیع سودا کی شاگرد نہیں ہو سکتیں کیوں کہ ۱۷۰۵ء میں سودا پیدا ہوئے۔

جناب کالیداس گپتا رضا فرماتے ہیں: جینا بیگم کے شوہر جہاندار شاہ اور مغل بادشاہ جہاندار شاہ (معزول ۱۷۱۳ء) دو الگ شخصیتیں تھیں۔ شہزادہ جہاندار شاہ محمد شاہ رنگیلے کے پوتے اور احمد شاہ (مغل بادشاہ ۱۷۴۸ء سے ۱۷۵۴ء) کے بیٹے تھے۔ مرزا جواں بخت، بہادر کہلاتے تھے اور خود بھی شاعر تھے۔ سودا نے تقریباً ۷۰ برس کی عمر میں دلی چھوڑی، اس طرح وہ جینا بیگم کے اُستاد ہو سکتے ہیں مگر پرانے تذکروں میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ صرف ماہ درخشاں اور چمن انداز میں اس کا ذکر ہے جو بعد کی کتابیں ہیں۔

مولانا آسی نے اپنی کتاب میں چندا اور مہ لقا دو الگ الگ شاعرات بتائے ہیں۔ حالانکہ مہ لقا بائی چندا اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ کا پورا نام تھا۔ وہ راجہ چندولال شاداں کی سرکار میں ملازم اور بشیر محمد خاں ایماں کی شاگرد تھیں۔ ۱۸۰۶ء میں راجہ چندولال عہدہ پیشکاری ظلمت آصفیہ پر ممتاز ہوئے۔ یہی چندا کے عروج کا زمانہ تھا۔

ایک اور قابلِ توجہ گروہ انگریز نژاد اور ارمنی خواتین کا ہے ۔ مولانا آسی کے تذکرے میں ایک بسم اللہ بیگم کا ذکر ہے جنکی ماں "ولایت زا" تھیں اور وہ خود منشی الغلام اللہ خاں یقین شاگرد مرزا جانِ جاناں مظہر سے اصلاح لیتی تھیں لیکن بیشتر اینگلو انڈین خواتین کا تذکرہ رام بابو سکسینہ کی کتاب میں موجود ہے ۔ ان خواتین کی مائیں یا باپ انگریز تھے اور ان کی انگریزوں سے شادیاں ہوئی تھیں ۔ مثال کے طور پر آگرے کی اینگلو انڈین جمعیت جو ایک انگریز فوجی میجر آر جیسی کی بیوی تھیں اور غزلوں کے علاوہ ٹھمری دادرے ہولیاں وغیرہ بھی تصنیف کرتی تھیں ۔ مس فلورا میری سارکس کی طرح ان کا ذکر مولانا آسی نے بھی کیا ہے ۔ یہ اردو داں انگریز، یوریشین اور اینگلو انڈین سماج ایسٹ انڈیا کمپنی کے "نابوں" کے دور میں پیدا ہوا تھا ۔ انگریز پلانٹر زاد فوجی سرداروں کے زمانے میں پروان چڑھا اور اواخر انیسویں صدی تک پہنچ کر ختم ہو گیا ۔

ارمنی سوداگر سترہویں صدی سے ڈھاکہ کلکتہ مدراس میں آباد تھے ۔ یہ ایک تعلیم یافتہ ذہین اور طباع قوم تھی ۔ اور اگر آپ ارمنی کے ساتھ ساتھ یہودی بھی ہوں تو سونے پر سہاگہ سمجھیئے ۔ اپنے زمانے کی نامور گانے والیاں ملکہ جان، ہفت زبان گوہر جان، سیرو اور صالحہ وغیرہ کلکتہ کی ارمنی یہودی تھیں ۔ اور اینگلو انڈین شاعرات کی طرح ایک رچی ہوئی اردو تہذیب کی پروردہ ۔ میرے پاس گوہر کی ایک نایاب تصویر موجود ہے جو مجھے انگلستان سے ایک سردار صاحب نے بھیجی تھی جو ہندستانی کلاسیکل موسیقی پر کتاب لکھ رہے تھے ۔ وہ تصویر غزل نمبر میں شائع کی جا رہی ہے ۔ بیسویں صدی میں ز ۔ خ ۔ ش جیسی غیر معمولی شاعرہ کے علاوہ بلقیس جمال بریلوی، رابعہ پنہاں، آمنہ عفت، کنیز فاطمہ حیا، صفیہ شمیم ملیح آبادی اور درجنوں شاعرات پیدا ہوئیں ۔

آج کی اردو شاعری ان خواتین کے دور سے بہت آگے نکل آئی ہے اور شفیق فاطمہ شعریٰ، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، زہرا نگاہ، ادا جعفری، پروین شاکر اور عزیز بانو وفا ایک مختلف ذہنی کائنات سے تعلق رکھتی ہیں ۔ اس وقت ہند و پاکستان میں جتنی خواتین شعر کہہ رہی ہیں ان سب کا کلام دستیاب ہونا ممکن نہیں اور انتخاب کسی طرح مکمل نہیں کیا جا سکتا مگر کم از کم ہر دور کی نمایندہ شاعرات کے چند منتخب اشعار ان اوراق میں جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

قرۃ العین حیدر

پردہ نشین بیگمات (اٹھارہویں ـ انیسویں صدی)

جنیا بیگم

بنتِ بابر مرزا ـ جہاں دار شاہ بہادر ولیعہد احمد شاہ بادشاہ دہلی (۱۷۲۴–۱۷۵۴ء) کی خاص محل اور مرزا رفیع سودا کی شاگرد تھیں ـ

ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہے
کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہے

بسم اللہ بیگم دہلوی

ان کی والدہ ولایت زا تھیں ـ یہ دلی میں پیدا ہوئیں۔ منشی انعام اللہ خاں یقینؔ شاگردِ مرزا جانِ جاناں مظہرؔ (۱۶۹۹–۱۷۸۱ء) سے اصلاح لیتی تھیں ـ

تیری الفت میں یہ حاصل ہوا ہے
کبھی مضطر ہے دل گاہے طپاں ہے

نہ کیجیے ناز حسنِ عارضی پر
نہ سمجھو یہ بہار بے خزاں ہے

گنا بیگم شوخ

اہلیہ نواب عماد الملک غازی الدین خان بہادر نظام وزیر عالمگیر ثانی (وسط اٹھارویں صدی) میر قمر الدین منت سے اصلاحِ سخن لیتی تھیں اور اکثر غزلیں فی البدیہہ کہتی تھیں۔

شب کو میاں طلب میں تری ہم بھٹک بھٹک
جوں حلقۂ در یہ رہ گئے سر کو پٹک پٹک
میری بھی مشتِ خاک کا کچھ پایہ ہے ضرور
اے جامہ زیب ہائے یو دامن جھٹک جھٹک

ابر چھایا ہے مینھ برستا ہے ؛ جلد آجا کہ جی ترستا ہے

جس طرح لگی دل کو مرے چاہ کسی کی ؛ اس طرح نہ لگیو میرے اللہ کسی کی

پارسا

اپنے وقت کے مشہور شاعر (اور غالباً نواب آصف الدولہ کے عزیز) نواب مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ کی بیٹی تھیں۔

تن صورتِ حباب بنا اور بگڑ گیا
یہ قصر لاجواب بنا اور بگڑ گیا
چلتا نہیں ہے ابلقِ ایام ایک چال
اکثر یہ بد رکاب بنا اور بگڑ گیا

دُلہن بیگم

نواب انتظام الدولہ کی صبیہ اور نواب آصف الدولہ بہادر
حکمرانِ اودھ کی ایک بیگم کا تخلص تھا۔

بہا ہے پھوٹ کے آنکھوں سے آبلہ دل کا ؛ تری کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

جہاں کے باغ میں ہم بھی بہار رکھتے ہیں ؛ مثالِ لالہ کے دلِ داغدار رکھتے ہیں

ایسے کم ظرف نہیں ہیں جو بہکتے جائیں ؛ گل کے مانند جدھر جائیں مہکتے جائیں

مت کرو فکر عمارت کی کوئی زیرِ فلک ؛ خانۂ دل جو گرا ہو اُسے آباد کرو

دن کٹا فریاد سے اور رات زاری سے کٹی ؛ عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری سے کٹی

نواب زیب حور بیگم

یکے از بیگماتِ جانِ عالم واجد علی شاہ۔

ممکن نہیں جو کوچۂ جاناں میں رہ سکے
میرے غبار سے ہے صبا کو غبار کیا
گیسو کی آرزو کبھی عارض کا اشتیاق
دیکھیں دکھائے گردشِ لیل و نہار کیا

یاسمن

سید انشاء اللہ خاں انشاؔ کی جواں مرگ کنیز — چنبیلی کا تخلص تھا۔

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

شاد یا کھلوایا خوشی نے مجھے
جب وہ منظورِ نظر یاد آیا

نواب عشرت محل عشرتؔ

حرمِ عالیہ واجد علی شاہ مرحوم شاہِ اودھ بادشاہ کے ساتھ کلکتہ جلاوطن ہوئی تھیں۔

گرچہ عشق مانعِ نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

نواب صدر محل صدرؔ

آخری فرمانروائے اودھ واجد علی شاہ اخترؔ کی ایک بیگم اور صاحبِ دیوان شاعرہ تھیں۔

میں نے بلائیں لینے کو ہاتھ بڑھائے جب اُدھر
منہ کو پھرا کے یار نے مجھ سے کہا الگ

شمع جلانے آئے ہیں آج وہ میری قبر پر ٭ چلیو خدا کے واسطے باد صبا الگ الگ
خاک ہو زندگی بھلا تیرے مریض عشق کی ٭ میں ہوں دوا سے دور دور مجھ سے دوا الگ الگ
ہجر میں خوب خاک اڑی انکو ہوا نہ کچھ اثر ٭ نالے گئے الگ الگ آہ رسا الگ الگ
حسرت و آرزوئے وصل درد و مصیبت فراق ٭ سب کا ہے لطف الگ الگ سب کا مزا الگ الگ
صدر وہ کم نصیب ہوں ہجر میں گر اٹھاؤں ہاتھ ٭ باب قبول سے رہے میری دعا الگ الگ

شمس النساء بیگم شرم

بنت حکیم قمر الدین خاں والد خواجہ وزیر کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ میں رہتی تھیں۔

پہلے ثابت کریں اس وحشی کی تقصیریں دو ٭ کیوں مرے پاؤں میں پہناتے ہیں زنجیریں دو
کہا تھا صدقے کہ لایا ہوں میں پیغام وصال ٭ آج خلعت مجھے پہناؤ کہ جاگیریں دو
یا بہانہ سے بلائیں اسے یا خط ہی لکھیں ٭ شرم کیا خوب یہ سوجھیں ہیں تدبیریں دو

نواب اختر محل اختر

خاندان تیموریہ سے تعلق رکھتی ہیں اواخر انیسویں صدی تک زندہ تھیں۔

لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا ٭ اُن کا تھا کھیل خاک میں ہمکو ملا دیا
اک آہ شعلہ بار سے دل کو جلا دیا ٭ لو آج ہم نے اس کا بھی جھگڑا مٹا دیا

آستاں پر ترے پیشانی کو گھستے ٭ سر ہی غائب ہوا جس میں کہ ترا سودا تھا

خط لکھے نامہ بر سے جو ٹکڑے اڑا دیئے ؛ غیروں نے آج اُن تئیں کچھ پڑھا دیا
تقصیر یار کی نہ قصورِ عدو ہے کچھ ؛ اختر ہمارے دل ہی نے ہم کو جلا دیا

ہر ہائی نس نواب شاہجہاں بیگم شیریں

(فرماں روائے ریاست بھوپال)

فارسی میں شاہجہاں تخلص فرماتی تھیں۔ پہلا اُردو دیوان آج سے ایک سو چھ سال قبل مکتبۂ نظامی کانپور سے شائع ہوا تھا۔

کافر کیا مجھکو تری اس زلف نے کافر ؛ اس لام نے کھویا ترے اسلام ہمارا

شیشہ خانہ میں آئینہ غدار آئے نظر ؛ چشمِ مشتاق کو حیرت کی بہار آئے نظر
نیند میں زلف تری دیکھی زہے میرے نصیب ؛ گنجِ تعبیر ہے گر خواب میں مار آئے نظر

ضیائی بیگم ضیا

لکھنؤ کے مشہور طبیب حکیم انور علی صاحب کی اہلیہ تھیں۔

میں ہوں وہ ننگِ خلق کہتی ہے مجھ کو خاک
اِس کو بنا کے کیوں میری مٹی خراب کی

گوہر بیگم

ایک کابلی۔ سالدار کی لڑکی، لدھیانہ میں رہتی تھی۔

امتحانِ وفا تو ہو دے گا ؛ تم بھی ہو اور یار ہم بھی ہیں
درد کہتا ہے مجھ سے غربتاً میں ؛ تم نہ گھبراؤ یار ہم بھی ہیں

سیّد النساء حرماں

مولانا فضل حق خیرآبادی کی صاحبزادی۔
حرماں تخلص کرتی تھیں۔ بڑی عالمہ اور فقیہہ تھیں۔ علم و فن میں دستگاہ رکھتی تھیں۔ فن شعر و عروض پر گہرا عبور تھا۔ اپنے بیٹے مضطر خیرآبادی کے کلام پر اصلاح دیا کرتی تھیں چنانچہ ان کی رہنمائی میں گیارہ برس کی عمر میں ہی مضطر خیرآبادی نے ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع درج ذیل ہے ؎

ڈھونڈتے ہم کیوں دوائے دردِ دل ؛ تم اگر ہوتے بجائے دردِ دل

نمونۂ کلام حرماں :-

دردِ دل، دردِ جگر، کاوشِ دل، کاہشِ جاں
اتنے آزار ہیں اور ایک کلیجا میرا

خانۂ یار کا کیا تم کو پتہ بتلاؤں
جیسا مشتاق ہو، نزدیک بھی ہے دور بھی ہے

ارباب نشاط (اٹھارہویں، انیسویں، اوائل بیسویں صدی)

زینت جان دہلوی

نازک تخلص کرتی تھیں۔ زمانہ غالباً اٹھارہویں صدی۔

موجود ہے ہر آن جو نزدیک ہمارے ٭ وہ وہم و گماں سے بھی خفیف میں پرے ہے

ہے نالہ و زاری کا مرے شور فلک تک ٭ پر وہ بُت مغرور کوئی کان دھرے ہے

عشق میں مجھے کل دیکھ کے وہ ڈر کے یہ بولا ٭ بس ہوش میں آ کیوں مجھے بدنام کرے ہے

مہ لقا بائی چندا

دکن کی مشہور طوائف اور ریختہ کی سب سے پہلی صاحب دیوان شاعرہ۔ دولت و حشمت، عزت و رفعت میں اپنے ہمعصر رؤسا سے بڑھی ہوئی تھی۔ پانچسو سپاہی اور برقنداز اس کی ڈیوڑھی پر متعد رہتے تھے۔ فنون موسیقی شہسواری اور تیر اندازی میں نظیر نہ رکھتی تھی۔ ورزش کرتی تھی اور پہلوانی کا دم بھرتی تھی۔ شعرائے وقت اس کی مدح و ثنا کرتے تھے۔ ۱۷۹۹ء میں چندا نے اپنا دیوان جنرل میلکم کو پیش کیا تھا۔

اخلاق سے تو اپنے واقف جہان ہے گا

پر آپ کو غلط کچھ اب تک گماں ہے گا

مہر جان حشمت

پہاڑ گنج دہلی کی طوائف۔ غدر سے پہلے زندہ تھیں۔

لامکاں تک جا چکی ہے یار با آہِ رسا
پھاندنا مشکل نہیں کچھ آپ کی دیوار کا

نزاکت

نارنول کی طوائف جو دلّی میں رہتی تھی۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اس کے قدرداں تھے۔

بسکہ رہتا ہے یار آنکھوں میں　　ہے نظر بے قرار آنکھوں میں
محفلِ گل رخاں میں وہ گل رو　　لے گیا دل ہزار آنکھوں میں
سرمۂ خاک پا عنایت ہو　　آ گیا ہے غبار آنکھوں میں

حسین باندی شباب

بنارس کی مغنیہ تھیں۔

قسمت بد دیکھئے، پوچھا جو اس نے حالِ دل
باندھ کے ہاتھوں کو میں نے کہہ دیا کچھ بھی نہیں

مینگن جان اچپل

اپنے زمانے کی مشہور گائیکہ

آپ سے بات بھی کرے کوئی ٭ یہ بھلا کیا مجال ہے صاحب
جان کوئی خوشی سے دیتا ہے ٭ کیا نرالا سوال ہے صاحب
خاک سے ٹک اُٹھا لیجئے اُس کو ٭ دل مرا پائمال ہے صاحب

کمّن طوائف

بھرت پور کے بازار کی ایک بھنگیڑن ۔ ریختی کے انداز میں شعر کہتی تھی ۔

آہ میں ہوتی اگر حضرتِ شبیر کے ساتھ
مارتی شمر موئے کو کسی تدبیر کے ساتھ

حسینی جان مخمور

بنارس کی مشہور طوائف اور مقبول شاعرہ ۔

کہا یہ دیکھ جنازے کو یار نے کاندھا ٭ سفر ہے دور کا یار، قدم بڑھائے ہوئے
قرار و صبر و حواس و دل و جگر چھوٹے ٭ تمہارے عشق میں اپنے جو تھے پرائے ہوئے
شہید ہم ہیں ہمیں احتیاج غسل نہیں ٭ کسی کی تیغ کے پانی سے ہیں نہائے ہوئے

مشتری

لکھنؤ کی مشہور و معروف صاحب دیوان شاعرہ اور مغنیہ اصل وطن خیرآباد ضلع سیتاپور۔ چوک لکھنؤ میں رہتی تھی۔

غفلت میں ہم ان کو دیکھتے ہیں ؎ ہے خواب بھی کچھ خیال بھی ہے
باتیں تو وہ کرتے ہیں خوشی کی ؎ چہرے سے عیاں ملال بھی ہے

امراؤ جان زہرہ

چوک لکھنؤ کی مغنیہ۔ کلام اکثر اودھ اخبار میں چھپتا تھا۔

حیا سے نہیں وہ جو آنے کے قابل ؎ تو ہم خوف سے کب ہیں جانے کے قابل
کرو خون سے میرے تم ہاتھ رنگین ؎ یہ مہندی ہے صاحب لگانے کے قابل
مفصل کہوں ماجرا حاسدوں کا ؎ جو ہوں جمع سارے زمانے کے قابل

تو نے ہر ایک کی سُنیں باتیں ؎ میرا مطلب بھی کچھ بھلا سمجھا
میں نے واللہ دی دعا تجھ کو ؎ تو خدا جانے دل میں کیا سمجھا
بدگماں تجھ سے یار ہے زہرہ ؎ شکر کو تیرے وہ گلا سمجھا

کتنیا رو تہ قیامت میں زبان اپنی میں کھولوں
بگڑی ہوئی باتوں کو بنانا نہیں آتا

منّی زہرہ

کشمیری طوائف ۔ کلکتہ میں رہتی تھی ۔ مولوی عبدالغفور نساخ کی شاگرد

دردِ غمِ فراق سے شب کو ہوئی جو بے کلی ٭ دل کی کشش کشاں کشاں اس کی گلی میں لے چلی

ہجر میں تیرے گلبدن وقفِ الم ہے جان و تن ٭ بسترِ خار سے فزوں مجھ کو ہے فرشِ مخملی

گنّا جان ہنرؔ

دربھنگے کی طوائف ۔

کیوں نہ چرخِ پیر کو کہنے سے ہے دیوانہ حرج ٭ ہائے یہ پیرانہ سالی اور طفلانہ مزاج
اِک شمارِ رحمت اپنے واسطے کافی ہے شیخ ٭ کیجیے اتنا نہ لیکر سبحۂ صد دانہ مزاج

پکھراج بیگم

ایک باکمال مغنیہ ۔ آگرہ مولد اور اٹاوہ مسکن تھا ۔

دنیا میں مثلِ خواب ہماری حیات ہے ٭ کیوں کر نہ حالِ یار نہ پیشِ نظر رہے
تاریکیٔ عمل سے کیا گور میں مقام ٭ منزل میں شب ہوئی تو سرا میں اتر رہے
پکھراج بعد مرگ بھی غم ساتھ لے چلو ٭ بہتر ہے پاس اپنے زادِ سفر رہے

ارمنی اور اینگلو انڈین خواتین (انیسویں، اوائل بیسویں صدی)

بی سیرا پری (مس مین)

پچھلی صدی میں کلکتہ کی ایک یہودی طوائف تھی۔ انگریزی، اردو اور فارسی جانتی تھی۔

آنکھیں ملا کے تیغ زنی کی نہ اُس نے ہائے ؛ محضر یہ قتل کے تھی ہیں صاد سے غرض
بلبل ہے جانور تو اُسے ہو گلوں کی قدر ؛ ہم ہیں پری تو رکھیں گے پری زاد سے غرض

آنکھیں مشتاق نظارہ دیکھنے سے رہ گئیں ؛ تو نے دیکھا بھی نہیں ہے تجھ کو اے دل کیا ہوا
سن کے میرا غصہ و غم ہنس کے کہتا ہے وہ شوخ ؛ ہم نہ سمجھے کچھ اس قصہ کا حاصل کیا ہوا

بی صالحہ معشوق

ساکنہ کلکتہ ۔ بی سیرا پری کی چھوٹی بہن ۔

جو کھینچے تم سے کرو تم اس سے جانا نہ مزاج ؛ ہم فقیروں سے کہیں زیبا ہے شاہانہ مزاج
حضرت ناصح سے سیدھی بات بھی کرتا نہیں ؛ اے پری کرتا ہے کتنا تیرا دیوانہ مزاج

سحر میں پہلو کو خالی دیکھ کر حیران ہے
پوچھتا ہے جان سے میرا جگر دل کیا ہوا

ملکہ جان ملکہ

کلکتہ کی مشہور و معروف ارمنی رقاصہ مُغنیہ اور شاعرہ دیوان "مخزنِ اُلفتِ ملکہ" ۱۸۸۶ء کے لگ بھگ کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس میں ۱۰۶ غزلوں کے علاوہ اس شاعرہ کی کمپوز کی ہوئی ٹھُمریاں، ہولیاں اور دادرے شامل تھے۔ ان کے علاوہ ملکہ کی شان میں بہت لوگوں نے قصیدے لکھے ——— ٹیپو سُلطان کے گھرانے کے ایک صاحبزادے پرنس محمد ابراہیم شاہ (مقیم کلکتہ) نے بھی ملکہ جان کی مدح سرائی کی۔ وہ قصیدہ بھی اس دیوان میں موجود تھا۔ ملکہ کے اُستاد حکیم نبّو صاحب ہلالؔ (شاگردِ داغؔ) نے تاریخ کہی۔

ہوا جو طبع یہ دیوان میم صاحب کا ؛ کہا ہلالؔ کے دل نے شگفتہ ہو کے کمال
دِلوں یہ وجد کی حالت نہ ہووے کیوں طاری ؛ کمالِ نغمۂ ملکہ ہے اس کے طبع کا سال

ملکہ جان کی کہی ہوئی تاریخ کے دو اشعار:

میں نے اُستاد سے اجازت لی ؛ حُکم نافذ ہوا کہ ہاں کہیئے
اس کی تاریخ ہے قیامت کی ؛ سُخنِ فتنۂ جہاں کہیئے

نمونۂ کلام :-

آپ ہی آپ یوں جو روتی ہو ؛ ملکہ سچ کہو کیا یاد آیا

دیکھا جو شوخ نے ملکہ کا بندھا ہے رنگ ؛ محفل میں چھین لی غزل اُس نے بڑھا کے ہاتھ

جب اُن سے یہ کہتا ہوں مری جان نہیں ملتے
کس ناز سے یہ کہتے ہیں ہاں ہاں نہیں ملتے

گوہر جان گوہر

ملکہ جان کی بیٹی اور کلکتہ کی مشہور و معروف ہفت زبان مُغنیہ اور شاعرہ تھیں۔ ماں کے دیوان (جس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے) کی تاریخ کے چند اشعار۔

کہہ کے ملکہ نے جو چھپوایا یہ دلچسپ کلام ؛ لب حاسد پہ بھی ہے سوز ترنُّم لاریب
فکر تاریخ کی جب ہو نہ سکے گی گوہر ؛ رنگ لائے گی بہت موجِ تبسّم لاریب

بادشاہ بیگم خفی (مس بلیک)

ان کے والد مسٹر بلیک انگریز تھے۔ والدہ ہندوستانی جن کا نام چھوٹی بیگم تھا۔ مس بلیک فارسی اور انگریزی بھی روانی سے لکھتی تھیں۔ پختہ گو شاعرہ تھیں اور دوسروں کے کلام پر اصلاح بھی دیا کرتی تھیں۔

خود شوقِ اسیری سے پھنسے دام میں صیّاد ؛ شرمندہ ترے ایک بھی دانے کے نہیں ہیں

مِس ڈیئر

کانپور کی ایک اینگلو انڈین شاعرہ تھیں۔

میری آنکھوں کے راستے سے دل میں وہ آئے ہیں تشریف ؛ یہ ہے نقشِ قدم اُنکے نہیں ہیں پُتلیاں میری!

ایلن کرسٹینا گارڈنر (عرف رقیہ سلطانہ بیگم)

آگرے کی مشہور اُردو داں اینگلو انڈین گارڈنر فیملی سے تعلق رکھتی تھیں اور ڈینیل ساکرٹیز گارڈنر شکر کی بہن تھیں۔ اُن کے پردادا جیمز گارڈنر اور پردادی شہزادی قمر جہاں شہنشاہ شاہ عالم کے فرزند شہزادہ سلیمان شکوہ کی متبنہ بیٹی تھیں۔ گارڈنر خاندان نے متعدد شاعر پیدا کیے۔ جن میں شکر، پادری یارمحمد گارڈنر صبر، رابرٹ گارڈنر راز، بیب پیٹرک گارڈنر شوق، ولیم گارڈنر اور مسٹر این این فنیکس گارڈنر فلک وغیرہ قابلِ ذکر تھے۔

غزل ایلن گارڈنر بر طرح سلیمان گارڈنر

خودی نے مجھ پہ کیا ہے ستم خدا کی قسم
جو بیخودی ہو تو پھر کس کا غم خدا کی قسم
یہ غیب غیب ہے کہتے ہیں لوگ جس کو شہود
شہود ہی ہے عدم کا عدم خدا کی قسم
جو ہونے کا ہے نہ ہونا وہی تو ہے عقبیٰ
نہ ہونے کا ہے نہ ہونا عدم خدا کی قسم

ایمی بلاکیر ملکہ

مسٹر بلاکیر سپرنٹنڈنٹ پولیس کلکتہ کی لڑکی نسلاً خالص انگریز۔ انگلستان میں پیدا ہوئیں۔ بہت حسین تھیں۔ ستار بھی بجاتی تھیں۔ مسلمان ہو گئیں۔

ہو گئی نیند بھی ہمسایہ کی تا صبح حرام ؎ میں نے نالہ جو کسی رات سرِ شام کیا

عصرِ جدید

ز ۔ خ ۔ ش

زاہدہ خاتون شیروانیہ بنت سر محمد مزمل اللہ خاں شیروانی رئیس بھیکم پور ضلع علیگڈھ ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئیں۔ شدید پردے کی پابندی کی وجہ سے اپنا اصل نام ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ ایک حیرت انگیز سیاسی شعور کی مالک تھیں اور اپنے عہد کی عالمی سیاست کے متعلق نہایت بلند پایہ نظمیں کہتی تھیں۔ ۱۹۲۲ء میں انتقال ہوا۔ ان کا مجموعۂ کلام "فردوسِ تخیل" ۱۹۲۱ء میں دارالاشاعت پنجاب نے شائع کیا۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے چھبیس سال قبل انہوں نے مندرجہ ذیل غزل کہی تھی۔

کارخانے میں جو بارود کے بم آ کے پھٹا ٭ جل گیا پیکرِ بے جرم و خطائے مزدور

غلّہ ڈھوتے سے پسینے میں نہائے سو بار ٭ جب ہو اک پارۂ نانِ روزہ کشائے مزدور

کلۂ برف دسمبر میں ہے سر کے اوپر ٭ فرشِ آتش ہے مئی میں تہِ پائے مزدور

خوابگہ بھی ہے وہی، مطبخ و منزل بھی وہی ٭ دیکھنا کلبۂ محروم ضیائے مزدور

طفل کی فکرِ شکم، زن کا غمِ عریانی ٭ شبِ تاریک میں ہیں خواب رُبائے مزدور

قرض خواہو! درِ مرحوم کا پیچھا چھوڑو ٭ وارثِ بے درمی ہیں ورثائے مزدور

شاید اے مالکِ سرمایہ نہیں تجھ کو خبر ٭ ناظر و قادر و عادل ہے خدائے مزدور

سخت حیرت ہے مرد خور رہیں صحیح و سالم ٭ روز گو دیکھتے ہیں صبح و مسائے مزدور

قربِ شہ کا سرِ ہم چشم کو ہے گر سودا

دلِ نزہت کو بھی ہے فخرِ بھلائے مزدور

بانو طاہرہ سعید

ایرانی نژاد خاتون ہیں جو اپنے شوہر بریگیڈیر سعید کے ساتھ حیدر آباد میں رہتی ہیں۔ اردو، فارسی اور انگریزی میں شعر کہتی ہیں۔ طہران ریڈیو سے شعبۂ اردو میں کام کر چکی ہیں۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈیمی کی ممبر ہیں۔

نہ جانے آج کیوں ان کے لبوں پر میرا نام آیا
یہ کیسا انقلاب آیا، سلام آیا، پیام آیا

پھول، شبنم، کہکشاں، مہتاب کیا عنواں ہیں کم
بد مذاقی ہے اگر تلوار کی باتیں کریں

صاحبزادی عشرت جہاں عشرت

نوابیوسف علیخاں ناظم والی رام پور کی پڑپوتی ہیں۔ نواب سعادت علیخاں دلیسی، ضلع بدایوں، کی بیٹی اور ایاز بیر بینائی کی اہلیہ۔ بمبئی میں رہتی ہیں۔ ان کی چند غزلیں ایچ۔ ایم۔ وی نے گلوکار والعہ محمود اور مکیش کی آواز میں ریکارڈ کی ہیں۔

بڑی امید سے ہم نے سجائی بزم طرب ٭ شعور غم تو ملا پر سکون جاں نہ ملا

خیال کوئی نہ آیا ترے خیال کے بعد ٭ جمال کوئی نہ دیکھا ترے جمال کے بعد

زندگی بھر نہ محبت میں کبھی جیت سکے ٭ دل کی دنیا کے یہ ارمان کیسے پیش کر دل

غزل نمبر

صاحبزادی نورجہاں بیگم نصرت

عشرت جہاں بیگم کی ہمشیرہ ہیں ۔ پٹنہ میں سکونت پذیر ہیں ۔ پختہ گو روایتی شاعرہ ہیں لکھو ... کلام کہیں نہیں چھپوایا ۔

... سے جو ہم گلے مل کے ۔ دل زمانے کے رہ گئے ہِل کے

... کس طرح وہ بیزار ۔ دو حسین مائل تکرار نظر آتے ہیں

ہر ہائی نس صدرالجہاں بیگم صاحبہ آف مالیرکوٹلہ

(وفات ۱۹۵۱ء)

جو باطن کو عیاں کردوں تو ظاہر کو نہاں کردوں
اگر منصور بن جاؤں تو سب حالت بیاں کردوں

ممتاز مرزا

دلی کی ایک مقبول شاعرہ ہیں خانۂ فرہنگ ایران میں کام کرتی ہیں ـــ
مجموعۂ کلام بعنوان "یادوں کے سائے" شائع ہو چکا ہے ۔

بھولی بسری باتیں چھوڑو بھولی بسری باتیں کیوں ۔ سارے رشتے ٹوٹ چکے جب درد کی یہ سوغاتیں کیوں

سرنہیں دل کا جسم نہیں ہونے پاتیں ۔ خواب بننے نہیں پاتا کہ بکھر جاتا ہے

ادا جعفری

عزیز جہاں ادا جعفری بدایونی پاکستان کے ایک سویلین افسر کی اہلیہ ہیں
عرصے سے لکھ رہی ہیں۔ "میں ساز ڈھونڈتی رہی"۔ "شہر درد"۔ "غزالاں تم
تو واقف ہو"۔ تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

دیکھو تو ہر جبیں پہ ہے اک آشناسی لو
سوچو تو آس پاس کوئی رازداں نہیں

کتنی ویران گزرگاہوں سے ⁂ سلسلے خواب کے ملتے ہوں گے
صبح زنداں میں بھی ہوتی ہو گی! ⁂ پھول مقتل میں بھی کھلتے ہوں گے

ویرانیاں دلوں کی بھی کچھ کم نہ تھیں اداؔ
کیا ڈھونڈنے گئے ہیں مسافر خلاؤں میں

چاروں طرف تھی ریت، بہت تیز تھی ہوا
دل میں چھپا لیے ہیں تمہارے نقوشِ پا

یہ کیسا جبر ہے، حدِ نگاہ بھی تم ہو ⁂ نظر اٹھا کے جو دیکھوں نظر نہ آؤ مجھے

گئے دنوں کے حوالے سے تم کو پہچانا ⁂ ہم آج خود سے ملے اور والہانہ ملے

زہرا نگاہ

حیدرآباد کی رہنے والی ہیں۔ ماجد علی سی ایس پی (حال، نیشنل ایڈوائزر سلطان العُمان) سے شادی ہوئی۔ کراچی اور لندن میں قیام رہتا ہے۔

تم نے بات کہہ ڈالی کوئی بھی نہ پہچانا
ہم نے بات سوچی تھی بن گئے ہیں افسانے

دل کی دھڑکن ہے نہ آنسو نہ اُمنگ
وقت کے ساتھ یہ طوفان گئے

فہمیدہ ریاض

کئی سال لندن میں رہ چکی ہیں۔ اب کراچی میں قیام پذیر ہیں۔

کیا میرا زیاں ہے، جو مقابل ترے آجاؤں ؛؛ یہ امر تو معلوم کہ تو مجھ سے بڑا ہے

میں بندۂ ناچار کہ سیراب نہ ہو پاؤں ؛؛ اے ظاہر و موجود مرا جسم دعا ہے

اے چوبِ خشکِ صحرا، وہ بادِ شوق کیا تھی ؛؛ میری طرح برہنہ جس نے تجھے بنایا

پروین شاکر

آبائی وطن بہار۔ ۱۹۵۲ء میں
کراچی میں پیدا ہوئیں۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ سرسید گرلز
کالج کراچی میں پڑھاتی ہیں۔ شوہر پاکستانی فوج میں کیپٹن ہیں۔ مجموعۂ کلام
"خوشبو" پچھلے سال شائع ہوا ہے۔

پورا دُکھ اور آدھا چاند　　ہجر کی شب اور ایسا چاند

دن میں وحشت بہل گئی تھی　　رات ہوئی اور نکلا چاند

کس مقتل سے گزرا ہوگا　　اتنا سہما سہما چاند

یادوں کی آباد گلی میں　　گھوم رہا ہے تنہا چاند

میری کروٹ پر جاگ اُٹھے　　نیند کا کتنا کچا چاند

میرے منہ کو کس حیرت سے　　دیکھ رہا ہے بھولا چاند

اتنے گھنے بادل کے پیچھے　　کتنا تنہا ہوگا چاند

آنسو روکے نور نہائے　　دل دریا، تن صحرا چاند

برگد کی ایک شاخ ہٹا کر　　جانے کس کو جھانکا چاند

ہاتھ ہلا کر رخصت ہوگا　　اس کی صورت ہجر کا چاند

صحرا صحرا بھٹک رہا ہے　　اپنے عشق میں سچا چاند

رات کے شاید ایک بجے ہیں　　سوتا ہوگا میرا چاند

غزل مسلسل

سناٹا فضا میں بہہ رہا ہے ÷ دکھ اپنے ہوا سے کہہ رہا ہے

برفیلی ہوا میں نخلِ شجر کا ÷ ہونے کا عذاب سہہ رہا ہے

باہر سے نئی سفیدیاں ہیں ÷ اندر سے مکان ڈھ رہا ہے

جنوں پسند ہے دل اور تجھ تک آنے میں
بدن کو ناؤ، لہو کو چناب کر دے گا
میں سچ کہوں گی، مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا، اور لاجواب کر دے گا

واجدہ تبسم

(اہلیہ اشفاق احمد خان) پیدائش ۱۹۳۵ء (امراؤتی)
اُردو کی نہایت مقبول افسانہ نگار ۱۹۶۰ء میں ایم اے کیا۔ شاعری حال میں شروع کی ہے۔ مجموعہ کلام "صبحِ رخسار" زیرِ طبع ہے۔

خوشبوؤں کا بھی دنیا میں گذر کم کم ہے ÷ زخمِ دل اور مہک اور مہک اور مہک

حسنیٰ سرور

وطن بنگلور۔ جنوبی ہند کی مشہور شاعرہ ہیں۔ مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے۔

حیراں ہوں تجھے دیکھ کے تو ہے کہ میں ہوں ÷ یہ کس نے مرے ہاتھوں میں آئینہ دیا ہے

ساجدہ زیدی

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں پروفیسر ہیں۔ زیادہ تر نظمیں کہتی ہیں مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے۔

یہ دل صحرائے اعظم اور تقدیر ٭ اسے اِک بوند سے بہلا رہی ہے

کسی بے نام افسانے کی تمہید ٭ غُبارِ وقت میں بکھری ہوئی ہے

کنیز سکینہ

پشاور کے ایک تاجر غلام سرور خاں صاحب کی سب سے بڑی بیٹی۔ دلیپ کمار (یوسف خاں) کی بہن۔ پشاور میں پیدا ہوئیں۔ والدین کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد اپنے چھ بھائیوں اور چھ بہنوں کی سر پرست بنی رہیں۔ فقیرانہ طبیعت پائی تھی۔ ان کا اُردو اور فارسی کلام روحانیت اور تصوف کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ۲۸ اپریل ۱۹۷۶ء کو وفات پائی۔

اندازِ خرامِ یار تھا یا نکہتِ گُل کا کارواں ٭ کہ گلستاں میں عجب رنگِ دل آرائی ہے

پوچھتے کیا ہو داغِ دل، کیا کوئی چارہ ساز ہو ٭ تم تو ہمارے حال سے آج بھی بے نیاز ہو

تو اپنے حُسن کے صدقے وہ جامِ دید تو بخش ٭ متاعِ زیست فراواں ترے نثار کروں

دورِ آلام کی شوریدہ سری مت پوچھ ٭ میں نے خود کردہ گناہوں کی سزا پائی ہے

یہ اضطرابِ جنوں ہے کہ پھر دہ مل جائے ٭ جو راز دیدِ نھاں نہاں، ترے نثار کروں

عزیز بانو وفا

مشہور فارسی شاعر خواجہ عزیز الدین عزیز ۱۸۳۰ء میں کشمیر سے لکھنؤ آئے تھے۔ وفا عزیز لکھنوی کی پڑپوتی ہیں۔ ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ لکھنؤ کے ایک گرلز کالج میں پڑھاتی رہی ہیں۔ مجموعہ کلام آج تک شائع نہیں کروایا۔

تھکن سے چور ہوں لیکن رواں دواں ہوں میں ٭ نئی سحر کے چراغوں کا کارواں ہوں میں

ہوائیں میرے ورق لوٹ لوٹ دیتی ہیں ٭ نہ جانے کتنے زمانوں کی داستاں ہوں میں

ہر ایک شہرِ نگاراں سمجھ رہا ہے مجھے ٭ ذرا قریب سے دیکھو دھواں دھواں ہوں میں

کسی سے بھیڑ میں چہرہ بدل گیا ہے مرا ٭ تو سارے آئینہ خانوں سے بدگماں ہوں میں

میں اپنی گونج میں کھویا ہوا ہوں مدت سے ٭ مجھے خبر نہیں کچھ کون ہوں کہاں ہوں میں

خود اپنی دید سے محروم ہے نظر میری ٭ ازل سے صورتِ نظارہ درمیاں ہوں میں

میرا وجود و عدم راز ہے ہمیشہ سے ٭ وہاں وہاں بھی نہیں ہوں جہاں جہاں ہوں میں

مجھے تلاش نہ کر نیلگوں خلاؤں میں ٭ میں جو بھی ہوں تیرے احساس بال و پر میں ہوں

مجھے بقدرِ تجسس سبھی نے ڈھونڈا ہے ٭ بہ حدِ فکر و نظر میں ہر اک نظر میں ہوں

کہیں بکھر نہ دے مجھ کو زندگی میری ٭ میں مشتِ خاک ہوں اور دستِ بے ہنر میں ہوں

میں اپنے جسم میں رہتا ہوں اس تکلف سے ٭ کہ جیسے اور کسی دوسرے کے گھر میں ہوں

وہ کون تھا جو صدا دے کے مجھ کو لوٹ گیا ٭ میں جس کا نقشِ قدم اب بھی اپنے در میں ہوں

عزیز بانو وفا

ہماری بےبسی شہروں کی دیواروں پہ چپکی ہے ؛ ہمیں ڈھونڈے گی کل دنیا پرانے اشتہاروں میں
بہا کے لے گیا سڑکوں سے اک سیلاب سارا بت ؛ ہمیں باقی بچے ہیں صرف اپنی یادگاروں میں

کیا کریں بھاگ کے ہم خود سے جدھر جاتے ہیں ؛ ہر قدم پر کوئی آئینہ پڑا پاتے ہیں
بیٹھ رہتا ہے الگ ہٹ کے ہمارا سایہ ؛ جب بھی لگ کے کسی دیوار سے سستاتے ہیں

سنبھالا ہوش جب ہم نے تو کچھ عزیزوں نے ؛ کئی چہرے دیئے اور ایک پتھر کی زباں ہم کو
ہم ایسے سورما ہیں لڑ کے جب حالات سے پلٹے ؛ تو بڑھ کے زندگی نے پیش کیں بیساکھیاں ہم کو
ہم اپنے جسم میں بکھرے ہوئے ہیں ریت کی صورت ؛ سمیٹیں گی کہاں تک زندگی کی مٹھیاں ہم کو
بچھڑ کے بھیڑ میں خود سے حواسوں کا یہ عالم تھا ؛ کہ منہ کھولے ہوئے تکتی رہیں پرچھائیاں ہم کو

کنارہ ڈوبنے کا دیکھنے کے بعد منتظر ہم ؛ مٹا کے شاد ہو لیتے ہیں نقشے سے سمندر ہم
بظاہر شور جب اٹھتا ہے سڑکوں ہی سے اٹھتا ہے ؛ مگر چلا رہے ہوتے ہیں خود اپنے ہی اندر ہم
اندھیروں نے ہمارے سائے لمبے کر دیئے اتنے ؛ کہ پہنچیں گے سویرے تک کہیں اپنے برابر ہم
ہمارے اپنے ہی چہرے لگا آتے ہیں مجرم بھی ؛ سزا مارتے رہتے ہیں خود اپنے کو پتھر ہم
بٹھا کے اپنے سائے کرسیوں پر گول کمروں کی ؛ کھسک جاتے ہیں چپکے چور دروازوں سے باہر ہم

کسی کو کیا خبر ہم اپنی پیدائش سے گونگے ہیں ؛ ہماری زندگی کٹتی ہے اوروں کی زباں بنکر

کوئی یہ صبح کی سمت حادثہ سڑکوں کو بتلا دے ٭ کہ اب کھلتے ہیں ہم اندر کی جانب کھڑکیاں بن کر

ہمیں وہ ہیں جنہوں نے رات کی ہر شکل دیکھی ہے ٭ سوادِ صبح تک کھمبوں پہ جلتی بتیاں بن کر

ہم اپنے آپ سے بھاگے ہوئے معزور قیدی ہیں ٭ کھڑے ہیں راستوں میں ہم جو میلوں کے نشاں بن کر

یہ آپ اپنے تعاقب میں بھاگتا مجمع ٭ اسی ہجوم میں دب کر کچل گئے ہیں ہم

زرد چہروں کی کتابیں ہیں کتنی مقبول ٭ ترجمے ان کے جہاں بھر کی زبانوں میں ملے

آج سازوں سے نکلتے ہوئے ڈرتی ہو جو لے ٭ کیا خبر کل وہی قوموں کے ترانوں میں ملے

مڑ کے دیکھا بھی تو ہم میل کے پتھر ٹھہرے ٭ راہ چلے بھی تو منزل کے نشانوں میں ملے

جتنا ذہنوں میں اندھیرا ہے اب اتنا شاید ٭ صرف تاریخ کے تاریک زمانوں میں ملے

سب نے دیکھا اسکو اوروں کی نگاہوں سے سدا ٭ وہ زمانے سے ملا آنکھوں کی چادر اوڑھ کر

راستوں کا خوف تھا اس پر ہمیشہ سے سوار ٭ وہ ہمیشہ گھر سے نکلا سایۂ در اوڑھ کر

ہم ایسے پیڑ ہیں جو چھاؤں بانٹ کر اپنی ٭ شدید دھوپ میں خود سائے کو ترستے ہیں

بھرا تھا اپنا ہی بہروپ خود سے ملنے کو ٭ لگا گیا مری خلوت میں آئینے کوئی

رات آتی ہے تو رینگ آتے ہیں اندیشوں کے ناگ ٭ میرے احساس کے ٹوٹے ہوئے دروازوں سے

ادا جعفری بدایونی

پروین شاکر

ساجدہ زیدی

عزیز بانو وفا

یہودی نژاد مغنیہ، اسٹیج ایکٹریس اور شاعرہ گوہر جان آف کلکتہ

امراؤ جان ادا ـــــ ایک نایاب فوٹوگراف

سلیمان شکوہ گارڈنر فنا

حکیم جوزف ڈی سلوا

ایڈورڈ ہنری پامر

بارن ڈیوڈ مونٹ روز

جارج شور

مئے افرنگ ـــــ

در جام سفالِ ہندی

(اُردو اور فارسی کے یورپین شعـــراء)

مُرتّب:- مظہر حسین قیصر

اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ اردو نے صرف مسلمان اور ہندو شعراء ہی کو جنم نہیں دیا ہے بلکہ اسی کی کوکھ سے کئی یوروپین اور انڈو یوروپین شاعر بھی پیدا ہوئے ہیں۔ ان غیر ہندستانی شعراء کی تعداد خاصی بڑی ہے اور یہ سعادت اردو کے سوا شاید ہی دنیا کی کسی اور زبان کو حاصل ہوئی ہو۔

اردو کے ان یوروپین شعراء کا ذکر اس زمانے کے کئی تذکروں میں موجود ہے لیکن اس سلسلے میں سب سے پہلے اور نسبتاً زیادہ مبسوط اور مربوط کام مولوی سردار علی نے کیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے ایک ۲۸ صفحوں کے کتابچے میں جس کا عنوان "یوروپین شعرائے اردو" تھا اس قسم کے تمام شاعروں کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا لیکن رائے بہادر رام بابو سکسینہ نے جنھوں نے اردو کے یوروپین شعراء پر بڑا ہی مستند، وقیع اور تفصیلی کام کیا ہے، مولوی سردار علی کے اس کتابچے کو نہ صرف غیر مستند بلکہ غلط اور گمراہ کن بھی بتایا ہے۔

یہاں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رام بابو سکسینہ کی مشہور کتاب " دی یوروپین اینڈ انڈو یوروپین پوئیٹس آف اردو اینڈ پرشین " اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے جس میں فاضل مصنف نے بڑی ہی جانفشانی اور تحقیق کے بعد ایسے تمام شعراء کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام کے نمونے یکجا کر دیئے ہیں جو ہندستانی نہ ہونے کے باوجود اردو یا فارسی میں شعر کہتے تھے۔ میرے خیال میں اردو میں اس موضوع پر آج تک اتنی مبسوط، سیر حاصل اور قابلِ قدر کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے مطالعے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

رام بابو سکسینہ نے اردو اور فارسی کے غیر ہندستانی شعراء کو مندرجہ ذیل زمروں میں بانٹا ہے:

(۱) اردو اور فارسی کے یوروپین شاعر
(۲) اردو اور فارسی کے آرمینی شاعر
(۳) اردو اور فارسی کے انڈو برٹش شاعر
(۴) اردو اور فارسی کے انڈو پرتگیزی شاعر
(۵) اردو اور فارسی کے انڈو فرنچ شاعر
(۶) اردو اور فارسی کے انڈو جرمن شاعر
(۷) اردو اور فارسی کے انڈو اٹالین شاعر
(۸) اردو اور فارسی کے انڈو یوروپین شاعر

پہلے زمرے میں ۶ شاعر ہیں:-

کرنل جان بیلی
سر جان شور — شور
جنرل اسمتھ — اسمتھ
ایڈورڈ ہنری پالمر
ڈاکٹر ہوتی — ہوتی
ڈیو ہرسٹ — ثاقب

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اکثر یورپین شعرا نے اپنے تخلص کے طور پر اُردو اور فارسی کے نام اپنا لئے تھے اور کئی نے اپنے یورپین نام ہی رہنے دیئے تھے۔ ان شعراء کے کلام کے نمونے ملاحظہ کیجئے۔

جان بیلی

مار ڈالے گی محبت مجھے مس طیبا کی
جان نکلے گی جلاتے ہوئے پھر عیسیٰ کی

سر جان شور شور

شورؔ کا کلام زمانے کے دست برد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ عیسائیت کے بہت بڑے مبلغ تھے اور بعد میں لارڈ بنا دیئے گئے تھے۔ اُردو میں انھوں نے ایک طویل نظم لکھی تھی جس کا پہلا مصرع تھا کہ

دینِ اسلام گھٹے دینِ مسیحا بڑھ جائے

تذکروں میں اُن کا صرف یہی ایک مصرع ملتا ہے۔ باقی نظم پتہ نہیں گھٹ کر کہاں غائب ہو گئی۔

جان اسمتھ اسمتھ

میجر جنرل جان اسمتھ نے ۱۸ ویں صدی کے اواخر میں فرمانروائے رامپور نواب احمد علی خاں کی فرمائش پر مشاعرے کے لئے یہ غزل لکھی تھی:۔

نہ وہ ہمدم نہ وہ جلسا رہا ہے ٭ تپِ دوری سے دل جل سا رہا ہے
جنوں کی فوج کی سُن آمد آمد ٭ خرد کا پاؤں کچھ چل سا رہا ہے
کسی عاشق کا نعرہ چرخ زن ہے ٭ جو خیمہ چرخ کا ہل سا رہا ہے
مجھے اس واسطے ہے تلملاہٹ ٭ کہ غم سینے میں دل مل سا رہا ہے
غنیمت جان اسمتھ آگیا ہے ٭ کہ دشمن اس سے اب ٹل سا رہا ہے

ایڈورڈ ہنری پالمر

پالمر بھی اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے لیکن اُن کا اردو کلام دستیاب نہیں ہے۔ فارسی کا کلام بھی زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ تذکروں میں فارسی کا یہ شعر ملتا ہے۔

یار گفت کہ شاعرے صد تحسین است
بجواب غزلے حضرتِ سعدی غزلے

ڈاکٹر ہوئی

ڈاکٹر ہوئی انڈین سول سروس کے رکن تھے اور ۱۸۷۲ء میں ہندوستان آئے تھے۔ وہ اردو اور فارسی کے اسکالر اور کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ان کے کلام کے نمونے ملاحظہ کیجیے۔

جانِ عالم ترے انداز نے مارا مجھ کو ✤ بے ترے زیست نہیں اب تو گوارا مجھ کو
زلفیں جھک جھک کے یہ کہتی ہیں کسی کو پھانسو ✤ ابرو اس شوخ کے کرتے ہیں اشارا مجھ کو
مجھ کو پروا نہیں دشمن جو کرے جور و ستم ✤ ہے ہوئی حضرتِ عیسیٰ کا سہارا مجھ کو

ایک اور غزل کا شعر ہے۔

ہونے کو ہیں اس شہر میں معشوق ہزاروں
بیمار ہے ہوئی ایک کے گھر آس کی خبر لے

ڈیوہرسٹ ثاقب

ثاقب بھی انڈین سول سروس کے رکن تھے۔ وہ ۱۹ویں صدی کے اواخر میں ہندوستان آئے تھے۔ اُن کی صرف دو ہی غزلیں دستیاب ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

کسی کی بات طبیعت میں ناگوار نہیں ✤ کسی کی بات سے ہرگز کچھ انتشار نہیں

حسنِ یوسف کو سرِ بازار رسوا کیجئے ✤ اپنی حالت کو سراسر زیر و بالا کیجئے

ان شعراء کے کلام سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں نے صرف اردو اور فارسی کی محبت میں شعر کہے ہیں۔ یہ لوگ اردو اور فارسی کے اسکالر یقیناً ہونگے لیکن وہ کسی پہلو سے بھی اچھے شاعر نہیں تھے۔ ان میں اکثر کے ہاں زبان وبیان کی غلطیاں پائی جاتی ہیں اور بیشتر تو عروض سے بھی ناواقف تھے۔ لیکن اس مضمون میں ان شاعروں کے حسن و قبح پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ بتانا ہے کہ اردو کے ناوک نے زمانے بھر میں اپنا صید نہیں چھوڑا۔

ان یورپین شعرا کے بعد اردو اور فارسی کے آرمینی شعرا کے نام آتے ہیں ان میں چار نام اہم ہیں:-

مرزا ذوالقرنین		سرمد

جز ہانس "صاحب"		ایرن جیکب "فرحت" و "آیرن"

مرزا ذوالقرنین

۱۵۹۲ء میں ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے جہانگیر اور شاہ جہاں کا زمانہ دیکھا۔ ان کا پورا کلام فارسی میں تھا۔ شاہ جہاں کی تخت نشینی کے موقع پر انھوں نے کچھ قصیدے لکھ کر شاہ جہاں کی خدمت میں پیش کئے تھے جن کا معاوضہ شاہ جہاں نے ۴ ہزار روپے دیا تھا۔ ذوالقرنین کا تذکرہ جہانگیر نے بھی کیا ہے۔ ذوالقرنین کا کلام اب تک دستیاب نہ ہو سکا لیکن مختلف تذکروں میں بہ حیثیت شاعر مستند شاعران کا ذکر ملتا ہے۔

سرمد

شاہ جہاں کے دور میں ہندوستان آئے تھے اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ وہی سرمد ہیں جو صوفی سرمد کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اور جنھیں اورنگ زیب نے قتل کروا دیا تھا۔ ان کی کئی صوفیانہ کرامات آج بھی مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں ایک ہندو لڑکے ابھے چند سے شدید محبت ہوگئی تھی اور اسی پر انھوں نے یہ فارسی شعر کہا تھا ؎

نمی دانم دریں چرخِ کہن دیر
خدائے من ابھے چنداست یا غیر

اس لڑکے کی محبت سرمد پر اس قدر حاوی ہوگئی تھی کہ وہ مجنون ہو کر گلیوں میں برہنہ گھومتے تھے۔ سرمد کی صوفیانہ اور معرفت سے بھری ہوئی رباعیات بہت مشہور ہیں۔ وہ مجذوب ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے باکمال شاعر تھے۔ کچھ رباعیاں ملاحظہ کیجئے۔

یارب ز کرم بہ بخشش تقصیرِ مرا ٭ مقبول بکن نالۂ شبگیرِ مرا
پیری و گناہ ما جرائیست عجب ٭ لطفِ تو کند چارۂ تدبیرِ مرا

سرمہد توز ہیچ خلق یاری مطلب ٭ از شاخ برہنہ سایہ داری مطلب
عزت ز قناعت است وخواری ز طمع ٭ با عزتِ خویش باش وخواری مطلب

اب وہم وخیال وفکرِ دنیا بگذر ٭ چوں بادِ صبا ز باغ وصحرا بگذر
دیوانہ مشو برنگ وبوئے گل وگل ٭ ہشیار بشو ازیں ہوا ہا بگذر

جوہانس صاحب

جوہانس، صاحب تخلص کرتے تھے۔ وہ میر وزیر علی صبا کے شاگرد تھے۔ صبا خود آتش کے شاگرد تھے۔ یہ آپ کو اُردو کا یورپین شاعر کہا گیا ہے لیکن ان کے آرمینی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ان کا نام جوہانس ہے۔ اُن کا دور ۱۹ ویں صدی کے آخر کا دور ہے۔ انھوں نے کئی غزلیں کہیں لیکن ان کا صرف ایک ہی شعر دستیاب ہے۔

دیکھنا توڑ کے وحشت میں نکل جاؤں گا
مجھ کو پہناتے ہو زنجیر یہ زنجیر عبث

ایرن جیکب فرحت وایرن

جس طرح مرزا غالب، اسد اور غالب تخلص کرتے تھے اسی طرح ایرن جیکب بھی کبھی فرحت اور کبھی ایرن تخلص کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ایرن جیکب ۱۹ ویں صدی کے آخر کے دور کے شاعر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ریاض خیرآبادی کے شاگرد تھے۔ لیکن خود ریاض نے اس کی تردید کی۔ اُن کے اُستاد کے طور پر تنہر لکھنوی کا نام لیا جاتا ہے۔ فرحت کے کلام میں پختگی کی جھلک ہے اور انھیں زبان پر کافی قدرت معلوم ہوتی ہے۔ نمونے ملاحظہ کیجیے۔

بہار چمن پہ نہ اترائے بلبل ٭ تماشا یہ دو روز کا ہو رہا ہے
ذرا مسکرا کر چھڑک دو نمک تم ٭ کہ منہ زخم کا بے مزا ہو رہا ہے
لگی چوٹ ایرن کے دل پر یہ کیسی ٭ کہ ہر وقت ذکرِ خدا ہو رہا ہے

نہ چوکی حشر میں بھی آنکھ اُن کی ٭ خدا کے سامنے بھی لے لیا دِل

وہ اپنے عکس سے آئینہ میں آنکھیں لڑاتے ہیں ؂ الٰہی خیر کرنا دونوں چوٹیں ہیں مقابل کی
وفا دیکھو لحد تک آئی ہے ہمراہ فرحتؔ کے ؂ تمنائیں، مرادیں، آرزوئیں حسرتیں دل کی

اردو فارسی کے انڈو برٹش شاعروں میں کئی نام ہیں جن میں مندرجہ ذیل اہم اور قابل ذکر ہیں:-

(۱) جان تھامس طوماس	(۲) الیگزینڈر ہیڈرلی آزادؔ
(۳) جنرل جوزف بنلی فناؔ	(۴) کرنل رشیڈول پلود
(۵) ڈیوڈ آچٹرلونی فرانس سوبر	(۶) لیفٹننٹ کرنل جیمس اسکنر اسکنر
(۷) سلیمان شکوہ گارڈنر فناؔ	(۸) ڈینئل سفرالمین تھیفل گارڈنر شکر
(۹) پادر تھومیو گارڈنر صبر	(۱۰) رابرٹ گارڈنر استیق
(۱۱) پیٹرک ساولومن گارڈنر شوقؔ	(۱۲) ولیم گارڈنر ادریسؔ
(۱۳) الیٔ فلیکس گارڈنر ملک	(۱۴) تھیوفیلس گارڈنر جیںؔ
(۱۵) ایلن کرسٹیا گارڈنر عرف رقیہ بیگم	(۱۶) جان رابرٹ جاںؔ
(۱۷) کرنل پالمر پالمر	(۱۸) تھامس ولیم بیلے تھامس
(۱۹) بنجامن جانسٹن فلاطونؔ	(۲۰) بنجامن ڈیوڈ مونٹ روز مضطرؔ
(۲۱) جیمس کورحیرن کرکرانؔ	(۲۲) مسٹر منظلومؔ
(۲۳) کلاڈیس بوکنر نظم	(۲۴) اے ڈبلیو سنگسٹر صاحبؔ
(۲۵) داکر	(۲۶) لسٹر این ڈستی رونقؔ
(۲۷) ای اے جوزف کامل اجیری	

اُردو اور فارسی کے ان انڈو برٹش شاعروں میں الیگزینڈر ہیڈرلی آزادؔ، جوزف بنلی فناؔ، سلیمان شکوہ گارڈنر فناؔ، شکر صبر، استیق، شوقؔ، جاںؔ، مضطرؔ اور منظلومؔ کافی پُرگو تھے۔ ان میں سے بیشتر نے اُردو اور فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی طبع آزمائی کی۔ اگرچہ ان لوگوں نے دل کھول کر شعر کہے ہیں لیکن زبان اور بیان پر قدرت اور کلام میں پختگی سوائے دو ایک کے کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ ان شعرائے کے کچھ نمونے پیش ہیں۔

جان تھامس طوماس

طوماس آئرلینڈ کے باشندے تھے۔ وہ غالباً ۱۷۸۰ء میں ہندستان آئے اور ۱۷۸۷ء میں بیگم سمرو کے دربار میں ملازمت

اعلیٰ فوجی عہدے پر پہنچے لیکن جب بیگم نے ایک فرانسیسی کو اپنی عنایات کا مرکز بنایا تو طوماس نے بددل ہو کر ۱۷۹۱ء میں ملازمت چھوڑ دی لیکن جب بیگم کے خلاف بغاوت ہوئی تو طوماس نے بیگم کی طرف سے جنگ میں حصہ لیا اور ایک بار پھر بیگم سمرو کے منظورِ نظر بن گئے۔

طوماس بعد ازاں دلی میں آباد ہو گئے اور انھوں نے شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کر لی۔ مختلف تذکروں میں صفیں خاں صاحب کے نام سے بھی یاد کیا گیا۔ ان کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

سودا ہے زلفِ یوسفِ ثانی کا اس قدر ؛ روتے ہیں ہم کھڑے سرِ بازار زار زار

توقیر کلمہ بمصرعِ طوماس تو غزل ؛ "اے آہ کھینچ دے مہ بالانشیں پہ خط"

پہلا مصرع لوئی سے کاؤس توقیر کا ہے اور دوسرا طوماس کا۔ غالباً توقیر طوماس کے شاگرد تھے۔ طوماس نے فارسی میں بھی غزلیں کہی ہیں۔

دیدہ و جان بسوئے تو دارم ؛ جوشیا دلہا بروئے تو دارم

نامۂ دلکشا رسید بہ من ؛ دلِ من بشگفت ہمچو چمن

الیگزینڈر ہیڈرلی آزاد

الیگزینڈر ہیڈرلی آزاد غالب کے بھانجے اور شاگرد نواب زین العابدین خاں عارف کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے پیچھے ایک مکمل دیوان چھوڑا ہے جس میں قصیدے، غزلیں، مثنویاں، قطعات اور تضمینیں شامل ہیں۔ آزاد کا یہ ادبی سرمایہ اس لئے بھی قابلِ قدر اور ان کی صلاحیت اور قابلیت پر صاد ہے کہ ان کا انتقال صرف ۳۲ سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ وہ ریاست الور کی فوج میں کپتان تھے۔ وہ ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۷ جولائی ۱۸۶۱ء کو انتقال کر گئے۔

واعظوں سے جو سنا کرتے تھے جنت کا بیاں ؛ جب کہ تحقیق کیا کوچۂ جاناں نکلا

مری شامت تھی کہ زلفوں میں کسی کے پھنستا ؛ آپڑی ہیں یہ بلائیں مرے سر آپ سے آپ

نہ دہن تم کو میسر نہ کمر ہے پیدا ٭ تم سے محتاج سے کیا پھر کوئی سائل ہوگا

وہ نہ آئے تو موت آجائے ٭ ہم کو دونوں کا انتظار ہے آج

میرے کھانے کو بھی تھوڑا سا رہے خونِ جگر ٭ سب کا سب تو ہی نہ اے دیدۂ خونبار بہا

جب پایا دشمنوں نے پاؤں کا میرے سراغ ٭ سر کے بل چلتا ہوں تب سے کوئے جاناں کی طرف

پوچھنے کو مُت میسر ہے نہ پینے کو شراب ٭ بخت سے آزاد جھجر بھی مدینہ بن گیا

ریاست جھجر میں غالباً چند اسلامی قوانین سختی سے رائج تھے ۔ اس شعر میں اسی طرف اشارہ ہے ۔)

دکا دیوان ان کے انتقال کے بعد ۱۸۶۳ء میں اُن کے بڑے بھائی تھامس ہیڈرلی نے اپنے ایک دوست فتح پور کے

بلت علی کی مدد سے چھپوایا ۔ مندرجہ ذیل دو شعر صرف اسی قلمی نسخے میں موجود ہیں جو ہیڈرلی خاندان کے قبضہ میں ہے

؛ یہ شعر کسی اور چھپے ہوئے دیوان میں نہیں ملتے ؎

اے دیدہ ورد تم اسے دیوان نہ سمجھو ٭ حالانکہ زیادہ ہے گلستاں سے چمن میں

دیوان امیروں کے ہوا کرتے ہیں پر یہ ٭ آزاد کا تکیہ ہے بیابانِ سخن میں

آزاد نے ۱۷۰ غزلیں کہی ہیں ۔ بیشتر غزلیں غالب، ذوق، انشاء اور اُس زمانے کے مشہور شعرا کی زمینوں

ر طرحوں میں کہی ہیں ۔ آزاد اُن چند غیر ہندوستانی شعرا میں ایک ہیں جنہیں زبان و بیان پر کافی عبور حاصل ہے ۔ اُن کا کلام

ھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شاعر اردو کے لئے اجنبی ہے یا کسی غیر زبان کا شاعر ہے ۔

آزاد حکمت بھی کرتے تھے اور غریبوں کو مفت دوائیں تقسیم کرتے تھے ۔ مختلف تذکروں سے یوں لگتا ہے

ر وہ تلاشِ معاش کے لئے بھی کافی پریشان رہے تھے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ جھجر کے نواب علی محمد خاں کی شان میں وہ قصیدہ

نہ لکھتے جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

تلاشِ رزق میں یوں دربدر پھرے آزاد ٭ ہزار حیف کہ تجھ سا غلامِ سرکاری

بہر حال انگریز ہیڈرلی آزاد اردو کے ایک ایسے غیر ہندوستانی شاعر تھے جن پر اردو زبان بجا طور پر فخر کر سکتی ہے ۔

جوزف بنسلی فنا

جوزف بنسلی فنا نے بھی ایک دیوان چھوڑا ہے جو ان کی موت کے بعد شائع ہوا۔ فنا ریاست الور کی فوج میں ملازم تھے۔ وہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۲۶ء کو پیدا ہوئے اور یکم نومبر ۱۸۷۱ء کو انتقال کر گئے اور الور میں دفن ہوئے جہاں آج بھی اُن کی قبر موجود ہے۔

جوزف بنسلی فنا نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ ایک بہت اچھے کاتب اور موسیقار بھی تھے۔ وہ ستار بے حد اچھا بجاتے تھے۔ انہوں نے ہندی میں بھی شاعری کی۔ وہ حسن پرست تھے لیکن عیاش نہیں تھے۔ شراب خوب پیتے تھے جس کا ذکر اکثر اُن کے اشعار میں ملتا ہے۔

آسائشیں جہاں کی الٰہی ہوں مختصر ؎ بڑھتا ہے ناز زندگیٔ مستعار کا

چھپایا ہم کو گر چھپتا نہ جاتا ؎ جتا ہم نے تجھے حسن حیا نہ پایا

دل میں پنہاں رکھا بتوں کا عشق ؎ ہم نے اللہ کا بھی ڈر نہ کیا

خلد کا نقشہ بھی آنکھوں میں نہ واعظ جم سکا ؎ اپنے دل میں تو خیالِ کوئے جاناں ہی رہا

خانۂ دل ہی ہے میرا ترے رہنے کی جگہ ؎ اے غمِ یار کہیں اور نہ مہماں ہونا

اے فنا دیکھ کے کرتے ہیں تعجب احباب ؎ کیا ہوا تجھ کو جو مے نوشی سے انکار ہوا

ٹوٹے گی آج توبہ ہزاروں کی دیکھنا ؎ بکھرا ہے ایسی بزم میں کچھ جا بجا شراب

ایک تیری نگاہ پھرتے سے ؎ ہے زمانے میں انقلاب ہیں

ہم کو دعویٰ تھا کہ کھینچیں گے ترا نقشہ مگر ؎ ہو گئے کچھ دیکھ کر صورت تری تصویر سے

جو جاتے ہو حضرت سے چلے جائیے ہاں ہیں اب زیادہ نہ رُلوائیے

کرنل شیڈول پلو

کرنل کا صرف ایک فارسی قطعہ ہی دستیاب ہے جو انھوں نے یکم جون ۱۸۹۰ء کو لکھا تھا۔

باز ہوائے چمنم آرزو ست　　　جلوہ سرو سمنم آرزو ست
نکہت گل راچہ کنم اے نسیم　　　بوے از ان پیرہنم آرزو ست

ڈیوڈ آچٹر لونی ڈائش سومبر

ڈیوڈ کا زمانہ ۱۸۰۸ء سے ۱۸۵۱ء تک کا ہے۔ مختلف تذکروں میں ان کا ذکر اردو اور فارسی کے ایک اسکالر اور شاعر کی حیثیت سے ملتا ہے لیکن ان کا کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

لفٹیننٹ کرنل جیمس اسکنر، اسکنر

اسکنر کا دور ۱۷۷۸ء سے ۱۸۴۱ء تک کا ہے۔ اسکنر اردو اور فارسی کے عالم تھے۔ کئی تذکروں میں ان کے شاعر ہونے کا بھی ذکر ہے۔ وہ خصوصاً فارسی کے بڑے عالم تھے اور اسی زبان میں خط و کتابت کرتے تھے۔ وہ عیسائیت سے زیادہ اسلام سے متاثر تھے۔ اُن کے عادات و اطوار مسلمانوں سے بہت ملتے جلتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی ۱۴ بیویاں تھیں۔ کوشش کے باوجود ان کا کلام دستیاب نہ ہو سکا لیکن یہ بات طے ہے کہ وہ اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔

سلیمان شکوہ گارڈنر فنا

ابتدا میں انڈو برٹش شاعروں کی جو فہرست دی گئی ہے اُن میں نمبر ۷ سے نمبرہ ۱ تک ایک ہی خاندان گارڈنر فیملی

سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سلیمان شکوہ گارڈنر فنا کافی پرگو تھے۔ وہ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۲ء میں فوت ہو گئے۔ وہ مسلمان، ماں کے بیٹے تھے، ہندستانی تہذیب کے دلدادہ تھے اور ہندستانی کپڑے ہی پہنتے تھے۔ وہ انتہائی فیاض تھے۔ انھیں وراثت میں جو جائیداد ملی تھی وہ تقریباً ساری کی ساری انہوں نے اپنے دوستوں میں بانٹ دی۔ بہت پرگو شاعر ہونے کے علاوہ انگریزی، اُردو، فارسی، ہندی، عربی حتیٰ کہ سنسکرت پر بھی کافی قدرت رکھتے تھے۔ وہ اردو فارسی بڑی روانی سے لکھتے تھے۔ بہترین کاتب تھے۔ انہوں نے میر امن کے "قصۂ چہار درویش" اور میر حسن کی "مثنوی سحر البیان" کی پوری پوری کتابت شوقیہ کی تھی اور اپنی بہن رقیہ بیگم کو تحفتاً پیش کی تھیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :—

جبکہ ظاہر آنکھ سے پنہاں ہوا ؛ جو نہاں تھا وہ علی الاعلان ہوا

دل زلیخا ہو گیا گلیوں کی خاک اڑوائیگا ؛ عشقِ یوسف دیکھیے کتنے کنوئیں جھنکوائیگا

زاہدو جلوۂ فنا فی اللہ ؛ مستی بے حساب میں دیکھا

ہو دے کیفیتِ بادہ سے نہ جب تک مخمور ؛ زاہد خشک تری ہم سے ہو تقریر عبث

کیوں خفا ہو کہو تو کیا باعث ؛ کچھ تو معلوم ہو بھلا باعث

آنکھیں حبیب سے لگی ہیں دیکھو ؛ آتی نہیں اب تو خواب میں نیند

تم ہو عدو سے خوش مری مٹی خراب ہے ؛ خالق کرے کسی پہ کسی کا نہ آئے دل

اس بہانے تو جا پڑیں گے گلے ؛ ہم بھی پھولوں کا ہار ہوتے ہیں

یہ مثل سچ ہے وہ ہی جھکتے ہیں ؛ جو شجر باردار ہوتے ہیں

پہچان لیں گے ہم تو تمہیں چال ڈھال سے ؛ ناحق ہی تم نے شکل چھپائی نقاب میں

دیدۂ ناسور ہو ٹپک نکلا ٭ پھوٹے جس دن سے آبلے دل کے

مرا حال دیکھا تو ہنس کر کہا ٭ تمہیں کیا کسی کی نظر ہو گئی

شُکر

شُکر سلیمان شکوہ گارڈنر فنا کے بڑے بیٹے تھے۔ ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۷ء میں فوت ہوئے۔ پہلے انہوں نے اپنے والد سے ہی اصلاح لی اور پھر مرزا عباس حسین ہوش لکھنوی کے شاگرد ہو گئے۔ اُن کا کچھ کلام دستیاب ہوا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں زبان پر کافی عبور حاصل تھا۔ سنجیدہ شاعری کے علاوہ انھوں نے مزاحیہ شاعری بھی کی ہے جس میں اُن کا بھینس کی موت پر ایک مرثیہ قابل ذکر ہے۔

وہ لطف وصل میں ہے اور نہ ہجرِ یار میں ہے ٭ مزہ جو دل کو ملا ایک انتظار میں ہے

تیر اُس کا جو کرے دل کے نشانے کو خطا ٭ خود اُٹھا لاتا ہوں مرنے کی تمنا دیکھو

جسم اک روز مرا خاک میں پنہاں ہوگا ٭ کاسۂ سر مرا سنگِ رہِ طفلاں ہوگا

وہ درد کبھی سینے میں ہے اور کبھی دل میں ٭ جس درد کا مشہور تھا دستور جگر میں

بھینس کا مرثیہ اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

بڑھے دل کی کیونکر نہ اب بیقراری ٭ جو مر جائے یوں بھینس لالہ تمہاری

بارتھولومیو گارڈنر صبر

اِن کا زمانہ ۱۸۷۱ء سے ۱۹۳۳ء تک کا ہے۔ منشی جن کا ذکر نیچے آئے گا صبر کے چھوٹے بھائی تھے۔ جب صبر ۱۰ برس ہی کے تھے کہ انھوں نے عیسائیت کی تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ اُن کا شعر ہے ؎

خدمتِ انجیل جنّت کی نہ کی کچھ پروا نہ کی ؛ صبر دیوانہ نہیں، ناداں نہیں، ہُشیار ہے

صبر کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں :-

ہجومِ جوشِ وحشت نے نہ چھوڑا تار تک باقی ؛ وگرنہ قافیہ مشکل نہ تھا کچھ بھی گریباں کا

حیرت میں کیوں ٹھہر گئے آئینہ دیکھ کر ؛ سچ سچ بتائیے کہ نمودار کیا ہوا

خدا شاہد ہے میں روزِ ازل سے اُسکا مداح ہوں ؛ اُڑا لیا ہے نیا تے صبر نے اندازِ رقم میرا

شب بھر شبِ وصال رہا چاندنی کا لطف ؛ سویا لپیٹ کے وہ مہ تاباں تمام رات

صبر کا انداز بڑا پختہ ہے اور وہ بڑے منجھے ہوئے شاعر نظر آتے ہیں۔ وہ نہایت نیک اور پاکباز تھے۔ صبر امیر مینائی کے شاگرد تھے۔

رابرٹ گارڈنر اسبق

اسبق صبر کے چھوٹے بھائی تھے لیکن ان کے کلام میں اپنے بڑے بھائی کی سی پختگی نہیں۔ وہ ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ شکر نے پہلے انہیں صبر تخلص رکھنے کے لئے کہا لیکن وہ ان کے بڑے بھائی نے چھین لیا۔ پھر بڑے بھائی نے انہیں شمیم اور نسیم تخلص رکھنے کی رائے دی لہٰذا اسبق کی کئی غزلیں انہیں تخلص میں کہی گئی ہیں۔ یہ نمونے ملاحظہ ہوں۔

کہاں تک ہو بیاں شانِ مسیحا ؛ نبی تک ہیں غلامانِ مسیحا

جب سے اے جان کیا وصل کا وعدہ تم نے ؛ ہاتھ بھر کا ہے کلیجہ مرے ارمانوں کا

اُس بُتِ بے پیر کی کیا دوستی کا اعتبار ؛ آج میرا غیر کا کل آشنا ہو جائیگا

تصور ہی تصور ہے یہ سب دھوکا ہی دھوکا ہے ۔ وگرنہ یہ دلِ اور اس دل میں تیری جا مری مرتّ

پیٹرک سولومن گارڈنر شوق

یہ مُنبر کے بیٹے تھے ۔ ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے ۔ انہوں نے مذہبی اور سیکولر دونوں قسم کے شعر کہے لیکن اُن کے کلام میں پختگی نہیں ہے ۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :۔

عشقِ عیسیٰ ہو گیا جب سے یہ حالت ہے مری ۔ مست ہوں میں بادۂ عرفاں سے دل سرشار ہے

شہیدِ ناز کا کب خون چھپتا ہے چھپانے سے ۔ ترے ہاتھوں میں وہ ظاہر ہوا رنگِ حنا ہو کر

اس درجہ ہم کو فکر تھی اپنے مآل کی ۔ تھی وقتِ نزع یاد فقط ذو الجلال کی

کر کے خوں خشک یہ اشعار کئے ہیں پیدا ۔ تاکہ اے شوق مرے بعد یہ اولاد رہے

ولیم گارڈنر ادریس

یہ سلیمان شکوہ فنا کے بیٹے تھے ۔ ان کا صرف ایک ہی شعر دستیاب ہے ۔

پریشان کس لئے رہتے ہو ادریس ۔ بھروسا چاہیئے فیضِ خدا کا

ایلی فلیکس گارڈنر فلک

فلک بھی سلیمان شکوہ فنا کے بیٹے تھے ۔ اس طرح یہ شکر کے بھائی اور ادریس کے سوتیلے بھائی تھے ۔ ان کا بھی صرف ایک ہی شعر دستیاب ہے ؎

نیارئیے خاک تلک چھانتے ہیں گلیوں کی ۔ اس قدر ہو طمع زر کی کہ جسے کہتے ہیں

تھیو فلس گارڈنر حسن

یہ ادریس کے بیٹے تھے۔ مزاحیہ شاعری کرتے تھے۔ انھوں نے بے شمار ہزلیات لکھیں لیکن اب تک ان کا کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

رقیہ بیگم

ان کا ذکر "اردو کی خواتین شاعر" میں پڑھیئے۔

اردو اور فارسی کے اینڈو برٹش شعراء کی جو فہرست اس باب کی ابتدا میں دی گئی ہے ان میں نمبر سات سے لے کر نمبر ۸ تک سے شاعر ایک ہی خاندان یعنی گارڈنر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ خاندان کاس گنج، ایٹہ یو پی میں آباد تھا۔

جان رابرٹ جانؔ

جانؔ نے اسلام قبول کر کے ایک مسلمان عورت سے شادی کر لی تھی۔ وہ بڑے پکے مسلمان تھے اور روزہ اور نماز کے سختی سے پابند تھے۔ وہ مشاعروں میں بہت کم جاتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:—

گر پتہ سب کو ترا کوچۂ جاناں ملتا ✤ ایک ہی راہ میں ہر گبر و مسلماں ملتا

کیوں نہیں مار کر جِلاتے بُت ✤ کیا دعویٰ ہے یہ خدائی کا

اس زلف کی درازی کے قصّے کو کیا کہوں ✤ اتنا ہوا ہے طول کہ افسانہ ہو گیا

عیسیٰؑ سے ہو بڑھ کر لبِ گویائے محمدؐ ✤ یوسف سے ہے بڑھ کر رخِ زیبائے محمدؐ

جان بڑے پختہ شاعر تھے اور کلام کی یہ پختگی اردو اور فارسی دونوں کلام میں موجود ہے ۔

کرنل پالمر، پالمر

ان کا زمانہ ۱۸۱۷ء سے ۱۸۶۷ء کا تھا ۔ یہ اردو اور فارسی کے بڑے عالم تھے اور مشکل پسند شاعر بھی لیکن ان کا کلام دستیاب نہیں ہے ۔ صرف تذکروں میں ذکر ملتا ہے ۔

تھامس ولیم بیلے تھامس

یہ تھامس کے علاوہ مونف بھی تخلص کرتے تھے ۔ ان کا بھی کلام دستیاب نہیں ہے ۔

بنجامن جانسٹن فلاطون

یہ حیدر آباد دکن میں ڈاکٹر بنی کے نام سے جانے جاتے تھے ۔ وہ فزیشین تھے ۔ ان کی عمر حیدر آباد ہی میں گزری ۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو :—

جوشِ گل سے کم نہیں کچھ بلبلوں کا بھی ہجوم ؂ ہنی ہنی پر نظر آتی ہے جانے عندلیب

قطعہ فارسی

پُر درد دل زعالم خاکی صفا طلب ؂ ایں آئینہ زصورتِ آئین ما طلب

پُرس از صبا زحال دِل چاک چاک من ؂ اے گل ز آشنا خبرِ آشنا طلب

بنجامن ڈیوڈ مونٹ روز مضطر

ان کا زمانہ ۱۸۵۵ء سے ۱۹۳۱ء تک کا ہے مضطر پیشے کے اعتبار سے ایک آرٹسٹ اور فوٹو گرافر تھے ۔ انہوں نے کئی نوابوں اور راجاؤں کی شبیہ پینٹ کیں ۔ ان میں حیدر آباد کے نواب میر محبوب علی خاں نظام حیدر آباد

میر عثمان علیخاں کے والد نواب رامپور اور ریوا کے مہاراجہ بھی شامل ہیں۔ مضطر کے کلام میں پختگی اور تغزل نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے۔ وہ داغ دہلوی کے شاگرد تھے اور اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں بڑی روانی سے شعر کہتے تھے۔ مضطر چار اردو دیوانوں اور ایک مثنوی کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے استاد داغ کی موت پر ایک طویل مرثیہ بھی لکھا ہے جو کافی مشہور ہے۔

شراب ناب میں بار کو کر کہا رند نے واعظ سے ⁂ بڑی مدت میں آیا میکدے میں پاؤں حضرت کا

دل کی جگر کی جان کی کس کس کی لوں خبر ⁂ آوے کا آوا بگڑا ہے گویا کمہار کا!

بتوں کے عشق میں اے دل یہی انجام ہونا تھا ⁂ تجھے ناکام ہونا تھا مجھے بدنام ہونا تھا

جانتے ہو حال جو میرا ہوا ⁂ بھولے بن کر پوچھتے ہو کیا ہوا

تو اپنے ساتھ ساتھ میں پردہ نشیں کر گئی ⁂ رسوا کرے گا اے دل خانہ خراب کیا

بار الفت کا بھلا کون اٹھاتا سر پر ⁂ دل ناداں کے دوسرا مزدور نہ تھا

تو تو ہے دل میں ولیکن بدگماں ہیں اس قدر ⁂ ڈھونڈتے پھرتے ہیں تجھ کو غیر کے مسکن کے پاس

دل کا کھٹکا تو نکل جاتا مرے اے مضطر ⁂ کل جو آتی تھی بلا آج ہی آ گئی ہوتی

کام کوئی عشق میں بنتے نہیں ⁂ ہو گئے کیسے نکمے کام کے

مرثیہ وفات المضطر (نوحۂ داغ) کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔

دنیا سے ہائے روح فصیح البیان گئی ⁂ وہ کیا گئی فصاحت ہندوستان گئی
بزم جہاں سے رونق اہل زبان گئی ⁂ گویا کہ جسم خلق سے روح رواں گئی
جسم سخن میں ہائے وہ اب لطف جان نہیں

مضطر واقعی اُن معدود ے چند اینگلو برٹش شعراء میں سے ایک ہیں جنہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے اُن کا کلام ان کے زمانے کے کسی بھی ہندوستانی شاعر سے نیچے درجہ کا نہیں ہے۔ اگرچہ وہ داغ کے شاگرد تھے اور اس پر فخر بھی کرتے تھے لیکن وہ اپنے پیشرو شاعروں سے بھی متاثر تھے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے ؎

صیاد سے یہ کہتا ہوں رو رو کے بار بار ٭ بجلی گری ہو جس پہ مرا آشیاں نہ ہو

اس شعر میں غالب کے شعر کی بازگشت صاف سنائی دے رہی ہے۔ اسی طرح یہ اشعار ؎

مضطر میں آپ الجھا ہوں زلفوں میں یار کی ٭ سودا نہیں کہ آن کے دوں میر کا جواب

میر کی طرز سخن یاد جو آئی مضطر ٭ بحرِ غربت میں ہوا غرق غزل کا کاغذ

جیمس کارکرن

اردو میں REGULAR کے ہم معنی کوئی لفظ نہیں ہے یا شاید مجھے معلوم نہیں۔ بہرحال کارکرن ریگولر شاعر نہیں تھے وہ کبھی کبھار اردو اور فارسی میں شعر کہہ لیتے تھے۔ اُن کا کوئی باقاعدہ دیوان نہیں ملتا۔ ۱۸۴۲ء میں انہوں نے تاریخ چین دو حصوں میں لکھی تھی جس کا نام تھا "تاریخ ممالک چین"۔ اس تاریخ میں انہوں نے کہیں کہیں اپنی شعری کاوشیں بھی شامل کر دی تھیں۔

ہے مہتاب ہر چند عالم فروز ٭ دلے بے حقیقت ہے ہنگام روز

اگر آسماں کینہ جوئی پہ آئے ٭ تو دم بھر میں کچھ اور ہی کر دکھائے

مسٹر مظلوم دہلوی

مظلوم گوالیار میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ۱۹ویں صدی کے اواخر میں لکھنؤ سے ایک پرچہ "پیام یار" نکلتا تھا اس میں اکثر مظلوم کا کلام چھپتا تھا۔

دیکھنا یہ کھیلی کس کے سر پہ موت ٭ کس طرف خنجر بکف قاتل گیا

ساقی شراب پخته کے پیالے سے میں رندمست ٭ دیدے کوئی گھڑی ہوتی بوتل نکال کے

شکوہ کیا ہو سہ نہیں تگالی سہی ٭ جو مری تقدیر میں تھا مل گیا

نظم لکھنوی

نظم، حمد لکھنوی کے شاگرد تھے اور فوج میں کلرک تھے۔ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ انھوں نے کافی غزلیں کہی
ہیں لیکن سب یونہی سی ہیں۔

صورت کہے دیتی ہے جو کچھ حال ہو دل کا ٭ الفت کا مرض نظم نہاں ہو نہیں سکتا

جانتے ہیں سبب رنج کوئی جان تی سے ٭ اور جو حال ہے وہ صاف بتاتے بھی نہیں

تو بھی چین سے سوئے نہ ہم ٭ مرگئے پر بھی نہ درد دل گیا

اے۔ ڈبلیو۔ سنگر صاحب

صاحب کی غزلیں بھی رسالہ "پیام یار" میں چھپتی رہیں لیکن ان کے صرف دو شعر ہی دستیاب ہو سکے۔

گریں بجلیاں میرے دل پہ ہزاروں ٭ مزا دے گیا مسکرانا کسی کا

یوں تو دنیا کے کئے کام ہزاروں لیکن ٭ اک بجز عشق کے ہر کام کو آساں دیکھا

اِن دو شعروں سے پتہ چلتا ہے کہ صاحب کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی اور وہ شعر بھی ڈھنگ کے
کہتے تھے لیکن افسوس کہ اب تک ان کا کلام مزید نہ مل سکا۔

واکر

واکر کلکتہ میں رہتے تھے۔ ان کا کلام بھی غالباً زمانے کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ صرف چار شعر ملتے ہیں ؎

رُخ شعلہ ہے، تن نور ہے، بلور کی ہڈی ٭ کیوں رشک سے تیرے نہ جلے حور کی ہڈی

او طالبِ دنیا تجھے عبرت نہیں آتی ٭ کھائی دہنِ خاک نے فغفور کی ہڈی

گر راست ہو قسمت، ہو کبھی باعثِ دولت ٭ مشہور ہے کچھ پاؤں میں تیمور کی ہڈی

تاثیر دمِ سرد کی ظاہر ہوئی جب سے ٭ تن ہو گیا یخ بن گئی کافور کی ہڈی

اِن اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ واکر زبان اور بیان پر کافی قدرت رکھتے تھے۔ اس زمین میں اس ردیف و قافیہ کے ساتھ غزل کہنا معمولی بات نہیں۔

مسٹر این ڈسنی رونق

رونق لکھنؤ میں رہتے تھے۔ اُن کا صرف ایک ہی شعر دستیاب ہے ؎

تم کو نہیں فرصت کہ جو تم آؤ مرے گھر ٭ کیا مجھ کو بلا تا بھی وہاں ہو نہیں سکتا

تیور بتا رہے ہیں کہ رونق نے عمدہ غزلیں کہی ہوں گی۔

ای۔ اے۔ جوزف کامل

کامل اجمیر میں رہتے تھے۔ ان کے بھی صرف تین ہی شعر ملے ہیں ؎

دل جلایا نہیں اگر تم نے ۔۔ شعلے اٹھتے ہیں کیوں مرے دل سے

بیچ کر دستار کو اے شیخ جی ۔۔ آج کل پینا پلانا چاہیئے

دل مرا تلووں سے مل کر یوں کہا ۔۔ خاک میں اس کو ملانا چاہیئے

پرتگالی نسل کے شعراء

اردو اور فارسی کے پرتگالی شعراء میں مندرجہ ذیل شعراء کے نام قابل ذکر ہیں ۔

(۱) ڈان الیس ڈی سلوا فطرت
(۲) حکیم آگسٹین ڈی سلوا مفتون
(۳) حکیم جوزف ڈی سلوا ۔ ڈی سلوا
(۴) حکیم جواکم ڈی سلوا فطرت
(۵) حکیم الیاس پیڈرو ڈی سلوا عبرت
(۶) حکیم فرانسس ڈی سلوا فطرت
(۷) حکیم ایس ڈی سلوا عاصی
(۸) فرانسس فرانسس لاغر
(۹) تھامس باپٹسٹ نفیس
(۱۰) جوزف مینول جوزف
(۱۱) ڈی کاستا
(۱۲) جان ڈی کارسٹا سیف

مندرجہ بالا شاعروں میں نمبر ایک سے لیکر نمبر ۷ تک جو شاعر ہیں وہ ایک ہی خاندان ڈی سلوا کے فرد ہیں۔ یہ خاندان اٹھارویں صدی ہی میں ہندوستان آکر آباد ہو گیا تھا ۔ یہ کافی مشہور اور باعزت خاندان تھا اور اس کے افراد مختلف درباروں سے وابستہ ہو گئے تھے ۔

ڈان الیس ڈی سلوا فطرت

ڈان کا زمانہ ۱۷۸۲ء سے ۱۸۴۵ء تک کا ہے ۔ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے مگر شعر و ادب سے کافی دلچسپی رکھتے تھے ۔ اگرچہ انھوں نے کافی شعر کہے ہیں لیکن صرف مندرجہ ذیل اشعار ہی دستیاب ہوئے ہیں ۔

دردِ فرقت سے نرے شیدا جو گرم نالہ تھا ۔۔ ہر ستارہ پھر لبِ افلاک پر تبخالہ تھا

جو شب کو خواب میں آیا وہ چشمۂ حیواں ؎ بہائے چشم نے رو رو کے خواب میں دریا

قاتل نے مجھ کو عزت کا کیا مرتبہ دیا ؎ سر سے کہیں بدن سے کہیں دست و پا کہیں

دل کو چھیدا، سینہ چیرا، کاٹ سر باندھے ہیں ہاتھ ؎ تیر نے، خنجر نے، تیغ و کٹار و طرار نے

مفتوں (۱۸۲۱ء — ۱۸۵۶ء)

نظرت کے بیٹے اور آتش کے شاگرد مرزا عنایت علی ماہ کے شاگرد تھے۔ اس زمانے کے تذکرے میں مفتوں کی شاعرانہ صلاحیتوں کا ذکر ہے لیکن وہ شاعر یونہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ مفتوں بھی بڑے اچھے حکیم تھے نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

کوچہ ترا پسند ہے تیرا مکان پسند ؎ آگے تری زمین کے نہیں آسمان پسند

عجب تیرے کشتے کا دیوانہ پن ہے ؎ نہ تابوت لحد ہے نہ تار کفن ہے

جوزف ڈی سلوا - ڈی سلوا

مفتوں کے بیٹے تھے۔ یہ بھی حکیم تھے۔ ان کا زمانہ ۱۸۳۸ء سے ۱۹۰۹ء تک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی فیشن کے طور پر شاعری کرتے تھے کیوں کہ ان کے کلام میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ نمونۂ کلام پیش ہے ؎

حاصل جو بشر بندگیٔ حق سے ہے غافل ؎ حیوان سے بدتر ہے وہ انسان نہیں ہے

خوش اب ہوائے گنہگارو مسیح دنیا میں آیا ہے ؎ مبارک دو کہ تو وہ صلح کا پیغام لایا ہے

جواکم ڈی سلوا فطرت

ڈی سلوا خاندان ہی کے ایک فرد تھے۔ ان کا بھی بہت کم کلام دستیاب ہے۔

تجھ سے ہر دنت ستم چال نہاری بدی ⁂ کچھ لڑائی بھی نہیں اور نہ بُرا میں نے کہا

عبرت

عبرت اُردو اور فارسی کے اسکالر تھے لیکن شاعر وہ واجبی واجبی ہی تھے۔ نمونۂ کلام پیش ہے۔

بروز حشر مجھ کو کون بسمل تیرا سمجھے گا ⁂ سند کے طور پر مجھ کو تو دے اپنا نشاں قاتل

فرانسس ڈی سلوا فطرت

انھوں نے بھوپال کی حکمراں شاہ جہاں بیگم کی مہربانیاں حاصل کرنے کے لئے ایک طویل مثنوی لکھی تھی لیکن وہ دستیاب نہیں ہے۔ بیگم کی شان میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔

عاصی

عاصی، عبرت کے بیٹے تھے، انھوں نے نثر اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی۔ بہت پرگو شاعر تھے۔ اُن کی بیشتر شاعری مذہبی رنگ لئے ہوئے ہے۔

گل و گوہر تو کیا ہر شے میں ہے جلوہ عیاں تیرا ⁂ خدا تو بے نشاں تھا پر ملا ہم کو نشاں تیرا

آفتاب نور بھی ہر طرف سے جلوہ گر ⁂ دیکھنا ہے حشر میں نکلے گا کیوں کر آفتاب

میں مانگتا ہوں سجدے میں ہر روز یہ دعا ؎ کس روز دیکھئے ہو یہ سر پائمالِ دوست

لاغر

لاغر اردو سے زیادہ فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ اُن کی ایک فارسی غزل مشہور ہے جو انہوں نے حافظ کی مشہور غزل کے تتبع میں بھوپال کے حکام کے خلاف کہی ہے۔ دراصل یہ تضمین ہے۔ نمونۂ کلام پیش ہے۔

نہیں لگانے کے دل کسی سے سبھی کو دل سے ہٹا چکے ہیں
نہیں ہے دنیا سے کام لاغر خدا سے لو اب لگا چکے ہیں

ظلم بر خلق ز حکام اثر می بینم ؎ دفترِ عدل ہمہ زیر و زبر می بینم

ایسے مشّاقِ ستم ہو گئے حکّامِ زماں ؎ ساری مخلوقِ خدا مثل جرس ہے نالاں

کون سنتا ہے غریبوں کی میاں آہ و فغاں ؎ اسپِ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالاں

طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خری بینم

نفیس

نفیس بہت پرگو شاعر تھے۔ اگرچہ وہ عیسائی تھے لیکن انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا ؎

بکمالِ شرف و رفعت و شانِ حسبی ؎ پہنچے افلاک پہ جس دم شبِ معراج نبی ؐ

ہر نبی نے یہ کہا بڑھ کے با می و ابی ؎ مرحبا سیّدِ مکّی مدنی العربی

دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

جوزف

جوزف کے دیوان کا نام "غنچۂ خاطر" ہے جو ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ جوزف بہت پرگو اور پختہ کلام شاعر تھے۔ انہوں نے مشکل سے مشکل زمینوں میں غزلیں کہی ہیں انھیں زبان و بیان پر کافی قدرت حاصل تھی۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

بھول جاتا تو صنم اپنی یہ یکتائی کو ٭ میں نے آئینہ اگر تجھ کو دکھایا ہوتا

پانی برس رہا تھا کہ بجلی چمک پڑی ٭ میں زار زار رونے لگا مسکرائے آپ

شفق پھولی ہتھیلی پر تمہاری ٭ حنا تو نے لگائی آج کی رات

مر جائیے فراق میں پر دل نہ دیجئے ٭ دل دیکے میں نے صدمے بہت سے اٹھائے ہیں

ناحق کی مت کیا کرو جوزف بتوں سے چھیڑ ٭ تم ایک بھی کہو گے تو وہ دس سنائیں گے

آنکھوں نے اُس کی دن کو دکھایا مجھے طلسم ٭ بل لائی رات کا کل پیچاں تمام رات

مجھے منظور تھا منصور کے مانند مر جانا ٭ کہو تو سرکشی ہم دار سے کرتے تو کیا کرتے

تری شکل و شمائل کو کہاں یوسف پہنچا ہے ٭ کہ تو ہے اک طرف اور اک طرف ساری خدائی ہے

ہم سے رہتا ہے بگاڑ اور رقیبوں سے ملاپ ٭ یہ تو دشمن بھی نہ دیکھے گا جو ہم دیکھتے ہیں

پرتگیزی شاعروں میں جوزف ہی صحیح معنوں میں شاعر نظر آتے ہیں اُن کے ہاں اچھی شاعری کے پورے لوازمات موجود ہیں۔ اگر انھیں کوئی بہتر اُستاد مل جاتا تو یقیناً اردو کے اچھے شعراء میں شمار کئے جا سکتے تھے۔

ڈی کاسٹا

ڈی کاسٹا کی غزلیں ۱۸۲۷ء میں جام جہاں نما نامی رسالے میں چھپتی تھیں۔ جوڈت کے بعد ڈی کاسٹا اُبعد ایسے پُر تکبیری شاعر ہیں جن کے کلام میں پختگی پائی جاتی ہے اور جنہیں شعر کہنے کا سلیقہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی غزلیں کلکتہ میں گائی جاتی ہیں۔ نمونۂ کلام حاضر ہے ؎

کچھ رنج و غم کا حال نہ پوچھو کہ کیا ہوا ؏ الفت کو ہم تو یار دو بٹھائے چلے گئے

ہو رُسوائی مجھے گر تا بہ کنارِ دامن ؏ صفحۂ دل پہ کروں ثبت بہارِ دامن

دجلۂ قہر میں ہم غرق بھلا ہوتے کیوں ؏ ساحلِ مہر کا گر ہم کو سہارا ہوتا

سیفؔ

سیفؔ کا زمانہ ۱۸۵۵ء سے ۱۹۲۵ء کا ہے وہ اُردو سے زیادہ فارسی اور عربی کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے عربی اور فارسی کی کئی کتابیں نقل کی ہیں۔ سیفؔ نے کافی کلام اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ ان کے کلام میں پختگی اور کہیں اُستادانہ رنگ جھلکتا ہے ؎

کہیں کا میں نہ رہا جب سے تو شباب آیا ؏ خراب کرنے مجھے خانماں خراب آیا

تاریک ہے جہاں مری آنکھوں کے سامنے ؏ اے دل خیالِ زلف کی تاثیر دیکھنا

بے منتِ شراب جو رکھے مدام مست ؏ خدمت گزار ہم اسی پیرِ مغاں کے ہیں

ہر حسین پہ مرتا پھرتا ہوں جواں ہونے کے بعد ؏ باؤلی کیا میرے پاس آکر جوانی ہو گئی

اردو اور فارسی کے انڈو فرانسیسی شعراء

اس باب کے تحت مندرجہ ذیل نام قابلِ ذکر ہیں ۔

(۱) جارج فانتوم جیرجیس دصاحب
(۲) جان فانتوم شائق
(۳) الفریڈ فانتوم مفتونی
(۴) جوزف لائیل فانتوم عرف بنے صاحب
(۵) پتارز بربان عرف شہزاد مسیح فطرت
(۶) لیمارزا اسیر دہلوی
(۷) ارلس لیزدا توقیر
(۸) جوزف لیزدا ذرہ
(۹) لوئس پیٹرک لیزدا توقیر
(۱۰) جارج پیش شور
(۱۱) ولیم جوزف بردیٹ دلیم
(۱۲) دلیم بردیٹ دلیم
(۱۳) یوسف صاحب عاشق

ان شعراء میں جارج فانتوم جیرجیس دصاحب تخلص کرتے تھے کافی پُرگو تھے ۔ ہم ان شعراء کے تفصیلی حالات میں جائے بغیر ان کے دو دو، چار چار شعر پیش کر دیتے ہیں تاکہ قارئین کو ان کی شاعرانہ حیثیت کا پتہ چل جائے ۔

صاحب

نہ دل رہا نہ صبر رہا اور نہ دین رہا ۔۔ عشقِ بتاں میں کچھ بھی تو باقی نہیں رہا

طلسم ہو گیا گھونگھٹ کے منہ سے ہٹتے ہی ۔۔ جو لفظ ماہ تھا دم میں ماہ تمام ہوا !!

عشق میں اور تو کیا خاک تھا حاصل ہوتا ۔۔ ایک بدنامی تھی قسمت میں سو بدنام رہا

صاحب نہ وقتِ بد میں کسی سے ہو ملتجی ۔۔ میری مدد کو صفدرِ خیبر شکن ہو بس

شائق

ہم نے دل سو جگہ لگا دیکھا ؛ کوئی تجھ سا نہ دلربا دیکھا

نصف شب اُسکی گلی میں چھُپ کے جانا چاہیئے ؛ قول جو اس نے کئے ہیں آزمانا چاہیئے

صوفی

نزع میں ہچکی اگر لگی ہے نظر مری تا سوئے در لگی ہے ؛ اجل ٹھہر جا خبر لگی ہے کہ میرے در تک وہ آچکے ہیں

بنے صاحب

گرہ وقت سخن پڑتی ہے لب پر ؛ نزاکت آپ میں ہے انتہا کی

سناروں کا وہ زیور کیوں نہ پہنے ؛ کہ صورت چاند سی ہے مہ لقا کی

فطرت

دل کو دے جان بھی پڑی دینی ؛ تو یہ اس سود میں زیاں نکلا

تاریک ہو گیا تھا نظروں میں اپنی عالم ؛ پہلو سے اُٹھ کے جس دم وہ رشکِ ماہ گیا تھا

نظرتؔ، صاحب سے بھی زیادہ پُرگو شاعر تھے۔ انہوں نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کے کلام میں بڑی حد تک پختگی اور روانی پائی جاتی ہے۔

اسیرؔ

شمع فانوس میں درپردہ جلے ہو دیکھو ٭ شعلۂ آہ نکالے ہو جگر سے باہر

ہم اس آئینہ رو کے ہجر میں یوں زیست کرتے ہیں ٭ کہ سکتے کی سی حالت ہے نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

توقیرؔ۔ لوئس لیزوا

ملا ہم پوچھتے ہیں حضرت علیؑ کو کیا کہیے ٭ طریقت میں بشر کہیے حقیقت میں خدا کہیے

توقیرؔ نے حضرت عیسیٰؑ کا ایک مرثیہ بھی لکھا ہے ؎

امت کے لئے آپ نے جان اپنی گنوائی

اے حضرت عیسیٰؑ

کانٹوں کا رکھا تاج، شریروں نے ستایا

ٹھٹھوں میں اُڑایا

بھی ایک قرمزی رنگت کی پہنائی

اے حضرت عیسیٰؑ

ذرّہؔ

ضمیرؔ و میرؔ و سوداؔ، مصحفیؔ و آتشؔ و ناسخؔ ٭ طریقے شاعری کے بس انہیں دو چار سے نکلے

وہ عندلیب ہوں کہ سدا مجھ کو غم رہا ✤ باغِ جہاں میں نخلِ تمنا قلم رہا

موت برباد نہ کرتی جو غبارِ دل کو ✤ یہی صحرائے قیامت کا بگولا ہوتا

ہچکیاں اُس یار کی ٹھہریں ہمارے نام پر ✤ جذبِ دل پیدا محبت کا اثر ہونے لگا

توقیر ۔ لوئس پیٹرک لینزا

کر رہا دامِ گنہ سے مجھ کو اے عیسیٰ مسیح ✤ تو ہی تو بخشندۂ رحق ۔ ہے خلق اللہ کا

دل اپنا ہو کے پریشاں جو کچھ بکھرتا ہے ✤ کسی کی زلف نے شاید کہ پیچ و تاب کیا

گھٹائی آبرو روتے نے ابر کی یاں تک ✤ بھر آیا رشک سے چشمِ سحاب میں پانی

شورؔ

اس طلسماتِ جہاں میں موت کس کو یاد ہے ✤ صاحبِ خانہ رکھا ہے نام ہر مہماں کا

کیا زمانہ ہے کہ عاشق ہیں زر و مال کے سب ✤ دوست ٹھہرا وہی جس پاس کہ پیسہ ٹھہرا

ناکارہ جنس ہوں میں وہ بازارِ عشق میں ✤ جس کی طرف کو منہ نہ خریدار نے کیا

ہاتھ آیا جب نہ مضمونِ کمر ✤ شاعروں نے اسکو عنقا کر دیا

اتنا ہی تھا کہ پردے میں شب کے عیاں نہ تھا ☆ ورنہ یہ سایہ ساتھ تمہارے کہاں نہ تھا

حاجت یہی بلانے پہ باقی ہے دید کی ☆ ورنہ بھلا کسی سے کسی کو بھی کیا غرض

پھرتی کبھی شور جنوں سے یہ وحشت کا رو ☆ فصل گل آتے ہی یہ کتنا توانا ہو گیا

بھرا بیٹھا ہوں ہرگز چھیڑنا مجھ کو نہ ہم چشمو ☆ اگر رو دیا تو پھر عالم میں اک طوفان اٹھا دوں گا

اُمید عفو تجھ سے نہ ہو کیوں خدا اگر ☆ ہم تنے محو کا ہے کو ہوتے گناہ میں

آپ کا شور جہاں میں نہ ہو کیونکر شہرہ ☆ کہ فرنگی بھی ہو شاعر بھی ہو مشہور بھی ہو

دے چکے ابتدائے عشق میں دل ☆ اب گئی جان انتہا یہ ہے

وہ ہم ظرف ہے جس کو کہ ہرگز میں کبھی ☆ ایک شیشی جو برانڈی کا پلا دے تجھ کو

اُردو اور فارسی کے غیر ملکی شعراء میں شور کا سا قادر الکلام اور خوبصورت شاعر شاید ہی کوئی اور ہوا ہو۔ اگرچہ شور کا زمانہ ۱۸۲۳ء سے ۱۸۹۴ء تک کا ہے لیکن اُن کی شاعری آج کی شاعری معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے اُردو اور فارسی میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اِن میں اُن کے ۲ دیوان اور ایک طویل مثنوی شامل ہے۔ اگر اُن کے کلام کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اُردو کے اپنے ہمعصر ہندوستانی شعراء سے بھی کسی طرح پیچھے نہیں تھے۔ اُن کے اشعار میں تر و تازگی اور شادابی ہے جو بہت کم غیر ملکی شعراء کے ہاں پائی جاتی ہے۔ شور نے ایک اور مثنوی اپنے خاندانی حالات کے بارے میں لکھی ہے جس میں انھوں نے اپنے خاندان کے فرانس آنے اور گوالیار میں ملازمت اختیار کرنے کا ذکر کیا ہے۔ شور کے جیسا پُرگو اور زبان و بیان پر قدرت رکھنے والا شاعر نہ اُن سے پہلے پیدا ہوا تھا اور نہ شاید ہو گا۔

ولیم جوزف بروبیٹ ولیم

ہر فصل میں گرمی ہو کہ جاڑا ہو کہ برسات ؛ ٹوٹا نہ کبھی تار مرے دیدۂ تر کا

گھٹ گیا زور جب کہ مستی کا ؛ دھیان آیا خدا پرستی کا

کٹ جائے گا گلا کسی ابرو کے عشق میں ؛ میں دیکھتا ہوں خواب میں خنجر تمام رات

موجود نقدِ جاں ہے اٹھاؤ مگر نقاب ؛ لیتا ہے مال مول خریدار دیکھ کر

تم سلسلۂ دل کو مرے کم نہ سمجھنا ؛ لندن کو خبر دیتی ہے اس تار کی آواز

ولیم ہمارا یار ہے پردے میں جلوہ گر ؛ یوسف کو ہوگی شہرتِ بازار سے غرض

ولیم بھی غیر ملکی شعراء میں سر برآوردہ ہیں۔ ان کا ادبی اور شاعرانہ قد دوسروں کے مقابلے میں کافی اونچا ہے۔ انھوں نے ایک دیوان چھوڑا ہے جس کا نام "جوہر فرنگ" ہے۔

ولیم بروبیٹ ولیم

کس طرح منہ سے نکلتا میرے بوسے کا سوال ؛ آپ تو پہلے ہی سے مجھ پر خفا ہونے لگے

صبح کے وقت یار جب اٹھا ؛ ہو گیا گُل چراغ محفل کا

مجھ کو مسجد میں تو سانے مے میں ہے انکار ÷ لے کے پرشیشہ مُل زیرِ بغل جاؤں گا

حالِ دلِ دلیم ناشاد کہوں کیا تجھ سے ÷ تیرے ملنے کے سوا اور تمنا کیا ہے

عاشق

تمام دن مجھے رونے سے کام رہتا ہے ÷ تمہارے ہجر میں تارے گنے ہیں ساری رات

مہرباں پھر ہوئے وہ اسے عاشق ÷ دیکھیے اب دکھلائے کیا قسمت

تم چپکے ہی چپکے نہ بتایا کرو باتیں ÷ گو پاس ہوں سنتا ہوں مگر دور کی آواز

صورتِ فرہاد عاشق پھوڑیے پتھر سے سر ÷ سنگ سے بھی سخت ہے دل اس بتِ بے پیر کا

اردو اور فارسی کے جرمن شعراء

اس باب کے تحت تین شاعر قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) نواب ظفریاب خاں صاحب (۲) فرانسس گاڈلیب کوئن فرآسو

(۳) جان اسمتھ

اٹھارویں صدی کے آخر میں ریاستِ سردھنہ کی حکمراں بیگم سمرو تھیں جو شعر و ادب کی بڑی دلدادہ تھیں۔ اُن کے دربار سے کئی اہلِ علم و فضل اور صاحبِ قلم وابستہ تھے۔ ظفریاب خاں صاحب بھی اسی دربار کے پروردہ تھے۔ ظفریاب خاں عیسائی تھے۔ بیگم سمرو کے شوہر کے انتقال کے بعد بیگم سمرو اور سوتیلے بیٹے میں جنگ ہوئی جس میں بیگم سمرو

کامیاب ہوئیں۔ ظفریاب خاں دلی منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے خود کو شراب و شعر میں غرق کر لیا۔ وہ ادیبوں اور شاعروں کے سرپرست تھے اور اکثر اپنے گھر مشاعرے کروا تے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

دیکھے ہم نے ترے رشکِ مہ تاباں عارض ٭ اب چھپاتا ہے عبث تو نہ داماں عارض

نظر آیا مجھے بام پہ پیارا اپنا ٭ بارے اب کچھ ہے بلندی پہ ستارا اپنا

شمع کے چہرے پہ یوں پیچاں ہے یہ موجِ دود ٭ جس طرح منہ پر لٹوں کو کوئی جوگن چھوڑ دے

فراسو

ان کا زمانہ ۱۷۷۷ء سے ۱۸۶۱ء تک کا ہے۔ فراسو اُردو کے غیر ملکی شعراء میں ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اُردو اور فارسی کے علاوہ بھاشا میں بھی شعر کہے ہیں۔ وہ ظفریاب خاں کی بہن کے لڑکے تھے۔

بیتابیٔ دل سے ہے سروکار ٭ جس دن سے میں تجھ سے آشنا ہوں

عرق آلود رُخسار سے تمہارے ٭ گُلوں پر اوس گویا پڑ گئی ہے

آنے کی خبر ہے تیرے لیکن ٭ آتا نہیں اعتبار دل کو

جی تن میں نہیں نہ جان باقی ٭ ہے عشق کو امتحان باقی

غیر ہمراہِ یار می آید ٭ ہم خزاں ہم بہار می آید

جان اسمٹ

جان اسمٹ کا ذکر شور کے ایک قصیدے میں ملتا ہے۔ باوجود تلاش بسیار کے اُنکا کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ صرف ایک شعر ملا

جُھوم جھوم صحرا پر ابر کہسار آیا ٭ لو جنوں مبارک ہو موسمِ بہار آیا

اُردو اور فارسی کے اطالوی شعرا

اِس باب میں جن شاعروں کا کلام اب تک دستیاب ہوا ہے ان میں صرف تین نام آتے ہیں۔

(۱) کرنل جین بابٹسٹ فیلوز جاؔن

(۲) میجر جولین فیلوز طالبؔ

(۳) سر فلورنس فیلوز مطلوبؔ

یہ تینوں شاعر ایک ہی خاندان کے فرد ہیں۔ ان کے جدِ امجد مائیکل فیلوز ۱۷۷۰ء میں اٹلی سے ہندستان آئے تھے۔ جاؔن انہیں کے بیٹے تھے۔ وہ ۱۷۷۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔

جاؔن

جاؔن نے ہندستان کی کئی ریاستوں میں فوجی ملازمت کی۔ وہ اُردو سے زیادہ فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔ اُن کی فوجی خدمات کے سلسلے میں انھیں ریاست حیدر آباد کی طرف سے اعتماد الدولہ کرنل جان بٹس فیلوز صاحب بہادر برق جنگ کا خطاب بھی ملا تھا۔ اُن کا انتقال ۱۸۲۹ء میں اٹلی پہنچ کر ہوا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

جان بہ عجز و نیاز می دارد ❊ از بزرگان وسیلہ می دارد

الٰہی چو بسیار درماندہ ایم ❊ کرم کن کہ بسیار ناخواندہ ایم

گناہان کہ داریم بیش از شمار ❊ تو از فضل آن جملہ را درگذار

جاؔن کا بیشتر کلام حمد و ثنا سے پُر ہے اور صوفیانہ رنگ لئے ہوئے ہے۔

طالبؔ

طالبؔ، جان کے بیٹے تھے اور ۱۷۰۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ بھی مہاراجہ گوالیار کی فوج میں ملازم تھے۔ اپنے باپ کی طرح طالبؔ بھی سپہ گری کا پیشہ اپنانے کے باوجود شعر و ادب سے شوق و ذوق رکھتے تھے۔ اُن کا انتقال

نہایت کم عمری میں اپنے باپ کی زندگی ہی میں مر گیا تھا۔ انھوں نے ۴۳ سال کی عمر میں ۱۸۷۰ء میں گوالیار میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

ہر رنگ و گل میں تیری قدرت کھلی ہوئی ہے ؛ تصویر تیری یہ ہے خود کیوں چھپا ہوا ہے

فرہاد و قیس دو امتی پہنچے بمنزلِ عشق ؛ ڈھونڈھا ہے جس نے جس کو آخر وہ پا چکا ہے

ہائے طالب دیکھنے کو اس کی صورت کیلئے ؛ مرغِ دل تڑپے ہے کیا اُڑ کے ملنا چاہیے

مطلوب

اٹلی کے ان تین شاعروں میں مطلوب ہی پُرگو اور کسی حد تک اچھے شاعر کہے جانے کے مستحق ہیں۔ مطلوب طالب کے پانچویں بیٹے تھے۔ اور صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ وہ ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے تھے اور گوالیار میں ۸۳ سال کی عمر میں ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو اللہ کو پیارے ہوئے۔

ان کا دیوان "دیوانِ مطلوب" کے نام سے شائع ہوا۔ وہ سید وزیر علی وزیر کے بیٹے سید برکت علی نحیف کے شاگرد تھے۔ وزیر غالب کے شاگرد تھے۔

عیسیٰ مسیحا ناصری برحق ہے جلوہ نور کا ؛ انسان کی صورت بنا قدرت سے شعلہ طور کا

ہے عشق کی یہ انتہا مطلوب طالب بن گیا ؛ اب میرے آگے کم ہوا رتبہ بہت منصور کا

جو مجھ سے گریزاں ہے وہ کچھ تجھ سے نہیں دور ؛ اے جذبۂ دل اُس کو مرے پاس بلا دے

مصحفِ رخ کی تلاوت شیخ جی سے بن چکی ؛ بوڑھے طوطوں سے پڑھایا جاتا ہے قرآن کس طرح

اُس بت کی خامشی سے یہ عقدہ کھلا مجھے ؛ گلے سے آئے ہیں لبِ شیریں دہن کے چوٹ

اتفاقاً ترے کوچے سے جو ناصح گزرا ؛ عمر بھر کی ہوئی سب اس کی ریاضت برباد

٦

تو مجھ سے دل کے لینے میں پہلو تہی نہ کر ÷ صاحبدلوں کا کام ہے لینا ثواب دل

دریائے حقیقت کا کنارہ نظر آیا ÷ اس بحرِ مجازی سے جو اس پار گئے ہم

ہو صورتِ وصال تو پھر زندگی کہاں ÷ قائم ہے ہم سے غم کی غذا اور غذا سے ہم

موتی پرو کے زلف میں اختر بنا دیئے ÷ تو نے اندھیری رات میں تارے دکھا دیئے

ایہام آیا ہم پہ بوسے کا ÷ اتنا کیوں ہم کو منہ لگا بیٹھے

میں تو حجاب میں بھی تجھے دیکھتا رہا ÷ پردہ اُٹھا کے کیوں مری مٹی خراب کی

ناخن ہے ماہِ نو کفِ پا آفتاب ہے ÷ پھرتے ہیں تیرے قدموں سے شمس و قمر لگے

اُردو اور فارسی کے انڈو یوروپین شاعر

اس ضمن میں کئی نام آتے ہیں لیکن چند اہم نام حسب ذیل ہیں :-

(۱) بالبیٹ سردھنہ عروج اور بیٹس (۲) رضوان مراد آبادی
(۳) اِصفان (۴) جمیل سردھنہ

عروج اور بیٹس

بالبیٹ سردھنہ یہ دونوں تخلص استعمال کرتے تھے۔ انھیں زبان وبیان پر کافی قدرت تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی اکثر غزلیں بڑی سنگلاخ زمینوں میں کہی گئی ہیں اور ان کے قافیے بھی بڑے سخت ہیں :-

محشر سے میرے سوزشِ دل کو سبق ہے ✤ بس نفخِ صور بھی مجھے اک بانگِ برق ہے

جوششِ گریہ نے طوفاں کیا یاں تک برپا ✤ ڈوبا رہتا ہے سدا میرا بدن پانی میں

خوشی سے رہنا مری جان تو جہاں رہنا ✤ نہ لکھنا خط تو مگر دل سے آشنا رہنا

نہ پوچھ مجھ سے کہ کیا ہوگا اپنے دل میں سوچ ✤ خدا نخواستہ جس شخص کا خدا پھر جائے

رضوان مراد آبادی

رضوان بڑے کٹر عیسائی تھے۔ وہ سردھنہ سے ہجرت کر کے مراد آباد میں بس گئے تھے۔ انھوں نے حضرت عیسیٰ کی شان میں ایک نعت بھی لکھی ہے۔ غالباً رضوان ہندوستانی کرسچین تھے۔ اُن کی غزلیں دستیاب نہ ہو سکیں اگرچہ چند تذکروں میں ان کی غزلوں کا ذکر ہے۔

اترائیں نگاہیں جو پڑیں سوئے مسیحا ✤ وا، لوٹ گیا دیکھتے ہی روئے مسیحا

بُلبل کو محبت کبھی ہوتی نہ چمن سے ✤ پھولوں میں نہ بس جاتی اگر بوئے مسیحا

رضوان جو دمِ نزع اشارہ ہو طلب کا ✤ جاں کرتی ہوئی رقص چلے سوئے مسیحا

اِسفاں

اِسفاں بڑے خوبصورت شاعر خیال کئے جاتے ہیں۔ ان کا ذکر کئی تذکروں میں ملتا ہے لیکن بد قسمتی سے اُن کا کلام اب تک دستیاب نہ ہو سکا۔ وہ دلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ غالباً وہ نواب ظفریاب خاں کے دربار سے وابستہ تھے۔ وہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کا زمانہ ۱۸ ویں صدی کے آخر کا ہے۔ ان کا صرف ایک شعر ہی حاصل ہو سکا ہے ؎

خط کا یہ جواب آیا لکھا جو کبھی پھر خط ✤ کر ڈالوں گا اک دم میں ترے آن کے ٹکڑے

بتا سکتے ہیں کہ شیکسپیر، ملٹن یا شیلے اور کیٹس کے زمانے میں اُن کے ہم پلہ کوئی شاعرہ ہوئی ہے یا میر، غالب، ذوق یا مومن کے دور میں کوئی ایسی شاعرہ ہوئی ہے جو اُن کے سے شعر تو کجا اُن کے اشعار کے معنی ہی بخوبی سمجھ سکے۔ لے دے کے ایک زیب النساء ہی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ زیبِ داستان کے لئے ٹھیک ہے۔ بہر حال اِن خواتین شاعرات کا ذکر آپ قرۃ العین حیدر صاحبہ کے مضمون میں پڑھینگے جنھوں نے یقیناً جوئے شیر لانے جیسا کام کیا ہے۔

اُردو، ہندی اور فارسی میں کوئی ڈھنگ کی شاعرہ نہ ہونے کے جواز میں بعض لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہندستان چونکہ فیوڈل سسٹم کا زبردست مرکز رہا ہے۔ اس لئے ہندستانی عورت کو اپنے ٹیلنٹس اُجاگر کرنے کا موقع نہ مل سکا اور اس کے فکر، جذبات اور احساسات پہ زبردست پہرے لگے رہے۔ اس بےوزن دلیل کو اگر مان بھی لیا جائے تو کیا انگلینڈ، فرانس، امریکہ، جرمنی اور ۱۹۱۷ء کے بعد کے روس میں بھی فیوڈل انڈیا جیسے ہی حالات تھے وہاں کوئی بڑی شاعرہ یا گوارا قسم کی شاعرہ کیوں نہیں پیدا ہوئی۔ ترکی میں تو ایک عرصے سے عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ ہر میدان میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ وہاں کوئی "ناظم حکمت" کیوں نہیں پیدا ہوئی اور پھر روس ہی میں انقلاب کے بعد اِن ۶۰ برسوں میں کونسی شاعرہ پیدا ہو گئی ہے؟

اس بحث سے میرا مقصد عورتوں کو لیٹ ڈاؤن کرنا قطعاً نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں قرۃ العین حیدر کو اس صدی کی سب سے بڑی رائٹر نہ کہتا اور انھیں پریم چند اور کرشن چندر کے ہم پلہ قرار نہ دیتا۔ اگر لوگ بھوؤں نہ چڑھائیں تو قرۃ العین حیدر، ون آف دی گریٹیسٹ رائٹرس نہیں بلکہ دی گریٹیسٹ رائٹر آف دِس سینچری کہلائی جانے کی مستحق ہیں۔

اس مضمون میں جتنا غیر ہندستانی شاعروں کا ذکر ہے ظاہر ہے۔ وہ فہرست مکمل نہیں ہے سیکڑوں ہزاروں شاعر ایسے ہوں گے جو گمنام یا کم نام ہیں اور جن کا ذکر کسی بھی تذکرے میں نہیں ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ان غیر ہندستانی شاعروں میں ایک شاعر بھی ایسا نہیں ہے جس کا تعلق براہ راست ایران، افغانستان یا کسی عرب ملک سے ہو عربی اور ایرانی زبانیں اُردو سے بہت ہی قریب ہیں اور اِن کا رسم الخط بھی ایک ہی ہے۔ یہی بات پشتو کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے لیکن ان ممالک کے کسی ایک شاعر نے بھی اُردو میں طبع آزمائی نہیں کی۔ ممکن ہے ایسی مثالیں مل جائیں کہ کسی اُردو شاعر کے جد امجد ایران، افغانستان یا عرب کے کسی ملک سے آکر ہندستان میں آباد ہو گئے ہوں اور اُن کا کوئی پوتا یا پڑپوتا اُردو میں شاعری کرنے لگا ہو لیکن ایسی مثالیں شاذ ہی ملیں گی کہ کوئی ایرانی، افغانستانی یا عرب نژاد شخص ہندستان آکر اُردو میں شاعری کرنے لگا ہو یا اُس کی کسی اولاد نے اُردو میں طبع آزمائی کی ہو۔ اگر ہم اس بات کو ذہن میں رکھیں تو اُردو اور فارسی کے یوروپین شعراء کی قدر و منزلت ہماری نظروں میں اور بڑھ جاتی ہے۔

ایک اور حقیقت بڑی تلخ ہے۔ اس مضمون میں جن شعراء کا ذکر ہے وہ سب اُن ادوار کی پیداوار ہیں جب اُردو کی ترویج و اشاعت کافی محدود تھی اور اُردو نے ہندوستان کی سرحدوں کے باہر بہت کم قدم نکالا تھا لیکن جبکہ اُردو پردہ نشین نہیں رہی بلکہ ہندوستان سے باہر کئی ملکوں میں اپنے جلوے دکھا رہی ہے۔ اور بیشتر ممالک کی یونیورسٹیوں میں سکھائی اور پڑھائی جا رہی ہے اس کے غیر ملکی شعراء کی تعداد بجائے بڑھنے کے گھٹتی جا رہی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اردو میں غیر ملکی شاعر اور ادیب اب ناپید ہو گئے ہیں۔

ماخذ :- (۱) "یوروپین اینڈ انڈو یوروپین پوئٹس آف اُردو اینڈ پرشین" از رائے بہادر رام بابو سکسینہ۔
(۲) "انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا"۔
(۳) "گلستان بے خار" از حکیم میر قطب الدین۔
(۴) "انتخاب یادگار" از امیر مینائی۔
(۵) "دیوان الیگزینڈر ہیڈرلی آزاد"
(۶) "دواوین جارج پیش شور"۔

ہر نسل نئی اِک رہبر ہے
جو ہم سے آگے چلتی ہے
کل مشعل اپنے ہاتھ میں تھی
آج اُسکے ہاتھ میں جلتی ہے

(جاں نثار اختر مرحوم)

آج کی غزل

مُرتّب :-
صابر دت

غـــزل نمبر

فن اور شخصیت:

غزل جیسی پیاری اور خوبصورت صنف دنیا کی کسی بھی زبان کی شاعری میں نہیں ہے۔ یہ اعزاز صرف اُردو اور فارسی زبان کو ہی حاصل ہے۔ اگر آپ غزل کو اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھیں تو آپکے سامنے ہر دور کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کی تصویر آجائے گی، جو کسی بھی مورخ کے کام سے زیادہ مکمل، واضح اور سچی ہوگی کیونکہ فنکار کی زبان کسی بھی دور میں دبی نہیں۔ فنکار کٹ گیا، جھکا نہیں۔

اب آیئے ذرا آجکی غزل کی بات کریں۔ اس کا انتخاب کرتے وقت کچھ باتیں میرے ذہن میں آئیں جنکا میں یہاں ذکر کرنا چاہوں گا۔ دراصل ترقی پسند تحریک کے بعد جن شعراء کی کھیپ ہمارے سامنے آئی ہے تو اُن میں ایک حد تک میں بھی شامل ہوں۔) وہ زیادہ تر اپنے معاشی مسائل میں اُلجھی ہوئی ہے۔ سیاسی شعور سے بے بہرہ ہے، زبان پر عبور حاصل نہیں ہے، ان کا نہ کوئی راستہ ہے اور نہ منزل، نہ وہ آپس میں مل بیٹھتے ہیں اور نہ ہی اپنے سے بڑوں کا احترام کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ شاید اسی وجہ سے پچھلے بیس پچیس برسوں میں غالب اور اقبال کی بات تو چھوڑ دیئے، مجاز، فیض، جاں نثار اختر، علی سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی جیسی آواز بھی پیدا نہ ہو سکی۔ اگر آپ "شب خون" اور "تحریک" کے اوراق اُلٹ کر دیکھیں تو آپ کو 'نقشہ'۔ 'ذات'۔ 'جنگل'۔ 'مٹی'۔ 'سورج'۔ 'سمندر'۔ 'تنہائی'۔ 'بے چہرگی'۔ 'صلیب'، 'تشنگی'، 'وحشت' اور 'قتل' کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔ یعنی ان دونوں رسائل نے ایسے الفاظ چھاپ چھاپ کر اچھے اور بُرے کی تمیز ہی مٹا دی ہے۔ پھر بھی میں نے کچھ آوازوں کا انتخاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ آوازیں آپ کو آنگن میں اُگے تلسی کے پودے" "چاندنی میں نہاتے ہوئے بدن" "گاؤں کے چوپال" "پہاڑ کے دامن سے پھوٹتے آبشار" یا کسی چنار کی چھاؤں میں ستاتی نظر آئیں گی۔ آپ ایکدم اپنے ماضی میں چلے جائیں گے جو کمبخت ظالم ہونے پر بھی خوبصورت لگتا ہے۔

صبا

نوٹ:۔ سرحد پار کے کچھ شاعروں کا تعارف نہ دے سکا کیوں کہ ان کے حالاتِ زندگی مہیا نہ ہو سکے

ناصر کاظمی

ناصر کاظمی کا نام جدید اردو غزل میں نمایاں ہے۔ غزل کی روایت کو آگے بڑھانے میں ناصر کا بڑا ہاتھ ہے۔

۱۹۲۵ء میں انبالہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم انبالہ میں اور اس کے بعد لاہور میں ہوئی۔ اوراقِ نو، خیال اور ہمایوں کے ایڈیٹر رہے پھر محکمۂ دیہات سدھار میں ملازم ہوئے۔ غزل میں خوب نام پیدا کیا۔ آخر ش ۱۹۷۲ء میں پاکستان میں انتقال ہوا۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام "برگِ نے" ان کی یادگار ہے۔

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

ناصر کاظمی

○

کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو!
تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

یہ کہہ کے چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی
گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

○

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے

شعلے میں ہے ایک رنگ تیرا
باقی ہیں تمام رنگ میرے

دیتے ہیں سراغ فصلِ گل کا!!
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے

جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو!
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

رودادِ سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرسِ گل اداس کر کے مجھے

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

میں رو رہا تھا مقدر کی سخت راہوں میں
اڑا کے لے گئے جادو تری نظر کے مجھے

میں تیرے درد کی طغیانیوں میں ڈوب گیا
پکارتے رہے تارے ابھر ابھر کے مجھے

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انھیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے

ذرا سی دیر ٹھہرنے دے اے غمِ دنیا
بلا رہا ہے کوئی بام سے اتر کے مجھے

پھر آج آئی تھی اک موجۂ ہوائے طرب
سنا گئی ہے فسانے ادھر ادھر کے مجھے

سفرِ منزلِ شب یاد نہیں
لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں

وہ ستارہ تھی کہ شبنم تھی کہ پھول
ایک صورت تھی عجب یاد نہیں

کیسی ویراں ہے گزرگاہِ خیال
جب سے وہ عارض و لب یاد نہیں

ایسا الجھا ہوں غمِ دنیا میں
ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں

یہ حقیقت ہے کہ احباب کو ہم
یاد ہی کب تھے جو اب یاد نہیں

یاد ہے سیرِ چراغاں ناصر
دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں

کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے
دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے

اب تو جھونکے سے لرز اٹھتا ہوں
نشۂ خوابِ گراں تھا پہلے

اب تو منزل بھی ہے خود گرمِ سفر
ہر قدم سنگِ نشاں تھا پہلے

سفرِ شوق کے فرسنگ نہ پوچھ
وقت بے قیدِ مکاں تھا پہلے

یہ الگ بات کہ غم راس ہے اب
اس میں اندیشۂ جاں تھا پہلے

ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں
اس طرف چشمہ رواں تھا پہلے

اب بھی تو پاس نہیں ہے لیکن
اس قدر دور کہاں تھا پہلے

کیا سے کیا ہو گئی دنیا پیارے
تو وہیں پر ہے جہاں تھا پہلے

ہم نے روشن کیا معمورۂ غم
ورنہ ہر سمت دھواں تھا پہلے

غم نے پھر دل کو جگایا ناصر
خانہ برباد کہاں تھا پہلے

وا ہوا پھر درِ میخانۂ گل
پھر صبا لائی ہے پیمانۂ گل

پھول برسائے یہ کہہ کر اس نے
میرا دیوانہ ہے دیوانۂ گل

پھر سرِ شام کوئی شعلہ نوا
سو گیا چھیڑ کے افسانۂ گل

آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں
ہم سے تھی رونقِ کاشانۂ گل

ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے
ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل

ہم ہی گلشن کے امیں ہیں ناصر
ہم سا کوئی نہیں بیگانۂ گل

شکیب جلالی

شکیب جلالی جنہیں اُردو دنیا پاکستان کا شاعر سمجھتی ہے ہندوستان کے ہی ایک علاقہ قصبہ جلالی ضلع علی گڑھ، میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء ہے۔ شاعری کا آغاز ۱۹۴۸ء میں ہوا اور شادی ۱۹۵۶ء میں ہوئی۔ اور ۱۲ نومبر ۱۹۶۶ء کو ۳۲ برس کی عمر میں ریل گاڑی کے نیچے آکر خودکشی کرلی اور سرگودھا میں دفن ہوئے۔ ان کے بیٹے کا نام عالی اور بیٹی کا نام حنا ہے۔

اپنی کم عمری میں انھوں نے اردو شاعری میں جو شہرت اختیار کی ہے وہ شاذ و نادر ہی کسی اور شاعر کو نصیب ہوئی ہے۔ غزل گوئی میں ملکہ حاصل تھا اور ادب کی بھیڑ بھاڑ میں انفرادیت حاصل کرنا انھیں کا حصہ تھا۔ جتنی بھی غزلیں انہوں نے کہیں سب کی سب شاعری کے شیدائیوں میں مشہور ہوئیں۔ اہلِ ادب ان کی خودکشی پر آج تک آنسو بہاتے ہیں۔

موجودہ ادب کے اہم ستون احمد ندیم قاسمی نے ایک جگہ ان کے بارے میں لکھا ہے "ناصر کاظمی احمد فراز، اور شہزاد احمد جیسے کامیاب غزل گو شعراء کی موجودگی میں کسی نئے شاعر کا غزل کے میدان میں اپنا ایک مقام پیدا کرلینا کچھ آسان نہ تھا مگر شکیب کی بے پناہ فنی اور تخلیقی قوتوں نے چند ہی برس کے اندر اسے ان غزل گو شعراء کے برابر لا کھڑا کیا ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں شکیب کے دم سے اردو غزل نے ایک اور سنبھالا لیا ہے۔"

کیا کہوں دیدۂ تر، یہ تو مرا چہرہ ہے
سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی جہاں دھار گرے

شکیب جلالی

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اُس پیڑ کے پھل تھے، پسِ دیوار گرے

ایسی دہشت تھی فضاؤں میں کھلے پانی کی
آنکھ جھپکی بھی نہیں، ہاتھ سے پتوار گرے

مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں میں گروں
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

تیرگی چھوڑ گئے دل میں اجالے کے خطوط
یہ ستارے مرے گھر ٹوٹ کے بیکار گرے

وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے
کس گھڑی سر پہ یہ لٹکی ہوئی تلوار گرے

کیا کہوں دیدۂ تر، یہ تو مرا چہرہ ہے
سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی جہاں دھار گرے

ہاتھ آیا نہیں کچھ رات کی دلدل کے سوا
ہائے کس موڑ پہ خوابوں کے پرستار گرے

وہ تجلی کی شعاعیں تھیں کہ جلتے ہوئے تیر
آئنے ٹوٹ گئے، آئنہ بردار گرے

دیکھتے کیوں ہو شکیبؔ اتنی بلندی کی طرف
نہ اٹھایا کرو سر کو کہ یہ دستار گرے

○

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے
مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے

نہ اتنی تیز چلے، سرپھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے

بُرا نہ مانیے لوگوں کی عیب جوئی کا
انھیں تو دن کا بھی سایا دکھائی دیتا ہے

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

وہ الوداع کا منظر، وہ بھیگتی پلکیں
پسِ غبار بھی کیا کیا دکھائی دیتا ہے

مری نگاہ سے چھپ کر کہاں رہے گا کوئی
کہ اب تو سنگ بھی شیشہ دکھائی دیتا ہے

سمٹ کے رہ گئے آخر پہاڑ سے قد بھی
زمیں سے ہر کوئی اونچا دکھائی دیتا ہے

کھلی ہے دل میں کسی کے بدن کی دھوپ شکیبؔ
ہر ایک پھول سنہرا دکھائی دیتا ہے

○

وہی جھکی ہوئی بیلیں، وہی دریچہ تھا
مگر وہ پھول سا چہرہ نظر نہ آتا تھا

میں لوٹ آیا ہوں خاموشیوں کے صحرا سے
وہاں بھی تیری صدا کا غبار پھیلا تھا

قریب تیر رہا تھا بطوں کا اک جوڑا
میں آب جو کے کنارے اداس بیٹھا تھا

بنی نہیں جو کہیں پر، کلی کی تربت تھی
سنا نہیں جو کسی نے، ہوا کا نوحہ تھا

یہ آڑی ترچھی لکیریں بنا گیا ہے کون
میں کیا کہوں، مرے دل کا ورق تو سادا تھا

ادھر سے بارہا گزرا مگر خبر نہ ہوئی
کہ زیرِ سنگ خنک پانیوں کا چشمہ تھا

میں ساحلوں میں اتر کر شکیب کیا لیتا
ازل سے نام مرا پانیوں پہ لکھا تھا

○

کنارِ آب کھڑا خود سے کہہ رہا ہے کوئی
گماں گزرتا ہے، یہ شخص دوسرا ہے کوئی

ہوا نے توڑ کے پتہ زمیں پہ پھینکا ہے
کہ شب کی جھیل میں پتھر گرا دیا ہے کوئی

بٹا سکے ہیں پڑوسی کسی کا درد کبھی
یہی بہت ہے کہ چہرے سے آشنا ہے کوئی

درخت راہ بتائیں ہلا ہلا کر ہاتھ
کہ قافلے سے مسافر بچھڑ گیا ہے کوئی

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں!
حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

شکیب دیپ سے لہرا رہے ہیں پلکوں پر
دیارِ چشم میں کیا آج رت جگا ہے کوئی

○

زرد کے موسم کا کیا ہوگا اثر انجان پر
دوستو پانی کبھی رکتا نہیں ڈھلوان پر

آج تک اس کے تعاقب میں بگولے ہیں رواں
ابر کا ٹکڑا کبھی برسا تھا ریگستان پر

میں جو پربت پہ چڑھا وہ اور اونچا ہو گیا
آسماں جھکتا نظر آیا مجھے میدان پر

کمرے خالی ہو گئے، سایوں سے آنگن بھر گیا
ڈوبتے سورج کی کرنیں جب پڑیں دالان پر

اب یہاں کوئی نہیں ہے، کس سے باتیں کیجیے
یہ مگر چپ چاپ سی تصویر آتشدان پر

وہ خموشی انگلیاں چٹخا رہی تھی اے شکیب
یا کہ بوندیں بج رہی تھیں رات روشندان پر

آخری غزل

(یہ غزل شفاخانۂ امراضِ دماغی میں کہی گئی)

گلے ملا نہ کبھی چاند، بخت ایسا تھا
ہرا بھرا بدن اپنا درخت ایسا تھا

ستارے سسکیاں بھرتے تھے اوس روتی تھی
فسانۂ جگرِ لخت لخت ایسا تھا

ذرا نہ موم ہوا پیار کی حرارت سے
چٹخ کے ٹوٹ گیا، دل کا سخت ایسا تھا

یہ اور بات کہ وہ لب تھے پھول سے نازک
کوئی نہ سہہ سکے، لہجہ کرخت ایسا تھا

کہاں کی سیر نہ کی توسنِ تخیّل پر
ہمیں تو یہ بھی سلیماں کے تخت ایسا تھا

اِدھر سے گزرا تھا مُلکِ سُخن کا شہزادہ
کوئی نہ جان سکا، ساز و رخت ایسا تھا

احمد فراز

آج کل احمد فراز کا نام خاص و عام میں مشہور ہے۔ ان کی غزلوں کو شہرت دینے میں باکمال گلوکار مہدی حسن کا بڑا ہاتھ ہے۔ موسیقی اور شعر و ادب کی محفلوں میں ان کے خوب خوب چرچے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں کوہاٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام آغا برق ہے اُردو اور فارسی ادبیات سے ایم۔ اے کیا۔ دس برس تک شعبۂ نشریات سے منسلک رہے۔ آجکل یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ پاکستان میں قیام پذیر ہیں۔ شاعری کے دو مجموعے "تنہا تنہا" اور "دردِ آشوب" اور منظوم ڈراموں کا مجموعہ "موم کے پتھر" چھپ چکے ہیں۔

فراز کا درج ذیل شعر بہت مشہور ہے لیکن ماہرانِ فن کا کہنا ہے کہ ان دونوں مصرعوں میں ربط نہیں ہے۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

احمد فراز

○

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لئے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لئے آ

کچھ تو مرے پندارِ محبت کا بھرم رکھ
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لئے آ

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رسم و رہِ دنیا ہی نبھانے کے لئے آ

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے، تو زمانے کے لئے آ

اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رلانے کے لئے آ

اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لئے آ

○

دوست بن کر بھی نہیں ساتھ نبھانے والا
وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

صبحدم چھوڑ گیا نکہتِ گل کی صورت
رات کو غنچۂ دل میں سمٹ آنے والا

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اس سے
وہ جو اک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا

تیرے ہوتے ہوئے آ جاتی تھی ساری دنیا
آج تنہا ہوں تو کوئی نہیں آنے والا

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

○

نہ انتظار کی لذت، نہ آرزو کی تھکن
بجھی ہیں درد کی شمعیں، کہ سو گیا ہے بدن

غریبِ شہر کسی سایۂ شجر میں نہ بیٹھ
کہ اپنی چھاؤں میں خود جل رہے ہیں سرو و سمن

بہارِ قرب سے پہلے اُجاڑ دیتی ہیں
جدائیوں کی ہوائیں، محبتوں کے چمن

وہ ایک رات گذر بھی گئی، مگر اب تک
وصالِ یار کی لذت سے ٹوٹتا ہے بدن

امیرِ شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلۂ مذہب، کبھی بنامِ وطن

ہوائے دہر سے دل کا چراغ کیا بجھتا
مگر فراز سلامت ہے یار کا دامن

○

کروں نہ یاد، مگر کس طرح بھلاؤں اُسے
غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اُسے

وہ خار خار ہے شاخِ گلاب کی مانند
میں زخم زخم ہوں، پھر بھی گلے لگاؤں اُسے

مگر وہ زود فراموش زود رنج بھی ہے
کہ روٹھ جائے، اگر یاد کچھ دلاؤں اُسے

وہی جو دولتِ دل ہے، وہی جو راحتِ جاں
تمہاری بات پہ اے ناصحو! گنواؤں اُسے

جو ہمسفر سرِ منزل بچھڑ رہا ہے فراز
عجب نہیں ہے اگر یاد بھی نہ آؤں اُسے

○

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

ڈھونڈ اُجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

غمِ دنیا بھی غمِ یار میں شامل کر لو!
نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

تو خدا ہے، نہ مرا عشق فرشتوں جیسا!
دونوں انساں ہیں، تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر!
کیا عجب، کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

اب نہ وہ میں، نہ وہ تو ہے، نہ وہ ماضی ہے فراز
جیسے دو شخص تمنا کے سرابوں میں ملیں

○

دل تو وہ برگِ خزاں ہے کہ ہوا لے جائے
غم وہ آندھی ہے کہ صحرا بھی اُڑا لے جائے

کون لایا تری محفل میں ہمیں ہوش نہیں
کوئی آئے تری محفل سے اٹھا لے جائے

اور سے اور ہوئے جاتے ہیں معیارِ وفا
اب متاعِ دل و جاں بھی کوئی کیا لے جائے

جانے کب اُبھرے تری یاد کا ڈوبا ہوا چاند
جانے کب دھیان کوئی ہم کو اُڑا لے جائے

یہی آوارگیٔ دل ہے، تو منزل معلوم
جو بھی آئے تری باتوں میں لگا لے جائے

دشتِ غربت میں تمہیں کون پکارے گا فراز
چل پڑو خود ہی جدھر دل کی صدا لے جائے

پریم وار برٹنی

چنڈی گڑھ

پیارے صابر دت!

پچیس سال اردو ادب کی خدمات انجام دینے کے بعد آٹھ ہزار روپے قرض لیکر اپنا مصور شعری انتخاب شائع کیا تھا۔ لیکن ابھی تک مقروض ہوں۔ پوری رقم واپس نہیں ہو پائی۔ حالانکہ اس میں ڈیڑھ ہزار روپیہ وہ بھی شامل ہے، جو اتر پردیش اردو اکیڈمی نے 'خوشبو کا خواب' پر نقد انعام دیا تھا۔ اور وہ رقم بھی، جو انگلستان سے اس مجموعہ کی فروخت سے حاصل ہوئی۔ برصغیر ہند و پاک کے ادبی حلقوں کو معلوم ہے کہ انجمن ترقی اردو (برطانیہ) نے لندن میں میری شاعری کا (میرا نہیں) جشن منایا تھا اور انگلستان کے سہ ماہی جریدے 'ادب' نے میرے بارے میں ایک خصوصی نمبر شائع کیا ہے۔ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ اتنی غیر معمولی شہرت کیسے ملتی ہے؟ لیکن یار صابر دت! تم تو جانتے ہو کہ میری شہرت کو ہمیشہ رسوائیوں کے کفن پہنائے گئے ہیں۔ کبھی مے نوشی کا کفن اور کبھی خاموشی کا کفن! ورنہ دس سال فلم انڈسٹری سے وابستہ رہ کر اور دو درجن فلموں کے گیت لکھنے کے بعد ایک عدد کار اور ایک فلیٹ کا مالک بننا زیادہ دشوار کام نہ تھا مگر تم اس راز سے بخوبی واقف ہو کہ میں نے فلم لائن کیوں چھوڑی؟

ان دنوں برسوں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لئے نظم و نثر میں ہر طرح کا کمرشل کام کرنے کے باوجود اتنی آمدن نہیں ہوپاتی جو میرے اخراجات کو پورا کرسکے۔ ان حالات میں مجھ سا زود گو شاعر کہاں جائے۔ کیا کرے؟ اردو زبان و ادب کے پرستاروں کی بے حسی سے عاجز آکر گزشتہ تین چار برسوں سے پنجابی میں بھی لکھ رہا ہوں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اتنے قلیل عرصہ میں پنجابی سے اس قدر 'ریسپانس' ملا ہے جو اردو میں پچیس سال لکھنے کے باوجود نہیں ملا۔ بہرکیف اردو شعر و ادب سے میرا تخلیقی اور روحانی رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ لیکن اس زبان میں اپنے مستقبل سے مایوس ضرور ہوں۔ اور ایک غزل کا یہ مقطع میرے نظریات کا آئینہ دار ہے

پریم نے جاؤ عجائب گھر میں رکھ دینا کہیں
اس مزار شاعری کا آخری پتھر ہوں میں

پریم وار برٹنی
۱۲ر فروری ۱۹۷۸ء

پریم وار برٹنی

○

دُنیا سوچے شوق سے سوچے آج اور کل کے بارے میں
میں کیوں اپنا چین گنواؤں اس پاگل کے بارے میں

سنگِ مرمر کی قبروں میں محوِ خواب تھے ہم دونوں
کل شب دیکھا خواب عجب سا تاج محل کے بارے میں

آخر اس کی سوکھی لکڑی ایک چِتا کے کام آئی
ہرے بھرے قصّے سنتے تھے جس پیپل کے بارے میں

میرے شیتل من کی جوالا کو تو اور بھی بھڑکایا
لوگ نہ جانے کیا کہتے ہیں گنگا جل کے بارے میں

آنسو بن کر ٹوٹ گیا تھا جو سپنوں کی پلکوں سے
سات یُگوں سے سوچ رہا ہوں میں اس پل کے بارے میں

چُومو گھونگھٹ کھول کے چُومو اس دُلہن کے ہونٹوں کو
یہ اپنا دستور ہے، مے کی ہر بوتل کے بارے میں

وہ جو کُٹیا ڈال رہا ہے ویرانے میں شہر سے دُور
سارا شہر پریشاں کیوں ہے اس پاگل کے بارے میں

پریم بھری محفل میں کوئی داد نہیں فریاد نہیں
چُپ سی ہے وہ جانِ غزل میری غزل کے بارے میں

یہ زندگی ہے یا کسی جوگن کے دل کی آہ
جس کے لئے فقیر ہوئے کتنے بادشاہ

آیا نہ چین پھر کبھی دن میں نہ رات میں
دیکھی تھی دو گداز جزیروں کی خوابگاہ

سب کی سیاہ کوکھ میں ہے آگ سے بھنور
مت بند سیپیوں سے بڑھاؤ نہ رسم و راہ

شکوہ سمندروں کا کوئی کس طرح کرے
ساحل بھی خود نہیں تھے سفینوں کے خیرخواہ

ریشم ہوں روشنی کا ہواؤں میں اُڑ نہ جاؤں
تو مجھ کو اپنے لمس کے آنچل میں دے پناہ

اے پریم میں وہ دھوپ کا جلتا درخت ہوں
تھی جس کی زندگی کبھی شاداب سیرگاہ

خواہشوں کے جنگلوں سے جب گزرتی ہے ہوا
بازوؤں میں لے کے مجھ کو رقص کرتی ہے ہوا

چاندنی شاید کوئی لڑکی ہے سولہ سال کی
جس کے سینے پر جھجک کر ہاتھ دھرتی ہے ہوا

جس طرح تنہائی میں سگرٹ کا لہراتا دھواں
یوں گھٹا کے سنگ بل کھا کر بکھرتی ہے ہوا

کون جانے کب لپٹ جائیں اجازت کے بغیر
بازو پھیلائے ہوئے پیڑوں سے ڈرتی ہے ہوا

جب فضا کو گھیر لیتا ہے دھندلکا شام کا
ننگے پیروں دل کے آنگن میں اُترتی ہے ہوا

پریم تیری شاعری ہے یا کسی بیوہ کی مانگ
جس میں اپنی سوچ کا سیندور بھرتی ہے ہوا

○

بھاگی اگر ملاپ کے موسم کی آس اور ٭ اس دودھیا بدن میں کھلے گی کپاس اور

جب جب کنواری دھوپ میں اُگتی ہے گھاس اور ٭ لگتی ہے واسنا کے جزیروں کو پیاس اور

انگڑائی لے کے شوق سے زلفوں کو کھول دے ٭ میرے سوا نہیں ہے کوئی آس پاس اور

شامل کرو لہو میں ذرا سا ہوس کا رنگ ٭ نکھرے گا اس سے کانچ کا اُجلا گلاس اور

کیا ناپسند ہے اسے خوشبو کا پیرہن ٭ تبدیل کر رہی ہے ہوا کیوں لباس اور

اچھا ہے بادلوں میں رہے چاندنی ابھی ٭ برسا تو لا بدن میں آئے گا راس اور

ہر شخص چلتا پھرتا ہوس کا ہے اشتہار ٭ لائیں کہاں سے ڈھونڈ کے پھر دیوداس اور

پیتے ہیں چاند رات کے سینے سے ناگ دودھ ٭ دیکھا ہے آپ نے کبھی ایسا دلاس اور

تو کیا کہ تیرے گھر میں تیرا عکس تک نہیں ٭ آئینہ ہو نہ جائے اکیلا اداس اور

اے پریم سب ہیں گول چٹانوں کے یاتری
کب تک کریں گے من کی گپھا میں نواس اور

بانی

دہلی

ڈیئر صابر!

سلام!

[illegible] ملا۔ تم نے مجھے اپنے بارے میں [illegible] لکھنے کو کہا ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ دوسری جنگِ عظیم [illegible] ۱۹۴۵ء میں میں نے اردو شاعری سے اپنا رشتہ جوڑا۔

اردو کی ابتدائی تعلیم [illegible] اور پھر محبت ہو گئی اردو سے۔
آزادی کے موقع پر ہم لوگ ملتان شہر سے رخصت ہوئے اور دہلی کو اپنا وطن بنایا۔
دہلی میں محمود ہاشمی سے ملاقات ہوئی۔ اُس کی شعر شناسی اور ذہانتِ نقد نے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ۱۹۵۴ء میں تعلیم مکمل کی اور تب سے برسرِ روزگار ہوں۔
۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۷ء تک "تخلیق" کے حصۂ نظم کا ایڈیٹر رہا۔ محمود ہاشمی کے ساتھ مل کر مختصر نظم کی ہیئت اور ماہیت پر کام کیا۔ نئے احساس اور اس کی عصری پیچیدگیوں کو نظم میں فروغ دینے کی کوشش کی۔ کسی نے کہہ دیا یہ سب کچھ غزل میں ممکن نہیں۔ تب سے غزل بھی کہہ رہا ہوں اور کہاں تک اپنی کہی ہوئی بات میں کامیاب ہو سکا ہوں اس کی مجھے خبر نہیں۔
پہلا مجموعہ "حرفِ معتبر" ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔
دوسرا مجموعہ "حسابِ رنگ" حال ہی میں چھپا ہے۔
پاکستان اور ہندوستان کے منتخب رسائل میں شائع ہوا ہوں اور اب تمہارے پرچے میں شامل ہو رہا ہوں۔

شکریہ۔

تمہارا بانی

۲۰ر فروری ۱۹۷۶ء

باقی

○

نہ منزلیں تھیں، نہ کچھ دِل میں تھا، نہ سر میں تھا
عجب نظارۂ لاسمتیت نظر میں تھا

عتاب تھا کسی لمحے کا اِک زمانے پر
کسی کو چین نہ باہر تھا اور نہ گھر میں تھا

چھپا کے لے گیا دُنیا سے اپنے دل کے گھاؤ
کہ ایک شخص بہت طاق اِس ہنر میں تھا

کسی کے لوٹنے کی جب صدا سُنی تو کھلا
کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی سفر میں تھا

جھجک رہا تھا وہ کہنے سے کوئی بات ایسی
میں چُپ کھڑا تھا کہ سب کچھ مری نظر میں تھا

ابھی نہ برسے تھے باقیؔ گھرے ہوئے بادل
میں اُڑتی خاک کی مانند رہگذر میں تھا

○

صبح کے سبز نم سی نوا کِس کی تھی
محوِ ترتیبِ نغمہ فضا کِس کی تھی

سارے رنگوں پہ عکسِ حِنا کِس کا تھا
سارے منظر پہ حاوی ادا کِس کی تھی

ایک بے داغ باطن سے نِکلی ہوئی
بات بے ساختہ، بے خطا کِس کی تھی

ہم کہ اک دوسرے کے سوا کِس کے تھے
آرزو، آرزو سے جُدا کِس کی تھی

راستے تھے دُھلے منظروں کی طرح
ابر بن کر جو برسی دُعا کِس کی تھی

باقی

○

کچھ نہ کچھ ساتھ اپنے یہ اندھا سفر لے جائیگا
پاؤں میں زنجیر ڈالوں گا تو سر لے جائیگا

اندر اندر ریگ بیک اُٹھے گا طوفانِ نفی
سب نشاطِ نفع سب رنجِ ضرر لے جائیگا

ایک پیلا رنگ باقی رہ گیا ہے آنکھ میں
ڈوبتا منظر اسے دامن میں بھر لے جائیگا

گھومتا ہے شہر کے سب سے حسیں بازار میں
اِک اذیت ناک محرومی وہ گھر لے جائیگا

منتظر اِک لمحۂ سادہ امیدی کا ہوں میں
جانے کب آئے گا سینے کے بھنور لے جائیگا

اب نہ لائے گا کوئی، اُس کا پتہ میرے لیئے
اور وہاں کوئی نہ اب میری خبر لے جائیگا

اس قدر خالی ہوا بیٹھا ہوں اپنی ذات میں
کوئی جھونکا آئے گا جانے کدھر لے جائیگا

○

سِلسِلہ روشن تجسس کا اُدھر میرا بھی ہے
اے ستارو اس خلا میں اِک سفر میرا بھی ہے

چار جانب کھینچ دیں اُس نے لکیریں آگ کی
میں کہ چلایا بہت، بستی میں گھر میرا بھی ہے

جانے کس کا کیا چھپا ہے اس دھوئیں کی صف کے پار
ایک لمحے کا اُفق اُمید بھر، میرا بھی ہے

راہِ آساں دیکھ کر سب خوش تھے، پھر میں نے کہا
سوچ لیجئے، ایک اندازِ نظر میرا بھی ہے

یہ بساطِ آرزو ہے، اِس کو یوں آساں نہ کھیل
تجھ سے وابستہ بہت کچھ داؤ پر میرا بھی ہے

جینے مرنے کا جُنوں دل کو ہُوا باقی بہت
آسماں اِک چاہیئے مجھ کو سفر میرا بھی ہے

بانی

○

عجیب تجربہ تھا بھیڑ سے گزرنے کا
اسے بہانہ ملا مجھ سے بات کرنے کا

پھر ایک موج اسے کھینچ لے گئی تہہ آب
تماشہ ختم ہوا ڈوبنے ابھرنے کا

مجھے خبر ہے کہ رستہ مزار چاہتا ہے
میں خستہ پا سہی لیکن نہیں ٹھہرنے کا

تھما کے ایک بکھرتا گلاب میرے ہاتھ
تماشہ دیکھ رہا ہے وہ میرے ڈرنے کا

یہ آسماں میں سیاہی بکھیر دی کس نے
ہمیں تھا شوق بہت اس میں رنگ بھرنے کا

بس ایک چیخ گری تھی پہاڑ سے یک لخت
عجب نظارہ تھا پھر دھند کے بکھرنے کا

○

کوئی بھولی ہوئی شے طاق ہر منظر پہ رکھی تھی
ستارے چھت پہ رکھے تھے شکن بستر پہ رکھی تھی

لرز جاتا تھا باہر جھانکنے سے اس کا تن سارا
سیاہی جانے کن راتوں کی اس کے در پہ رکھی تھی

وہ اپنے شہر کے مٹتے ہوئے کردار پر چپ تھا
عجب، اک لاپتہ ذات اس کے اپنے سر پہ رکھی تھی

کہاں کی سیر ہفت افلاک، اوپر دیکھ لیتے تھے
حسیں، اجلی کپاسی برف بال و پر پہ رکھی تھی

کوئی کیا جانتا کیا چیز کس پر بوجھ ہے بانی
ذرا سی اوس تھی یوں تو اور اک پتھر پہ رکھی تھی

ڈاکٹر بشیر بدر

نئی اردو غزل میں اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں کلاسیکیت کا آہنگ اور عصریت کا رنگ اپنے پورے شباب کے ساتھ ہوتا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور وہیں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔ آج کل میرٹھ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ مشاعروں میں بلائے جاتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے "اکائی" اور "امیج" شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ہندستان میں جس جگہ بھی یہ پہنچتے ہیں ان ہی کا یہ شعر ان کا سواگت کرتا ہے ؎

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

ڈاکٹر بشیر بدر

○

ان آنکھوں سے دن رات برسات ہوگی
اگر زندگی صرفِ جذبات ہوگی

مسافر ہو تم بھی مسافر ہیں ہم بھی
کسی موڑ پر پھر ملاقات ہوگی

صداؤں کو الفاظ ملنے نہ پائیں
نہ بادل گھریں گے نہ برسات ہوگی

چراغوں کو آنکھوں میں محفوظ رکھنا
بڑی دور تک رات ہی رات ہوگی

ازل تا ابد تک سفر ہی سفر ہے
کہیں صبح ہوگی کہیں رات ہوگی

○

جہاں پیڑ پر چار دانے لگے
ہزاروں طرف سے نشانے لگے

سویرے کی پہلی کرن دیکھ کر
چراغوں کو ہم خود بجھانے لگے

ہوئی شام یادوں کے اک گاؤں سے
پرندے اداسی کے آنے لگے

مجھے اس بصارت سے محروم رکھ
جو آنکھوں کی شمعیں بجھانے لگے

پڑھائی لکھائی کا موسم کہاں
کتابوں میں خط آنے جانے لگے

○

تاروں بھری پلکوں کی برسائی ہوئی غزلیں
ہے کون پروئے جو بکھرائی ہوئی غزلیں

وہ لب ہیں کہ دو مصرعے اور دونوں برابر کے!
زلفیں ہیں کہ دلِ شاعر پہ چھائی ہوئی غزلیں

یہ پھول ہیں یا شعروں نے صورتیں پائی ہیں
شاخیں ہیں کہ شبنم میں نہلائی ہوئی غزلیں

خود اپنی ہی آہٹ پر چونکے ہوں ہرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

ان لفظوں کی چادر کو سرکاؤ تو دیکھو گے
احساس کے گھونگھٹ میں شرمائی ہوئی غزلیں

اُس جانِ تغزل نے جب بھی کہا، کچھ کہیئے!
میں بھول گیا اکثر یاد آئی ہوئی غزلیں

○

صبح کا جھرنا، ہمیشہ ہنسنے والی عورتیں
جھٹپٹے کی ندیاں، خاموش گہری عورتیں

سڑکوں، بازاروں، مکانوں، دفتروں میں رات دن
لال پیلی سبز نیلی، جلتی بجھتی عورتیں

شہر میں اک باغ ہے اور باغ میں تالاب ہے
تیرتی ہیں اس میں ساتوں رنگ والی عورتیں

سیکڑوں ایسی دکانیں ہیں جہاں مل جائیں گی
دھات کی، پتھر کی، شیشے کی، ربر کی عورتیں

ان کے اندر پک رہا ہے وقت کا آتش فشاں
کن پہاڑوں کو ڈھکے ہیں برف جیسی عورتیں

○

تمام آگ ہے، دل، راہ خار و خس کی نہیں
یہی گلی ہے جہاں سلطنت ہوس کی نہیں
اُتار دے مری آنکھوں سے آنسوؤں کے غلاف
چمک ضرور ہے اِن میں مگر ہوس کی نہیں
بس ایک شام کی لذت بہت غنیمت جان
عظیم پاک محبت ہر اک کے بس کی نہیں
تھا ایک شخص، ہر اک شخص اس پہ عاشق تھا
یہ بات کل کی ہے دو چار دس برس کی نہیں
نصاب دل کا کہاں رکھ دیا کتابوں میں
غزل کی آگ ہے یہ کاغذوں کے بس کی نہیں

○

تم مری زندگی ہو، یہ سچ ہے
زندگی کا مگر بھروسہ کیا
جو نہ آدابِ دشمنی جانے
دوستی کا اسے سلیقہ کیا
سب ہیں کردار اک کہانی کے
ورنہ شیطان کیا فرشتہ کیا

○

جب سحر چپ ہو، ہنسا لو ہم کو
جب اندھیرا ہو، جلا لو ہم کو
ہم حقیقت ہیں نظر آتے ہیں
داستانوں میں چھپا لو ہم کو
دن نہ پا جائے کہیں شب کا راز
صبح سے پہلے اُٹھا لو ہم کو
ہم زمانے کے ستائے ہیں بہت
اپنے سینے سے لگا لو ہم کو
وقت کے ہونٹ ہمیں چھو لیں گے
اَن کہے بول ہیں گا لو ہم کو

دن کے سارے کپڑے ڈھیلے ہو گئے
رات کی سب چولیاں کسنے لگیں
ڈوب جائیں گے سبھی دریا پہاڑ
چاندنی کی ندیاں چڑھنے لگیں

منیرؔ نیازی

○

اشکِ رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو
اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو

لائی ہے اب اُڑا کے گئے موسموں کی باس
برکھا کی رُت کا قہر ہے اور ہم ہیں دوستو

پھرتے ہیں مثلِ موجِ ہوا شہر شہر میں
آوارگی کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو

شامِ الم ڈھلی تو چلی درد کی ہوا !
راتوں کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو

آنکھوں میں اُڑ رہی ہے لُٹی محفلوں کی دُھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

○

بے چین بہت پھرنا، گھبرائے ہوئے رہنا
اک آگ سی جذبوں کی دہکائے ہوئے رہنا

چھلکائے ہوئے پھرنا خوشبو لبِ لعلیں کی
اک باغ سا ساتھ اپنے مہکائے ہوئے رہنا

اس حُسن کا شیوہ ہے جب عشق نظر آئے
پردے میں چلے جانا، شرمائے ہوئے رہنا

اک شام سی کر رکھنا کاجل کے کرشمے سے
اک چاند سا آنکھوں میں چمکائے ہوئے رہنا

عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو منیرؔ اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اُکتائے ہوئے رہنا

سیف زُلفی

○

کوفے کے قریب ہو گیا ہے
لاہور عجیب ہو گیا ہے

ہر دوست ہے میرے خوں کا پیاسا
ہر دوست رقیب ہو گیا ہے

ہر آنکھ کی ظلمتوں سے یاری
ہر ذہن حبیب ہو گیا ہے

کیا ہنستا بستا تھا شہر یارو
حاسد کا نصیب ہو گیا ہے

چپکا تھا مسیحِ وقت بن کر
سمٹا تو صلیب ہو گیا ہے

کاغذ پہ اُگل رہا ہے نفرت
کم ظرف ادیب ہو گیا ہے

○

کیوں جل بجھے، کہیں تو گرفتار بولتے
زنداں میں چپ رہے تو سرِ دار بولتے

گھر گھر یہاں تھا گوش بر آواز دیر سے
آتی صدا تو سب در و دیوار بولتے

تم بولتے اگر تو تمہاری ندا کے ساتھ
بستی کے سارے کوچہ و بازار بولتے

سورج نے کتنے جسم جلائے ہیں راہ میں
اتنا تو زیرِ سایۂ دیوار بولتے

زُلفی گلی گلی میں مچلتا نیا لہو
آتا رہِ سیلِ رنگ کہ گلزار بولتے

کالج سے اُس کو آج بھی چھٹی نہ مل سکی
کتنے حسین خواب تھے اتوار کے لئے

رکھنا ہے سب کے زخم پہ مرہم مجھے، مگر
میری نظر میں صرف مری ذات ہے ابھی

بمل کرشن اشک

روہتک

صابر بھائی! — آداب۔

تمہارا خط موصول ہوا۔ تم مجھ سے جی بھر کے گلے کر لو لیکن حالات جان لینے کے بعد۔ میں دمہ کے عارضہ سے بے حال ہوں اور اسی لئے خطوط کا جواب دینے سے اکثر قاصر۔ لیکن تم غزل نمبر شائع کر رہے ہو اور یقینی طور پر اشک صاحب کے بغیر تو نمبر نامکمل رہے گا ہی، اس کی دو وجوہات ہیں ایک یہ کہ حقیقت یوں ہے اور دوسری یہ کہ اشک کا ایک عزیز دوست غزل نمبر شائع کر رہا ہے۔ دیکھو بھائی میں غزلیں ہاتھ سے لکھ نہیں سکوں گا اسی لئے مجموعے میں سے کاغذ پھاڑ کر بھیج رہا ہوں۔ برا نہ ماننا۔ تصویر کے بغیر شائع کر دو۔ اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ ملو گے تو پہچان نہیں پاؤ گے ۔" تم مری تصویر لے کر کیا کرو گے۔"

یار وہ لوگ جو آئے یہاں سے چنڈی گڑھ چلا گیا۔ اب یہاں کیا رہ گیا ہے۔ یونہی نوکری کر رہے ہیں اور دکھی ہو رہے ہیں۔ آس پاس کوئی دوست نظر نہیں آتا۔ ایک بار ذاکر بھائی آئے تھے اور بس۔ ورنہ چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی ہے۔

تعارف بھی چاہیئے۔ سو یوں ہے:۔

نام۔ بمل کرشن، تخلص۔ اشک۔ ساکن۔ ہریانہ۔ پیشہ۔ معلمی۔ یوم پیدائش ۲۵ر اکتوبر ۱۹۲۷ء

لیکن یہ تعارف کے بے معنی لوازمات ہیں۔ میں کیا ہوں مجھے بھی معلوم نہیں۔ شائد آنے والی نسلیں فیصلہ کر سکیں کہ اشک کیا تھا۔ بہ قول میرے میں جدید اردو غزل کا بانی مبانی ہوں لیکن ادبی سیاست کی وجہ سے احباب نے مجھے پیچھے کی لائن میں بٹھا دیا ہے۔ اور وہاں سے میں دیگر دوستوں کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے ان کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ اور آجکل ان میں سے ہر کوئی پیچھے مڑ کر دیکھنا غیر ضروری سمجھتا ہے۔

بمل کرشن اشک

۱۰ر اپریل ۱۹۷۸ء

بمل کرشن اشک

○

ڈوب گئے ہو دیکھ کے جن میں ٹھہرا، گہرا، نیلا پانی
آنکھ جھپکتے مر جائے گا اشک انھیں آنکھوں کا پانی

تو، میں، پھول، ستارہ، موتی سب اُس کے دریا کی موجیں
جیسا جیسا برتن، ویسا ویسا بھیس بدلتا پانی

بارہ ماس ہری ٹہنی پر پیلے پھول کھلا کرتے ہیں
دُکھ کے پودے کو لگتا ہے جانے کس دریا کا پانی

بیتی عمر سرہانہ سینچے، آنکھیں روتی ہیں کیتوں کو
دُکھ کا سورج پی کر ڈوبا دونوں دریاؤں کا پانی

چوکھٹ چوکھٹ، آنگن آنگن، کھتی چھاچھ، کسیلا مکھن
گاؤں کے ہر گھر میں در آیا بستی کا مٹ میلا پانی

تن کا لوبھی کیا جانے، تن من کا دُکھ دونوں تیرتھ ہیں
پاک بدن کاشی کی مٹی، آنسو گنگا ماں کا پانی

○

کل وہ کلی سی گھر بیٹھے تھی دور گئے کی آس لئے
آج بدن در در بھٹکے ہے مولسری کی باس لئے

سال چڑھے مل جُل کر بیٹھے لمبے بھورے گلاس لئے
وقت نہ جانے کب آنکلے میٹھی دودھی گھاس لئے

آن سوئے بستر پر گم سم چادر میلی کچیلی سی
پار پھوار میں گبرد گھومے چہرہ اُداس اُداس لئے

دھندلی پگڈنڈی کے رہرو، سُونے گھر کے کردل میں
کونے کونے گھوم رہی ہیں یادیں خوف و ہراس لئے

ٹیسو ایسی آنکھیں اشک انیندی گھومیں ہیں
پلک پلک پہ موتی ٹانکے، نظر نظر میں پیاس لئے

شہریار

○

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

ہر ایک نقشِ تمنا کا ہو گیا دھندلا
ہر ایک زخم مرے دل کا بھر گیا یارو

بھٹک رہی تھی جو کشتی، وہ غرقِ آب ہوئی!
چڑھا ہوا تھا جو دریا، اُتر گیا یارو

وہ کون تھا، وہ کہاں کا تھا، کیا ہوا تھا اُسے
سنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو

میں جس کو لکھنے کے ارمان میں جیا اب تک
ورق ورق وہ فسانہ بکھر گیا یارو

○

فضائے میکدہ بے رنگ لگ رہی ہے مجھے
رگِ گلاب رگِ سنگ لگ رہی ہے مجھے

یہ چند دن میں قیامت گزر گئی کیسی
کہ آج صلح تری، جنگ لگ رہی ہے مجھے

مرے مکان سے دو گام پر ہے تیری گلی
یہ آج سیکڑوں فرسنگ لگ رہی ہے مجھے

نوا و نغمہ بھی ہیں سوز و ساز سے خالی
فغاں بھی خارج از آہنگ لگ رہی ہے مجھے

ضرور پھر کوئی افتاد پڑنے والی ہے
کہ یہ زمین بہت تنگ لگ رہی ہے مجھے

شہزاد احمد

○

دل سے یہ کہہ رہا ہوں ذرا اور دیکھ لے
سو بار اس کو دیکھ چکا، اور دیکھ لے

اس کو خبر ہوئی تو بدل جائے گا وہ رنگ
احساس تک نہ اس کو دلا اور دیکھ لے

ممکن ہے ایک لمحے کی مہمان ہو بہار
پھولوں کی تازگی پہ نہ جا اور دیکھ لے

موسم کا اعتبار نہیں بادباں نہ کھول
کچھ دیر ساحلوں کی ہوا اور دیکھ لے

دل بھی تو اک دیا ہے، روشن، ہرا بھرا
آنکھوں کا یہ چراغ بجھا اور دیکھ لے

شہزاد، زندگی کے جھمیلے ہزار ہیں
دُنیا نہیں پسند تو آ اور دیکھ لے

○

نہ سہی کچھ مگر اتنا تو کیا کرتے تھے
وہ مجھے دیکھ کے پہچان لیا کرتے تھے

آخرِ کار ہوئے تیری رضا کے پابند
ہم کہ ہر بات پہ اصرار کیا کرتے تھے

دوستو! اب مجھے گردن زدنی کہتے ہو
تم وہی ہو کہ مرے زخم سیا کرتے تھے

آنکھ سے ہٹتے نہیں گزری ہوئی دنیا کے رنگ
ہم نے اُن لمحوں کو ہے زنجیر پہنائی ہوئی

پتھر نہ پھینک دیکھ ذرا احتیاط کر
ہے سطحِ آب پر کوئی چہرہ بنا ہوا

پاس رہ کر بھی نہ پہچان سکا تو مجھ کو
دور سے دیکھ کے اب ہاتھ ہلاتا کیا ہے

عزیز قیسی

بمبئی

برادرِ عزیز۔

السلام۔

حالاتِ زندگی ایسے نہیں کہ ان پر فخر کیا جائے نہ ایسے ہیں کہ ان پر شرم آئے۔

میں عزیز محمد خاں ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوا، اور پندرہ سولہ برس کی عمر میں عزیز قیسی ہو گیا۔ سرکاری ملازمت بھی کی۔

اخباروں کے دفتروں میں بھی سر پھوڑا۔ اب فلموں میں جانِ عزیز گنوا رہا ہوں۔

نثر اور نظم کی ہر صنف کو زیرِ دام لانے کی کوشش کر چکا ہوں۔

زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ (۴۷) برس سے زندہ ہوں۔

اللہ بس باقی ہوس۔ والسلام

تمہارا

عزیز قیسی

۱۸ اپریل ۷۸ء

عزیز قیسی

○

ہر شام جلتے جسموں کا گاڑھا دھواں ہے شہر
مرگھٹ کہاں ہے کوئی بتاؤ کہاں ہے شہر

فٹ پاتھ پر جو لاش پڑی ہے اُسی کی ہے
جس گاؤں کو یقین تھا کہ روزی رساں ہے شہر

مر جایئے تو نام و نسب پوچھتا نہیں
مُردوں کے سلسلے میں بہت مہرباں ہے شہر

رہ رہ کے چیخ اٹھتے ہیں سناٹے رات کو
جنگل چھپے ہوئے ہیں وہیں پر جہاں ہے شہر

بھونچال آتے رہتے ہیں اور ٹوٹتا نہیں
ہم جیسے مفلسوں کی طرح سخت جاں ہے شہر

لٹکا ہوا ٹرین کے ڈبوں میں صبح و شام
لگتا ہے اپنی موت کے منہ میں رواں ہے شہر

○

اور کس کو مرے جینے سے علاقہ ہوگا
کوئی ہوگا مرا قاتل تو مسیحا ہوگا

ریت میں پیاس کے دوزخ کے سوا کچھ بھی نہیں
میرے سوکھے ہوئے ہونٹوں میں ہی دریا ہوگا

دیکھ کر تجھ کو جو نم ہو گئیں میری آنکھیں
تجھ پہ جو وقت پڑا مجھ پہ بھی گذرا ہوگا

بس ہی دُھن میں پس و پیش نہ دیکھا ہم نے
اس کے آگے بھی ذرا دیکھ تو لیں کیا ہوگا

میں تو بدنام بھی ہوں شہر میں برباد بھی ہوں
آپ کو بات نبھانے کا سلیقہ ہوگا

○

دروازہ قد سے چھوٹا ہے سر کو جھکائیے
یا شہرِ بے اماں کی طرف لوٹ جائیے

اُٹھتے ہیں اس سرائے سے ہم اس سرائے میں
حسرت ہی رہ گئی کہ کوئی گھر بسائیے

شاید کسی گلی کا اندھیرا جواب دے
رستے نظر سے گم ہیں صدا تو لگائیے

آہوں سے دشتِ درد کا سنّاٹا بڑھ گیا
اب چیخ بن کے تا بہ اُفق گونج جائیے

کچھ لوگ چل تو جائیں گے کچھ اور ہو نہ ہو
محفل بجھی بجھی سی ہے، قیسی کو لائیے

○

یہ سمندر پہ برستا پانی
ہائے پیاسوں کو ترستا پانی

سامنے سدِ سکندری ہی سہی
خود بنا لیتا ہے رستا پانی

دیکھ ان روتی ہوئی آنکھوں سے
شہر کے شہر کو ڈستا پانی

بے نمو ہے مرے اشکوں کی طرح
دشتِ ویراں پہ برستا پانی

مصلحت ہو گی کوئی قاتل کی
ہو گیا خون سے سستا پانی

فن اور شخصیت

عزیز قیسی

○

اُلجھاؤ کا مزہ بھی تری بات ہی میں تھا
ترا جواب ترے سوالات ہی میں تھا

سایہ کسی مکیں کا بھی جس پہ نہ پڑ سکا
وہ گھر بھی شہرِ دل کے مضافات ہی میں تھا

الزام کیا ہے یہ بھی نہ جانا تمام عمر
مُلزم تمام عمر حوالات ہی میں تھا

یا روں کو انحراف کا جس پر رہا غرور
وہ راستہ بھی دشتِ روایات ہی میں تھا

اب تو فقط بدن کی مروّت ہے درمیاں
تھا ربطِ جان و دل تو شروعات ہی میں تھا

جو مجھ کو قتل کر کے مناتا رہا ہے جشن
وہ بدنہاد شخص مری ذات ہی میں تھا

○

ہر لمحہ بے شرم سوالی لگتا ہے
جینا اب تو ماں کی گالی لگتا ہے

جب سے پیٹ پہ پاؤں رکھا ہے دُنیا نے
ہم کو دل کا درد خیالی لگتا ہے

دفن ہے دل کے ساتھ نجانے کیا کیا کچھ
سینہ لیکن خالی خالی لگتا ہے

عکس در عکس ہے آئینہ در آئینہ
پھر یہاں ہر شخص مثالی لگتا ہے

آخر آخر حاصلِ جاں و حاصلِ دل
بس پامالی ہی پامالی لگتا ہے

اقبال ساجد

میں بھوک پہنوں، میں بھوک اوڑھوں، میں بھوک دیکھوں، میں پیاس لکھوں
برہنہ جسموں کے واسطے میں خیال کاتوں، کپاس لکھوں

سسک سسک کر جو مر رہے ہیں میں ان میں شامل ہوں اور پھر بھی
کسی کے دل میں امید بوؤں، کسی کی آنکھوں میں آس لکھوں

تھمے جو بارش تو لوگ دیکھیں چھتوں پہ چڑھ کے دھنک کا منظر
میں اپنے دکھ کو اجاڑ پاؤں، تمام عالم اداس لکھوں

مرا سفر ہے سمندر ایسا، جدھر بھی جاؤں بپھر کے جاؤں
کہیں اچھالوں میں موجِ وحشت، کہیں میں خوف و ہراس لکھوں

پڑھتے پڑھتے تھک گئے سب لوگ تحریریں مری
لکھتے لکھتے شہر کی دیوار کالی ہو گئی

اب تو دروازے سے اپنے نام کی تختی اتار
لفظ ننگے ہو گئے، شہرت بھی گالی ہو گئی

غار سے سنگ ہٹایا تو وہ خالی نکلا
کسی قیدی کا نہ کردار مثالی نکلا

چڑھتے سورج نے ہر اک ہاتھ میں کشکول دیا
صبح ہوتے ہی ہر اک گھر سے سوالی نکلا

سب کی شکلوں میں تری شکل نظر آئی مجھے
قرعۂ فال مرے نام پہ گالی نکلا

راس آئے مجھے مرجھائے ہوئے زرد گلاب
غم کا پرتو مرے چہرے کی بحالی نکلا

رات جب گزری تو پھر صبح حنا رنگ ہوئی
آسماں جاگی ہوئی آنکھ کی لالی نکلا

تخت خالی ہی رہا دل کا ہمیشہ ساجد
اس ریاست کا تو کوئی بھی نہ والی نکلا

فخر زماں

○

لمحوں کا بھنور چیر کے انسان بنا ہوں
احساس ہوں میں وقت کے سینے میں گڑا ہوں

فٹ پاتھ پہ عرصے سے پڑا سوچ رہا ہوں
پتا تو میں سرسبز تھا کیوں ٹوٹ گرا ہوں

سر پھوڑ کے دیوار سے مر جائے گی آخر
گنبد میں بھٹکتی ہوئی اک ایسی صدا ہوں

اُن چند اُصولوں کو میں چھوڑوں بھی کیسے
جن کے لئے اک عمر میں دنیا سے لڑا ہوں

ہر راہ پہ منزل کا گماں ہونے لگا ہے
میں زیست کے چوراہے پہ حیران کھڑا ہوں

شاید کبھی ہیرے کا گماں مجھ پہ بھی ہو فخر
پتھر ہوں اسی سوچ میں مدت سے پڑا ہوں

متفرق اشعار

اس شہر میں بیگانے نظر آتے ہیں سب لوگ
آواز کسے دوں مجھے رہتی ہے یہی سوچ

یا خُدا لوگ بنائے تھے اگر پتھر کے
میرے احساس کو شیشہ نہ بنایا ہوتا

اس شہر میں انصاف کی تعریف الگ ہے
جو جُرم کرائے وہی دیتا ہے سزا بھی

صلیب حالات پر چڑھا ہوں
تم اپنے حصے کی کیل ٹھونکو

کس کس کے ہاتھ اپنا لہو بیچتا رہوں
اُجرت بھی میرے واسطے خیرات ہو گئی

حسن کمال

میں ۱۹۳۹ء میں پیدا ہونے کا گنہگار ہے۔ ہنوز زندہ ہوں۔ اگر سرٹیفکیٹ بانٹنے والا نظام کوئی معنی رکھتا ہے (جو میرے خیال میں نہیں رکھتا) تو لکھنؤ یونیورسٹی کا گریجویٹ ہوں۔ نظریاتی اعتبار سے کسی بھی سیاسی جماعت سے وابستگی کے بغیر مارکسی رہا ہوں اور خیال ہے کہ آئندہ بھی رہوں گا۔ مارکسزم نے مجھے شاعری، زندگی اور تاریخ کا جو شعور بخشا ہے اسے ایک نعمت تصور کرتا ہوں۔ اس بات کو ضروری نہیں سمجھتا کہ اپنے اشعار میں بھی مارکسی ہونے کا بار بار اعلان کروں۔ ایمان وہ نہیں ہوتا جس کا ڈنکے پیٹ کے ساتھ مظاہرہ اور اعلان کیا جائے۔

۱۹۶۵ء میں یوپی ٹرانسپورٹ کی خاک چھاننے کے بعد بحیثیت نائب مدیر "اردو بلٹز" بمبئی آیا، ۱۹۷۳ء میں ایڈیٹر بن گیا۔ فلموں سے ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے تعلق رہا ہے۔ دو چار گانے لکھے، ایک دو کہانیاں۔ باقی سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں۔

حسن کمال

○

نقش بھی اُس کے یاد نہیں ہیں، نام بھی کچھ کچھ بھول چلا ہے
جانے ہر چہرے پر ہم کو کس کا چہرہ یاد آتا ہے

سوگ میں ڈوبیں چاروں دشائیں، توڑ چکیں دم ساری شعاعیں
پاگل پنچھی لوٹ بسیرے، سورج کب کا ڈوب چکا ہے

دن کی تھکن، راتوں کا اندھیرا، دل کی جلن، سناٹوں کا گھیرا
شام ڈھلے، دل مئے پینے کے سارے بہانے ڈھونڈ رہا ہے

جس کے تلے دو سائے ملے تھے، چُپ ہونٹوں پر پھول کھِلے تھے
تال کے تٹ کا وہ پیپل بھی سُنتے ہیں اب سوکھ چکا ہے

تم نہیں ملتے، غم نہیں ملتے، غم نہیں ملتے، ہم نہیں ملتے
تم نے بچھڑ کر سچ پوچھو تو، ہم پہ بڑا احسان کیا ہے

شام کی باتیں، جام کی باتیں، اب ہیں یہی کچھ کام کی باتیں
چھوڑو حسنؔ انجام کی باتیں، نشہ ابھی سے ٹوٹ رہا ہے

حسن کمال

(سُمترا کے نام)

○

یاد آتی ہیں رہ رہ کے سنولائی ہوئی راتیں
آنکھوں کی طرح تیری کجلائی ہوئی راتیں

بل کھا کے سمٹ جانا، چھوتے ہی بکھر جانا
گھبرائے ہوئے لمحے شرمائی ہوئی راتیں

نیندوں کو جلا دینا، رستوں کو جگا دینا
وہ مے کے شراروں سے دہکائی ہوئی راتیں

پیروں میں پہن کر وہ شبنم کی سبک پائل
جھیلوں پہ تھرکتی ہیں السائی ہوئی راتیں

بن بن کے الجھتی ہیں، رہ رہ کے سلجھتی ہیں!
زلفوں کی طرح کالی بل کھائی ہوئی راتیں

مہتاب نے چپکے سے لب چوم لئے جیسے
چھپتی ہیں اندھیروں میں گھبرائی ہوئی راتیں

بھیگی ہوئی راتیں ہم کس گاؤں میں چھوڑ آئے
اس شہر میں ملتی ہیں پتھرائی ہوئی راتیں

چپکے سے سمٹ آئیں باہوں میں حسن میری
وہ تیرے بدن جیسی گدرائی ہوئی راتیں

فن اور شخصیت

حسن کمال

کرنوں کا جال پھینکا اٹھا لے گئی مجھے
اک دھوپ روپ کی تھی اڑا لے گئی مجھے

پتھر بنا تو زد پہ رہا ٹھوکروں کی میں
جب خاک ہو گیا تو ہوا لے گئی مجھے

میں شور و غل سے شہر کے گھبرا چلا تھا کچھ
خاموشیوں کی ایک صدا لے گئی مجھے

یوں بھی پڑا ہوا تھا میں بکھری کتاب سا
پھر کیا ہوا کا دوش اڑا لے گئی مجھے

ساحل پہ دور تک میں اسے ڈھونڈتا رہا
وہ موج بن کے آئی بہا لے گئی مجھے

کل تک میں اپنے آپ میں موجود تھا مگر
اس کی نگاہ مجھ سے چرا لے گئی مجھے

آوارگی لکھی تھی مقدر میں جب حسنؔ
میں بھی گیا جدھر یہ صبا لے گئی مجھے

فن اور شخصیت

حسن کمال

○

شاید جو زہر شہر میں تھا کام کر گیا
خود سے ملے ہوئے بھی زمانہ گذر گیا

پاگل کوئی اک اک سے یہی پوچھتا تھا کل
ہم سب کا ایک گھر تھا بتاؤ کدھر گیا

سورج کو جنم دے کے جھلسنے کے واسطے
ٹھنڈی نمی، ریت چھوڑ سمندر اتر گیا

سوچا تھا اپنے دل میں سنواروں گا میں تمہیں
تم آئے تم کو دیکھ کے میں خود بکھر گیا !

جب تک میں زندگی کو نہ سمجھا تھا جی لیا
جب آ گئی سمجھ میں تو بے موت مر گیا

ہر شام کتنے درد سے دیکھا ہے یہ حسن !
سورج کا خون پی کے سمندر نکھر گیا

○

سب کی بگڑی کو بنانے نکلے
یار ہم تم بھی دِوانے نکلے

دھول ہے ریت ہے صحرا ہے یہاں
ہم کہاں پیاس بجھانے نکلے

ہر طرف شورِ قیامت ہے بپا
اور ہم گیت سنانے نکلے

چاند کو رات میں موت آئی تھی
لاش ہم دن کو اٹھانے نکلے

اتنی رونق ہے کہ جی ڈوبتا ہے
شہر میں خاک اڑانے نکلے

اب جو آتے ہو تو اِک پل تو رکو
چاند پھر کب یہ نہ جانے نکلے

ان اندھیروں میں کرن جب ڈھونڈی
سب کے سب ہنسنے کے بہانے نکلے

عمر برباد یوں ہی کر دی حسن
خواب بھی کتنے سہانے نکلے !

۲

شمیم انور

کرفیو پیچھے پیچھے ہے سناٹے کی سرکار لیے
آگے سڑکیں بھاگ رہی ہیں جھونکا اخبار لیے

ہار نہ کہنا یہ بھی ضدی شاخوں کی اک جیت ہوئی
تیز ہوا اب کے نکلی ہے ہاتھوں میں تلوار لیے

جشنِ شب کے بعد سحر کے سورج کی جب آنکھ کھلی
دریاں ساحل پہرے پر تھا کوڑھ کے سب آثار لیے

کتنوں سے پڑھوانے پر بھی ممتا کو تشویش رہی
گھوم رہی ہے اب تک فوجی بیٹے کا وہ تار لیے

پھر کاغذ پر بنے گا اپنے گاؤں کا نقشہ سندر سا
پھر اک بابو گلیوں گلیوں گھومے ہے پرکار لیے

سوکھے ہونٹوں کے چلو پھیلائیں تو کس کے آگے
ساگر ہی جب جھیل رہا ہو سوکھے کا آزار لیے

اپنے الزام کی تردید تو کرنے دیتے
مجھ کو سورج کی ہتھیلی سے اترنے دیتے

حادثہ پھر بھی ہوتا یہ ضروری تو نہ تھا
اس مسافر کو ذرا دیر ٹھہرنے دیتے

آتے جاتے ہوئے لمحات کی آہٹ ملتی
ٹوٹ کر شاخوں سے پتوں کو بکھرنے دیتے

خود جن کی ہتھیلی میں ہوں سوراخ ہزاروں
وہ دینا بھی چاہیں گے تو کیا دیں گے کسی کو

نیند کی کائی سے بوجھل ہے ہر اک آنکھ مگر
سنگ کے خوف سے شیشے کا نگر جاگے ہے

کب احترام کی خاطر جھکی مری گردن
کہ اک لٹکتی سی تلوار میرے سر پہ ہے

ندا فاضلی

۱۹۳۸ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ گوالیار یونیورسٹی (اجین) سے بی اے کیا۔ شاعری کا شوق ورثہ میں ملا یعنی ان کے والد بھی شاعر تھے۔ ندا جدید شاعری کی ایک اہم آواز ہیں۔ آج بھی وہ گاؤں کے چوپال اور وہاں کے سرسبز و شاداب کھیتوں سے جڑے نظر آتے ہیں۔ لب و لہجے کی تازگی اور ندرت کی وجہ سے نئی آوازوں کی بھیڑ بھاڑ میں اپنی ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔

ندا فاضلی کا سارا خاندان پاکستان منتقل ہو چکا ہے۔ ہندوستان میں یہ اکیلے ہیں۔ تنہائی کے کرب نے انھیں رشتوں، ناطوں اور دوست احباب سے الگ رہنے کی تلقین کی ہے۔ شاید اسی وجہ سے یہ اپنے آپ کے بہترین دشمن ہیں۔

"لفظوں کا پل" ان کا شعری مجموعہ اور "ملاقاتیں" نثری مجموعہ چھپ چکے ہیں ایک اور شعری مجموعہ "مور ناچ" چھپنے جا رہا ہے۔ اس مجموعے کے لئے مہاراشٹرا اردو اکیڈمی نے تین ہزار روپے کی مدد دی ہے۔ "مور ناچ" کی اشاعت کے بعد ندا ساہتیہ اکیڈمی کے انعام کی توقع رکھتے ہیں۔

اگر آپ ندا فاضلی کی شخصیت کو سمجھنا چاہتے ہوں تو مندرجہ ذیل شعر پڑھ لیجئے ؎

میری عزت کو شرافت کا ابھی نام نہ دے
وقت بدلا تو تری رائے بدل جائے گی!

ندا فاضلی

○

نیل گگن میں تیر رہا ہے اُجلا اُجلا پورا چاند
کن آنکھوں سے دیکھا جائے چنچل چہرے جیسا چاند

مُنّی کی بھولی باتوں سی چھٹکیں تاروں کی کلیاں
پپّو کی خاموش شرارت سا چھُپ چھُپ کر اُبھرا چاند

مجھ سے پوچھو کیسے کاٹی میں نے پربت جیسی رات
تم نے تو گودی میں بھر کے گھنٹوں چوما ہوگا چاند

پردیسی سونی آنکھوں میں شعلے سے لہرائے ہیں
بھابی کی چھیڑوں سے بادل، آپا کی چٹکی سا چاند

تم بھی لکھنا تم نے اُس شب کتنی بار پیا پانی
تم نے بھی تو چھجے اوپر دیکھا ہوگا پورا چاند

○

کبھی بادل، کبھی کشتی، کبھی گرداب لگے
وہ بدن جب بھی سجے کوئی نیا خواب لگے

ایک چُپ چاپ سی لڑکی نہ کہانی نہ غزل
یاد جو آئے کبھی ریشم و کمخواب لگے

ابھی بے سایہ ہے دیوار کہیں لوچ نہ خم
کوئی کھڑکی کہیں نکلے کہیں محراب لگے

گھر کے آنگن میں بھٹکتی ہوئی دن بھر کی تھکن
رات ڈھلتے ہی پکے کھیت سی شاداب لگے

بات کم کیجے ذہانت کو چھپاتے رہیے
اجنبی شہر ہے یہ، دوست بناتے رہیے

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

یہ تو چہرہ کا فقط عکس ہے تصویر نہیں
اس پہ کچھ رنگ ابھی اور چڑھاتے رہیے

غم ہے آوارہ اکیلے میں بھٹک جاتا ہے
جس جگہ رہیے وہاں ملتے ملاتے رہیے

جانے کب چاند بکھر جائے گھنے جنگل میں
اپنے گھر کے در و دیوار سجاتے رہیے

تنہا ہوئے خراب ہوئے آئینہ ہوئے
چاہا تھا آدمی بنیں لیکن خدا ہوئے

جب تک جیے بکھرتے رہے ٹوٹتے رہے
ہم سانس سانس قرض کی صورت ادا ہوئے

ہم بھی کسی کمان سے نکلے تھے تیر سے
یہ اور بات ہے کہ نشانے خطا ہوئے

پرشور راستوں سے گزرنا محال تھا
ہٹ کر چلے تو آپ ہی اپنی سزا ہوئے

ندا فاضلی

غزل نمبر ۹

○

دن سیتارہ تن بنجارہ قدم قدم دشواری ہے
جیون جینا سہل نہ جانو بہت بڑی فنکاری ہے

اوروں جیسے ہو کر بھی ہم باعزت ہیں بستی میں
کچھ لوگوں کا سیدھا پن ہے کچھ اپنی عیاری ہے

جب جب موسم جھوما ہم نے کپڑے پھاڑے شور کیا
ہر موسم شائستہ رہنا کوری دنیا داری ہے

عیب نہیں ہے اس میں کوئی لال پری نہ پھول گلی
یہ مت پوچھو وہ اچھا ہے یا اچھی ناداری ہے

جو چہرہ دیکھا وہ توڑا نگر نگر ویران کیے
پہلے اوروں سے ناخوش تھے اب خود سے بیزاری ہے

○

جہاں نہ تیری مہک ہو ادھر نہ جاؤں میں
میری سرشت سفر ہے گذر نہ جاؤں میں

مرے بدن میں کھلے جنگلوں کی مٹی ہے
مجھے سنبھال کے رکھنا بکھر نہ جاؤں میں

مرے مزاج میں بے معنی الجھنیں ہیں بہت
مجھے ادھر سے بلانا جدھر نہ جاؤں میں

کہیں نہ لے اڑے انجان وادیوں کا سکوت
مجھے پکارتے رہنا ٹھہر نہ جاؤں میں

نہ جانے کون سے لمحہ کی بد دعا ہے یہ
قریب گھر کے ہوں اور گھر نہ جاؤں میں

مخمور سعیدی

دہلی

برادرم صابر دت صاحب!

آداب - آپ کا خط ملا، تعمیلِ ارشاد کر رہا ہوں — میرا کیا تعارف، یہ چند سطریں دیکھ لو، انہی کو اپنے انداز میں ڈھال لیں۔

پیدائش: دسمبر ۱۹۳۴ء

مقام: ٹونک (راجستھان)

۱۹۵۲ء سے دلی میں ہوں اور ۱۹۵۵ء سے ماہنامہ تحریک کا شریک مدیر ہوں۔ شاعری کے چار مجموعے چھپے ہیں (۱) گفتنی (۲) سیہ بر سفید (۳) آواز کا جسم (۴) سب رنگ۔

غالب کی فارسی تصنیف "دستنبو" کا اردو ترجمہ کیا ہے جو تحریک کے غالب نمبر میں چھپا تھا۔ پھر کراچی سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔

کملیشور نمبر خوب ہے۔ اس پر تبصرہ میں ضرور لکھوں گا۔

تمہارا

مخمور سعیدی

۱۱ر مارچ ۱۹۷۸ء

مخمور سعیدی

○

کل کے بھولے ہوئے غم تازہ نصابوں میں کہاں
جانے ہم دفن ہوں بوسیدہ کتابوں میں کہاں

یادِ ماضی کا گذر آج کے خوابوں میں کہاں
زرد موسم کی مہک سرخ گلابوں میں کہاں

وقت نے ڈال دیں چہروں پہ نقابیں کتنی
خود کو ہم آئیں نظر اتنے حجابوں میں کہاں

زندگی! تیرے لیئے کتنے ہی در وا ہوں گے
تو چلی آئی ہے ہم خانہ خرابوں میں کہاں

کیف بڑھتا ہے کچھ آمیزشِ خونِ دل سے
نشۂ تلخیٔ غم سادہ شرابوں میں کہاں

ہم کہ آیاتِ غمِ دل کے امیں ہیں مخمور
جو سبق ہم نے پڑھا ہے وہ کتابوں میں کہاں

○

پار کرنا ہے ندی کو تو اُتر پانی میں
بنتی جائے گی خود اک راہگذر پانی میں

بادباں تیرا بنے تیز ہوا کی چادر
کشتیٔ موجِ رواں پر ہو سفر پانی میں

ذوقِ تعمیر تھا ہم خانہ خرابوں کا عجب
چاہتے تھے کہ بنے ریت کا گھر پانی میں

تو شناور ہی سہی وقت کے طوفانوں کا
تندیٔ موجِ بلا خیز سے ڈر پانی میں

کھیل میرے لیئے موجوں کا تعاقب مخمور
میں اُتر جاؤں گا بے خوف خطر پانی میں

مظہر امام

سری نگر

بھائی صابر دت!

آداب و خلوص،

میری پیدائش سنہ ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔ وطن بہار ہے۔ اُردو اور فارسی میں ایم اے کیا اور دونوں زبانوں میں یونیورسٹی میں اوّل آیا۔ ادبی زندگی کا آغاز تیرہ سال کی عمر میں افسانہ نگاری سے ہوا۔ کچھ دنوں بعد شعر بھی کہنے لگا۔ شروع سے طبیعت انحراف اور جدت پسندی کی طرف مائل تھی۔ کئی سال تک نظم نگاری کی جانب غالب رجحان رہا۔ پندرہ سال کی عمر میں آزاد نظم لکھی۔ اس وقت تک بہار کے کسی شاعر نے آزاد شاعری کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ سولہ سال کی عمر میں آزاد غزل کا تجربہ کیا، جو اُردو شاعری میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہے۔

ابتداء میں میرا تعلق صحافت سے تھا۔ کئی اخبارات کے علاوہ ادبی جرائد کی ادارت یا ان کی مجلس مشاورت سے وابستہ رہا ہوں۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں آل انڈیا ریڈیو کے شعبۂ پروگرام سے وابستہ ہوا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں برابر حصہ لیتا رہا ہوں۔ —— ریڈیو کے لئے میرے لکھے ہوئے ڈراموں اور فیچر کی تعداد پچاس تک پہنچی ہے۔ آج کل ٹیلی ویژن سنٹر سری نگر میں اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر کے عہدے پر کام کر رہا ہوں۔

میرا پہلا مجموعہ کلام "زخم تمنا" سنہ ۱۹۶۲ء میں چھپا تھا۔ دوسرا مجموعہ "رشتہ گونگے سفر کا" سنہ ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔

آپ کا اپنا

مظہر امام

مظہر امام

○

اپنی ہی یادوں کی بوسیدہ ردا لے جائے گا
میرے گھر تک بھی وہ گر آیا تو کیا لے جائے گا

مانگنے والے! ذرا اپنی لکیریں بھی تو دیکھ
ساری تاثیرِ دعا، دستِ دعا لے جائے گا

میری آنکھوں میں گذرتے موسموں کا عکس ہے
سیلِ صبح آیا تو اس کو بھی بہا لے جائے گا

اس طرح گرنے نہ دو یادوں کی شبنم دیر تک
یہ خنک سایہ بھی کوئی دل جلا لے جائے گا

اور کیا رکھا ہے میرے پاس، لے جائے کو اب
میرا قاتل آئے گا، میری دعا لے جائے گا

کوئی لشکر آئے گا طوفان کی صورت، امام
سر سے وہ خوابوں کا خیمہ بھی اڑا لے جائے گا

○

یہ کیسے درد کا سقراط بن کے جینا تھا
بجائے زہر مجھے گالیوں کو پینا تھا

وہاں تھی تندیٔ صہبا، یہاں شکستِ وجود
یہ سنگ صبح ہے، وہ شب کا آبگینہ تھا

چھپی تھی موج کی باہوں میں روحِ تشنہ لبی
چمکتی ریت میں ڈوبا ہوا سفینہ تھا

اکھاڑ لے گئے سایوں سے کھیلنے والے
ہزاروں سال کا گاڑا ہوا دفینہ تھا

لبِ سکوت سے بوسہ چرا لیا تھا جہاں
نگارخانۂ آواز ہی کا زینہ تھا

حامدی کاشمیری

سری نگر

پیارے بھائی صابر دت!

آداب!

آپ نے مجھے بہت خلوص اور شفقت سے یاد کیا ہے بے حد شکریہ! - غزل نمبر نکالنے کا فیصلہ بے حد اچھا ہے امید ہے آپ گروہ بندیوں سے بالاتر ہو کر ایسے غزل نگاروں کو شامل کریں گے جو واقعتاً تخلیقی ذہن رکھتے ہیں۔ امید ہے آپ کا یہ کارنامہ ایک اہم اور دیدہ زیب دستاویز بن کر سامنے آئے گا حسب الحکم چند تازہ غزلیں، فوٹو اور مختصر تعارف بھی منسلک ہے۔

۱۹۳۲ء کو بہوری کدل (سری نگر) کے مقام پر پیدا ہوا ہوں، والد مرحوم کی صوفیانہ زندگی اور شعر و نغمہ سے اُن کی وابستگی نے مجھے شعر و ادب کی طرف مائل ہونے کی تحریک دی، نویں جماعت میں اردو میں نظمیں لکھیں، ۱۹۴۹ء میں کالج میں داخلہ لیا، تو میں نے شعر کہنے کے ساتھ ساتھ افسانے بھی لکھنا شروع کئے۔ ۱۹۵۰ء سے میرے افسانے اور منظومات ملک کے مقتدر رسالوں میں جگہ پانے لگے، اس وقت تک میرے افسانوں کے تین مجموعے "وادی میں پھول"۔ "سراب" اور "برف میں آگ" اور تین ناول "بہاروں میں شعلے"۔ "پگھلتے خواب"۔ اور "بلندیوں کے خواب"۔ شائع ہو چکے ہیں۔ گزشتہ دس پندرہ برسوں سے میں افسانہ نگاری سے کنارہ کش ہو کر شعر گوئی اور تنقید نگاری کی طرف متوجہ ہوں، تنقید میں ذیل کی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ (۱) جدید اردو نظم اور یورپی اثرات (۲) غالب کے تخلیقی سرچشمے (۳) نئی حسیت اور عصری اردو شاعری اور نئی تنقیدی کتاب اقبال اور غالب، "تخلیقی عمل کا مطالعہ" پریس میں ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے۔ "عروس تمنا" کے بعد میرا دوسرا مجموعہ کلام "نایافت" ۱۹۷۶ء میں شائع ہو چکا ہے، میں شعر میں نئی حسیت کے اظہار کا شدت سے قائل ہوں، لیکن میرے نزدیک یہ اظہار راست بیانی کے مترادف نہیں۔ چونکہ نئی حسیت کا اظہار شخصی سطح پر ہوتا ہے، اس لئے یہ عمل تقلیب سے گذرتا ہے اور شعر میں علامتی پیکر تراشی پر منتج ہوتا ہے۔

۱۹۵۴ء سے میں سرکاری ملازمت کر رہا ہوں۔ پہلے مقامی کالج میں انگریزی کا لیکچرر مقرر ہوا، ایک سال تک ریاستی کلچرل اکاڈمی میں اسسٹنٹ سکریٹری رہا۔ ۱۹۶۱ء سے شعبۂ اردو (کشمیر یونیورسٹی) سے وابستہ ہوں۔ ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی، اس وقت ریڈر کے عہدے پر کام کر رہا ہوں۔

والسلام

آپ کا بھائی حامدی کاشمیری

۱۰ فروری ۷۸ء

حامدی کاشمیری

○

شب کو غارت کر گئیں میرا سکوں پرچھائیاں
ایک کالا حرف، کتنی شعلہ گوں پرچھائیاں

اونچے ٹیلے پر کھڑا اک آتشیں گفتار تھا
سامنے تھیں گوش شنوا سرنگوں پرچھائیاں

چلتے پھرتے لوگوں پر ہوتا ہے سایوں کا گماں
پھونکتی ہیں شام کو کیسا فسوں پرچھائیاں

آخرِ شب پے بہ پے منظر بدلتے ہی رہے
برف، آندھی، دھوپ، صحرا، شعلہ گوں پرچھائیاں

کیوں انھیں الزام دیتے ہو کبھی دیکھا بھی ہے؟
کرتی ہیں ہر رہگزر پر گشت دن کو پرچھائیاں

○

آگ برساتی ہوا، رستے کی ناہمواریاں
کیسے رہرو تھے انھیں حائل تھیں کیا دشواریاں

کیا خبر تھی اُن کو بھی ہے چاندنی کا انتظار
شام تک کرتے رہے سب میری خاطر داریاں

اجنبی ساحل پہ میرا کون تھا پرسانِ حال
یاد کر کے روؤں گا برسوں تری غم خواریاں

اب کہاں وہ برگ و سایہ، خواب رخت سنہرے
آندھیوں کی رہ میں اب میں ہوں مری ناداریاں

سطح بینی کا چلن ہے مجھ کو لے آئے کہاں؟
کون سمجھے گا مرے اشعار کی تہ داریاں

سلطان اختر

○

ہرا شجر نہ سہی، خشک گھاس رہنے دے
زمیں کے جسم پہ کوئی لباس رہنے دے

کہیں نہ راہ میں سورج کا قہر ٹوٹ پڑے
تو اپنی یاد میرے آس پاس رہنے دے

بکھر چکے ہیں سماعت کے تلخ شیرازے
اب اپنے نرم لبوں کی مٹھاس رہنے دے

وہ دیکھ ڈھے چکیں وہم و گماں کی دیواریں
یقین چیخ رہا ہے، قیاس رہنے دے

بڑا لطیف اندھیرا ہے، روشنی نہ جلا
عروسِ شب کو ابھی خوش لباس رہنے دے

تصورات کے لمحوں کی قدر کر پیارے
ذرا سی دیر تو خود کو اُداس رہنے دے

○

تنہائی کی خلیج ہے یوں درمیان میں
ہر شخص جیسے قید ہو اندھے مکان میں

اُس کے لبوں پہ سات سمندر کا عکس تھا
صدیوں کی پیاس جذب تھی میری زبان میں

ٹکرا کے اختلاف کی دیوار توڑ دی
ضدی تھا، سربلند ہوا خاندان میں

یوں بھی دہکتے دشت سے کیا کم تھی زندگی!
بے کار دھوپ کود پڑی درمیان میں

بہتر ہے اپنے آپ سے کچھ بولتے رہو
یوں چپ رہے تو زنگ لگے گا زبان میں

کہاں کسِ کی میں ہجوم میں آنکھیں نکالتا
اچھا ہوا کہ آپ دریچے سے ہٹ گئے...

قمر اقبال

○

سب کچھ جو بہا لے جائیگا اب درد کا وہ سیلاب ہیں ہم
پھرتے ہیں لئے جلتی آنکھیں جو ٹوٹ گیا وہ خواب ہیں ہم

اپنے ہی لہو کے شعلوں میں دل آج جھلستا رہتا ہے
پہنچائیں کسی کو کیا ٹھنڈک خود اپنے لیئے تیزاب ہیں ہم

انجان نگر میں رات ڈھلے ٹھہریں کس کی پلکوں کے تلے
وہ بھی نہ ہمیں پہچان سکے جن کی آنکھوں کا خواب ہیں ہم

لفظوں میں ڈھلے تو غم روٹھے سینے میں رہے تو دم ٹوٹے
اک بات جسے کہنے کے لئے برسوں سے یہاں بے تاب ہیں ہم

غم ہم کو جہاں مل جاتا ہے خوشیوں کے عوض لے لیتے ہیں
پیاسے ہیں سمندر ہو کر بھی سمجھو نہ مگر پایاب ہیں ہم

ملتے ہیں یہ سیاہی لیتے ہیں لوگوں کو اجالا دیتے ہیں
جلتا ہے جہاں ہر رات دیا گھر کا وہ قمر محراب ہیں ہم

مرزا عزیز جاوید

○

کیوں آب و خاک و باد کو آہن بنا گئے
وہ کون لوگ تھے جو بدن بھی چرا گئے

مل جائیں وہ تو اُن کو مسیحا کا نام دوں
سانسوں کو میری جو میرا مقتل بنا گئے

مُدت کے بعد لوٹا تو یہ اطلاع ملی
سب اپنی اپنی قبر میں جا کر سما گئے

کیسے یہ رازدان فنا و بقا تھے جو،
پھر لوٹنے کا دہر میں کھٹکا لگا گئے

آئے طبیب تشنہ لبی میں کے وہ ضرور
لیکن شراب جیسی نصیحت پلا گئے

احساس کی چٹان سے ٹکرا کے ہم عزیز
سنجیدگی کے ساتھ تماشا دکھا گئے

ڈاکٹر سلمان اختر

۱۹۴۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ جاں نثار اختر مرحوم کی پہلی بیوی
مرحومہ صفیہ اختر کے فرزند، جاوید کے چھوٹے بھائی اور مشہور شاعر مجاز
کے بھانجے ہیں۔ شاعری کا شوق ورثے میں ملا۔ کم عمری سے ہی شاعری
شروع کردی۔ مشق سخن کے ساتھ ساتھ تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا۔ طبیعت
کی موزونیت اور مزاج میں جدت نے شاعری میں نکھار پیدا کردیا۔
ان کی شاعری مانگے کا اُجالا نہیں ایک نئے سمت کی روشن لکیر ہے
جو خاندانی روایت کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

ان دنوں ورجینیا (امریکہ) میں ذہنی امراض کے ڈاکٹر ہیں۔
معاشرے کی دکھتی رگ پر انگلی رکھنا یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کلام میں
عصریت اور احساس کی چبھن ہوتی ہے۔

ہم بہت دن جیئے ہیں دنیا میں
ہم سے پوچھو کہ خودکشی کیا ہے

ڈاکٹر سلمان اختر

○

اپنی تو قبر پہ طے ہے کہ یہ کتبہ ہوگا
اک نہ اک دل میں تو یہ آدمی زندہ ہوگا

فرق اتنا ہے کہ آنکھوں سے پرے ہے ورنہ
اسکے وقت بھی سورج کہیں چلتا ہوگا

کون دیوانوں کا دیتا ہے بھلا ساتھ یہاں
کوئی ہوگا میرے جیسا تو اکیلا ہوگا

کھڑکیاں دیر سے کھولیں، یہ بڑی بھول ہوئی!
میں یہ سمجھا تھا کہ باہر بھی اندھیرا ہوگا

○

ہر لمحہ آدمی کے لیئے اک صلیب تھا
جو مر گیا، یہ سچ ہے بہت خوش نصیب تھا

گزرے ہزار لوگ مرے دل کو پوچھتے
رہنے کوئی نہ آیا مکاں یہ عجیب تھا

بیتے گا سارا دن مجھے کچھ سوچتے ہوئے
کل رات کوئی خواب میں میرے قریب تھا

متفرق اشعار

ہم سمندر پہ دوڑ سکتے ہیں
ہم نے اتنے سراب دیکھے ہیں

ہر آدمی سے لگائے جو آس رہتے ہیں
وہ لوگ دنیا میں بے حد اداس رہتے ہیں

دیکھی جو اپنی شکل تو بدلی ہوئی لگی
ہر دل کے آئینے میں پڑا ایک بال تھا

ایک مصرعے کی بند مٹھی میں
کتنی یادوں کا دل دھڑکتا ہے

یہ زندگی ذرا فرصت اگر ہمیں دیتی!
جواز ڈھونڈتے کچھ اپنی بے حسی کا بھی

جو چھپانے کی تھی وہ بات بتا دی مجھ کو
زندگی تو نے بہت سخت سزا دی مجھ کو

مظہر حسین قیصر

۲ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو برار کے ایک شہر امراؤتی میں پیدا ہوا۔ ۵۱ء میں ناگپور یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے اور عثمانیہ یونیورسٹی سے ۵۳ء میں ایل ایل بی کیا۔ کچھ دنوں تک حیدرآباد میں وکالت بھی کی لیکن چلی نہیں۔ پھر بمبئی چلا آیا۔ اصطبل نما فلم اسٹوڈیوز کی خاک چھانی اور جاہل پروڈیوسروں اور بے وقوف قسم کی فلمی "شخصیتوں" کے چکر میں پھنسا رہا۔ چونکہ فلم انڈسٹری میں پیر جمانے کا "آرٹ" باوجود کوشش اور دل پر پتھر رکھ کر بھی نہ آسکا اس لئے وہاں سے نکل کر صحافت میں آگیا اور آجکل اردو "بلٹز" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوں۔

۴۴ء سے ۶۰ء تک مسلسل شاعری کی۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میں اردو شاعری میں کوئی قابلِ قدر اضافہ نہیں کرسکتا اس لئے میں نے شاعری چھوڑ ی تو نہیں کم ضرور کردی، لیکن یہ کافر منہ سے ایک بار لگ کر چھوٹ نہیں سکتی اس لئے میں پھر اس کے دامن سے لپٹنے کی کوشش کر رہا ہوں، اردو شاعری میں اضافہ کرنے کے لئے نہیں بلکہ خود کی تسکین کے لئے۔ اور شاعری نماز تو نہیں ہے کہ ایک بار آدمی چھوڑ دے تو نمازی نہ رہے۔ اس لئے شاعر ہونے کا اعزاز اور فخر تو مجھے حاصل رہیگا ہی خواہ میں شاعری کروں یا نہ کروں۔۔

مظہر حسین قیصر

○

کیا کیا کروں سجنا جتن، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے
بیری بنا اپنا ہی من، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

وعدہ تو تجھ سے کر گئی، میں لاج سے مر مر گئی
پائل پکارے چھن چھن، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

کالی گھٹا جب چھائے ہے کیا کیا نہ من للچائے ہے
کس سے کہوں دل کی لگن، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

پریتم سے جب پیتم ملے، اندر ہی اندر من جلے
جھر جھر بہیں نیناں سجن، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

تجھ نردئی کی چال پر، مجھ باؤری کے حال پر
رو رو بہے نیلا گگن، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

برہا کی کالی رات میں، امڈی ہوئی برسات میں
کروٹ جو لوں چمکے چبھن، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

نندیا جو اچٹے بھور کو، کاٹے ہے دل کی کور کو
باہوں میں چھپ روئے پون، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

راتوں کو اٹھ اٹھ گاؤں میں، تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں
پربت پھروں دیکھوں نہ بن، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

سکھیوں کی میٹھی مار کیا، تجھ بن مورا سنگھار کیا
کورے ہیں کاجل سے نین، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

ساون کی یوں بوندیں پڑیں، پلکوں سے جوں موتی جھڑیں
جل جل بجھے دل کی اگن، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

کس اُور تجھ کو پاؤں میں آجا کہ بل بل جاؤں میں
تنوں کو اب ٹوٹے بدن، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

مظہر حسین قیصر

○

مداوائے الم کب تک نہ ہوگا ہم بھی دیکھیں گے
کہاں تک منہ چھپائیں گے مسیحا ہم بھی دیکھیں گے

ترا غم اور اُس پر غم جہاں کا اِک قیامت ہے
کہاں تک ساتھ دیں گے جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے

ہمارے دم سے ہی قائم تھی ساری رنگ سامانی
شکستِ رنگِ محفل کا تماشا ہم بھی دیکھیں گے

ضیاء للکارتی ہے تیرگی کی سانس گھُٹتی ہے
سحر کے ساتھ تاروں کا تڑپنا ہم بھی دیکھیں گے

کوئی کب تک اٹھائے زحمتِ احسانِ میخانہ
رگِ سنگِ وطن میں موجِ صہبا ہم بھی دیکھیں گے

گیا وہ دور جب صحرا بسر تھی چاک دامانی
جنوں کو گلستاں میں کارفرما ہم بھی دیکھیں گے

شہیدانِ وطن کے خون سے سیراب ہے دھرتی
جبینِ خاک پہ جنت کا نقشہ ہم بھی دیکھیں گے

○

دردِ دل کو چلے ہیں اپنانے
کتنے دیوانے کتنے فرزانے

ہم نشیں مجھ کو دم تو لینے دے
اِک زبان اور ہزار افسانے

کوئی احوال پوچھتا ہی نہیں
کتنے چہرے ہیں جانے پہچانے

کون کہتا ہے جشن جشن نہ تھا
کتنے ٹوٹے پڑے ہیں پیمانے

اِک عیادت کی بات پر مت جا
کتنے دھوکے دیئے مسیحا نے

منظر حسین قیصر

○

ہائے رے جورِ گردشِ ایام
زندگی سے بھی بڑھ گئے آلام

کوئی سنتا نہیں فسانۂ غم
کوئی کیوں لے گا اپنے سر الزام

کاش ہم ہجر ہی میں مر جاتے
تجھ سے ملنا ہی ہوگیا الزام

کوئی پہچانتا ہمیں کیونکر!
کاش آتا نہ لب پہ تیرا نام

ذکر تیرا ہے آنکھ پھر نم ہے
یونہی بس ہو رہی ہے عمر تمام

کوئی بھی پی لے اور پی جائے
اتنی سستی کہاں ہے گلفام

ہم ہیں قیصر فروغِ میخانہ
ہم سے زندہ ہے رسمِ بادہ و جام

○

دلِ معصوم نے ہر چیز کو عریاں سمجھا
پھول کو پھول گلستاں کو گلستاں سمجھا

ہم سے کیا پوچھتے ہو قصۂ بیدادِ جنوں
اُن کے دامن کو بھی اپنا ہی گریباں سمجھا

دل نے زنداں میں بھی لوٹے ہیں محبت کے مزے
طوق و زنجیر کو بھی گیسوئے جاناں سمجھا

ہم کو کیا علم تھا رنگین بھی ہوتی ہے خزاں
ہم نے خونِ گل و لالہ کو بہاراں سمجھا

میں اس نظر کی جلوہ طرازی کو کیا کروں
جس رخ پہ پڑ گئی رخِ جاناں بنا دیا

قیصر الجعفری

بمبئی

ڈیر صابر۔ تسلیم

"فن اور شخصیت" کے تین تین ضخیم نمبر نکالنے کے بعد اب تم "غزل نمبر" نکال رہے ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو دنیا تمہیں تمہارے حوصلے کی داد دے رہی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ صحافت کی اس بھیڑ میں تم نے اپنی پہچان الگ پیدا کرلی ہے، انفرادیت ہی انسان کی جد و جہد کا حاصل ہے اور اس کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ تم کو یہ سرمایہ مبارک ہو۔ میں بھی اسی انفرادیت کی تلاش میں شاعرانہ زندگی کے تیس سال چھان کر یہاں تک پہنچا ہوں۔

زندگی کئی حصوں میں بٹی سمٹی ہوئی آرہی ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں پیدا ہونے کی اطلاع دسویں سال بعد ایک بزرگ کے خط سے ملی۔ بچپن نظر گنج الہ آباد میں گذرا، مگر اس دور کے نقوش ذہن میں بہت ہلکے پڑ گئے ہیں۔ وہ مکتب یاد ہے، جہاں اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ وہ گلیاں یاد ہیں جہاں آوارہ گردی بھی کی اور شاعری بھی سیکھی۔ وہ گھر بھی یاد ہے جو اب ترک وطن کے بعد کھنڈر بن چکا ہے۔ ماں کی محبت کی پرچھائیاں بھی ساتھ ہیں اور والد کی زمیندارانہ ناز برداری بھی۔ مگر وہ موڑ جہاں سے اپنی شخصیت کا تصور ابھرا اس کا خیال باقی نہیں ہے۔ اسلامیہ کالج الہ آباد سے جب سنہ ۱۹۴۹ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کرکے زندگی کی ناہموار راہوں میں چلنا پڑا تو معلوم ہوا کہ پاؤں میں کتنے آبلے ہیں۔ وہ آبلے بارہا پھوٹے خشک ہوئے اور پھر پڑے۔ اور زندگی گذرتی رہی۔ شاعری میں بھی انہیں سلگتے ہوئے آبلوں کی آگ شامل ہے۔

سنہ ۱۹۶۴ء میں "رنگِ حنا" شائع ہوئی اور ملک میں مقبول ہوئی۔ مگر شاعر کے ذہنی سفر کی یہ آخری منزل نہ تھی دس سال تک انفرادیت کی ایک زیادہ نکھری ہوئی صورت کی تلاش و جستجو رہی اور غزل کے اسلوب میں اپنی ذات کے اظہار کا تدریجی عمل ہوتا رہا۔ جس کا "کاغذی پیرہن" "سنگ آشنا" کی صورت میں ادبی دنیا کے سامنے پچھلے دنوں پیش کرچکا ہوں۔ "سنگ آشنا" میں جس آبلہ پا شاعر کا تصور ابھرتا ہے۔ وہ انفرادیت کے کس مقام پر ہے، وہ اہلِ نظر جانیں۔

بہر حال سفر ابھی جاری ہے۔

قیصر الجعفری
14.5.78

قیصر الجعفری

○

دل میں چبھ جائیں گے جب اپنی زباں کھولیں گے
ہم بھی اب شہر میں کانٹوں کی دکاں کھولیں گے

شور کرتے رہیں گلیوں میں ہزاروں سورج
دھوپ آئے گی تو ہم اپنا مکاں کھولیں گے

آبلے پاؤں کے چلنے نہیں دیتے ہم کو
ہم سفر، رخصتِ سفر جانے کہاں کھولیں گے

اتنا بھیگے ہیں کہ اڑتے ہوئے یوں لگتا ہے
ٹوٹ جائیں گے پر و بال جہاں کھولیں گے

ایک دن آپ کی غزلیں بھی بکیں گی قیصر
لوگ بوسیدہ کتابوں کی دکاں کھولیں گے

درد کی چھاؤں میں مصلوب ہوئے ہیں دونوں
میری باہوں کا اجالا، تری آنکھوں کا خمار

○

توڑنا چاہا تھا، چھو لینا بھی دشوار لگا
مجھ کو ہر پھول تمہارا لبِ گلنار لگا

سنگ باری کے تماشے میں سبھی تھے شامل
میں نے پتھر نہ اٹھایا تو گنہ گار لگا

خواب بن کر کوئی یوں بھی نہ بسے آنکھوں میں
کوئی چہرہ نظر آیا، رخِ دلدار لگا

کس کے سائے میں ٹھہرنے کی تمنا ہوتی
ہر تصور مجھے گرتی ہوئی دیوار لگا

رہِ حیات میں ایسے بھی موڑ آتے ہیں
خود اپنے پاؤں کی آہٹ خراب لگتی ہے

اب زندگی نہ جانے کرے ہم سے کیا سلوک
جب تک تمہارا ساتھ رہا جی میں جی رہا

میں جہاں جاؤں یہی ویرانی
ساری دنیا ہے مرے گھر کی طرح

آزاد گلاٹی

نابھا (پنجاب)

برادرم!

آداب!

محبت نامہ ملا - آپ نے پہلی بار یاد فرمایا لیکن اس قدر محبت اور اپنائیت سے 'کہ بس' ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنا لیا - کیا بمبئی جیسے مشینی شہر میں بھی خلوص و محبت نام کی شے بچ نکلتی ہے -؟ یقیناً! اب تو یقین آ ہی گیا!

اب رہی غزل نمبر کی بات -

بہت حوصلے کا کام کر رہے ہیں آپ - ہر دو شمارہ غزل نمبر کے سرورق کی تصویر جان لیوا ہے - ظاہر ہے کہ فن اور شخصیت کے ہر شمارہ میں آپکی شخصیت و فن کی جھلکیں بھی ضرور ہوتی ہیں - مجھے آپ نے شرکت کی دعوت دی ہے، اس کے لئے تہہ دل سے شکر گذار ہوں - نابھہ جیسی (بقول آپ کے) ویران جگہ پر آپ کے اس خط نے بہار سی لا دی ہے - میں یہ طے نہیں کر پایا کہ کتنی غزلیں آپ کو روانہ کرنی ہیں - بہر حال چند غزلیں حاضر ہیں - اب آپ جانیں، آپ کا کام -

جہاں تک تعارف کا سوال ہے، تو یہ عرض کر دوں، کہ ان غزلوں کے بعد جو کچھ کہنے کو رہ جاتا ہے، وہ محض رسمی سا ہے - میں ۱۹۳۵ء میں کالا باغ (ضلع میانوالی، پاکستان) میں پیدا ہوا، لگ بھگ ۲۰ برس سے مشقِ سخن جاری ہے - شعر کہنے کا شوق بہت پرانا تھا - لیکن احباب کی حوصلہ افزائی نے اسے مزید ہوا دی - اب تک چار مجموعے اردو کلام کے شائع ہو چکے ہیں - آغوشِ خیال (۱۹۶۴ء) جسموں کا بن باس (۱۹۷۱ء) تکلون کا کرب (۱۹۷۳ء) اور دشتِ صدا (۱۹۷۶ء) - دو بار پنجاب سرکار سے بہترین شعری تخلیق کا انعام دو کتابوں پر حاصل کر چکا ہوں - اردو کے علاوہ انگریزی اور پنجابی میں بھی لکھتا ہوں - انگریزی اور پنجابی میں مضامین کا ایک سلسلہ جاری ہے جس میں اردو شعراء اور ادباء کے بارے میں تعارفی اور تنقیدی جائزے ہیں - لگ بھگ پندرہ برس سے پنجاب کے واحد انگریزی اخبار ٹریبون کے لئے اردو کتابوں پر تبصرے بھی لکھ رہا ہوں اور اب تک سو سے زائد کتابوں پر تبصرے انگریزی میں شائع ہو چکے ہیں - ریڈیو سے بھی تقاریر و کلام اکثر نشر ہوتا رہتا ہے - ذریعۂ معاش کالج میں انگریزی پڑھانا ہے - روزانہ مطالعے کے لئے وقت نکال سکوں یہ میری بڑی خواہش رہتی ہے - احباب کا حلقہ بہت وسیع ہے اور میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوں کہ مجھے بہت عزیز اور مہربان دوست ملے ہیں - کیا کسی کی زندگی سنوارنے - یا بگاڑنے - کے لئے اتنا کچھ کافی نہیں ہوتا؟

رہینِ خلوص

آزاد گلاٹی

۹ فروری ۷۸ء

آزاد گلاٹی

○

شہرِ امید کی گلیوں میں بھٹکتے رہیئے
اپنے ہاتھوں کی لکیروں سے اُلجھتے رہیئے

کوئی جھونکا کبھی اس سمت بھی لے جائے گا
بوئے گُل کی طرح اپنے سے نکلتے رہیئے

ٹوٹ بھی جائیں تو عکس اپنے ملیں گے اُن میں
چل ہی نکلے ہیں تو اب شیشوں پہ چلتے رہیئے

برف کی قاش لبوں پر ہو تو بہتر ہے یہی
اپنے انفاس کی بھٹی میں پگھلتے رہیئے

ابر کے سائے تو مِٹتے ہیں ہوا کے ہاتھوں
دھوپ ہی اپنا مقدر ہے، سو جلتے رہیئے

کس کو فرصت ہے کہ آزاد سُنے بات کوئی
خود کلامی ہی کے جوہر سے نکھرتے رہیئے

○

ساحل پہ رُک کے سوئے سمندر نہ دیکھئے
باہر سے اپنے آپ کا منظر نہ دیکھئے

اپنے وجود ہی پہ نہ گزریں کئی شکوک
سائے کو اپنے قد کے برابر نہ دیکھئے

جاگے تو محض ریت ہی پائیں گے ہر طرف
گر ہو سکے تو خواب میں ساگر نہ دیکھئے

یکجا نہ کرنے آئے گا کوئی تمام عمر!
خوش فہمیوں سے خود میں بکھر کر نہ دیکھئے

پھر یوں نہ ہو کہ اپنا بدن اجنبی سے لگے
بہتر ہے اس کے خول سے باہر نہ دیکھئے

آزاد جی! ڈرائے گا پرچھائیوں کا خوف
ویراں نظر سے کوئی بھی منظر نہ دیکھئے

پرکاش فکری

رانچی

برادرم صابر دت!

غزل نمبر میں شمولیت کی دعوت، میرے لئے واقعی بڑی بات ہے۔ اور اس عنایت کے لیئے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ "چند غزلیں"۔ سے چونکہ یہ پتہ نہیں چلا کہ مجھے کتنی غزلیں بھیجنی چاہئیں، لہٰذا میں دو غزلیں منسلک کر رہا ہوں۔

میں جس ڈھنگ کی غزلیں کہتا ہوں۔ اس سے تو آپ واقف ہی ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ غزلیں میرے مزاج کی نمائندگی میں ناکام نہیں ہیں۔

تصویریں بھیج رہا ہوں۔ کہ انکار کا کوئی بہانہ ہاتھ نہ آیا۔

رہا تعارف تو یہ کام زیادہ بہتر طریقے سے میری غزلیں ہی کرتی آئی ہیں۔ اور ہر دم میری یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ میرے تعارف کو زیادہ سے زیادہ واضح کر سکیں۔

جاں نثار اختر نمبر اور کیلیشور نمبر دونوں میں نے یہاں اسٹال سے خریدے ہیں۔ اُدھار۔ اور ادائیگی قسطوں میں۔ یہ FACILITY تو تم دینے سے رہے۔

خط کا انتظار کروں گا ــــــ

تمہارا

پرکاش فکری

۱۲ فروری ۸۷ء (رات دو بجے)

پرکاش فکری

○

گھنے سبز سائے شجر چار سو
کہیں خوف خطرہ نہ ڈر چار سو

ہوا میں بکھرتے ہیں نقشِ نوا
پرندے ہیں محوِ سفر چار سو

کوئی ان کو پتھر نہ مارے کہیں
بنے ہیں جو شیشے کے گھر چار سو

یہ جنگل بھی آباد کیسے رہیں!
کہ گھیرے ہیں ان کو نگر چار سو

ہر اِک آس پیکر سے خالی، تھی
بھٹکتی ہے پھر بھی نظر چار سو

کہاں جا کے فکری چھپیں گے بتا
جو پھیلے گی اپنی خبر چار سو

○

افسردہ رہِ شوق سے چُپ چاپ گزرتے
اور نقشِ نوا اِن کے کہیں اور اُبھرتے

ہوتے کبھی بے چین سمندر کی صدائیں
ساحل پہ کبھی ریت کے ذرّوں میں بکھرتے

جاتے کبھی صحراؤں کی دلجوئی کو تنہا
رستوں کی رفاقت میں سفر دور کا کرتے

اُڑتے جو پرندوں کی طرح ہم بھی ہوا میں
ہر شام نئی شاخ کی باہوں میں اترتے

ٹھہرا نہیں لمحوں کا کوئی قافلہ فکری
دیکھا ہے ہر اِک خوابِ شفق رنگ کو مرتے

صابرؔ دتّ

میں ۹ ستمبر ۱۹۳۸ء کو جموں کشمیر کے ایک شہر میرپور (جو اب پاکستان کا حصہ ہے) میں پیدا ہوا۔ ظاہر ہے پیدائش میرے بس کی بات نہ تھی۔ میرے والد جموں کشمیر کی پولیس میں نوکری کرتے تھے یعنی تھانیدار تھے۔ تھانے سے چور کے بھاگ جانے پر سپاہی بنا دیے جاتے تھے۔ پھر کوئی کارنامہ کر کے تھانیدار۔ انھیں میں نے کچھ دن افسر دیکھا، اور کچھ دن سپاہی۔

میں نے جب آنکھ کھولی تو گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں پائی۔ دراصل انھیں رشوت زیادہ ملتی تھی۔ میں نے اپنا سارا بچپن والد کے ساتھ کشمیر کی سرسبز وادیوں میں گذارا۔

۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی ایک صبح، میں، ماں، بہنیں اور والد ہم سب بھاگ کر رجوری سے جموں آ رہے تھے، بیچ راستے میں کچھ سرپھرے فسادیوں نے میرے والد کے یوں ٹکڑے کر دیئے جیسے کوئی ساگوان کے درخت کو چیر کر پھینک دیتا ہے۔ میں یہ دیکھ کر بھاگ گیا۔ اپنی جان کیسے پیاری نہیں ہوتی۔ اُن کی لاش کو تو خیر جانور کھا گئے پر اُن کے قاتل کو میں آج بھی سونگھ کر پہچان سکتا ہوں۔

ماں ہمیشہ اس زمانے میں اپنا پلّو میرے سر پر اوڑھا دیتی تھی کہ یہ ابھی چھوٹا ہے۔ قد واقعی چھوٹا تھا ورنہ قتل ہو گیا ہوتا۔ اس کے بعد یوں سمجھیے کہ زندگی جیسے یتیم خانے میں گذاری، اسی سوچ میں کہ کب بڑا ہو جاؤں، نوکری کروں اور ماں کے پاس رہوں۔ ابھی میٹرک کے امتحان کا نتیجہ آیا تھا کہ ماں گذر گئی۔ بی اے کا امتحان دیکر گھر سے باہر نکل آیا۔ ہندی میں "روپ" نام کا ایک میگزین نکالا۔ بعد میں پندرہ روزہ "دِلّی والا"۔ اس زمانے میں گذر بسر مشاعروں پر ہی ہوتی تھی۔ جنوری ۱۹۶۰ء میں ایک مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی آیا۔ شہر پسند آگیا۔ تب سے اب تک یہیں ہوں۔ اپنے ماضی کو کھنگالتا ہوں تو خوف آتا ہے۔ اور حال کو دیکھتا ہوں تو بدبو ۔۔۔ آدمی آدمی سے کٹ گیا ہے، کوٹھی کار اور دولت سے زیادہ بگڑ گیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی چیز قبرستان اور چتا میں ساتھ نہیں جاتی۔ مجھے حیرت ہے کہ میں ابھی تک زندہ ہوں اور میرا ضمیر میرے پاس محفوظ ہے۔

"ہم سے دیوانوں پہ وہ وقت نہ آئے صابرؔ
جب حکومت کا طرفدار بنے اپنا کلام"

صابر دت

صابر دت

○

چاندنی رات میں شانوں سے ڈھلکتی چادر
جسم ہے یا کوئی شمشیر نکل آئی ہے

مدتوں بعد اُٹھائے تھے پُرانے کاغذ
ساتھ تیرے مری تصویر نکل آئی ہے

کہکشاں دیکھ کے اکثر یہ خیال آتا ہے
تیری پازیب سے زنجیر نکل آئی ہے

صحنِ گلشن میں مہکتے ہوئے پھولوں کی قطار
تیرے خط سے کوئی تحریر نکل آئی ہے

چاند کا روپ تو رانجھے کی نظر مانگے ہے
رَین ڈولے سے کوئی ہیر نکل آئی ہے

○

کہیں بُلبل کی کہیں گُل کی صدا آتی ہے
آپ آتے ہیں تو گلشن میں صبا آتی ہے

آپ کے رُخ سے برستا ہے سحر کا جوبن
آپ کی زُلفوں کے سائے میں گھٹا آتی ہے

آپکے ہاتھ جو چھو جائیں کسی غُنچے سے
گُل ہی کیا خار سے بھی بوئے حنا آتی ہے

آپ لہراتے نہ دیں دُودھیا آنچل کو ذرا
مُسکراتے ہوئے پھُولوں کو حیا آتی ہے

آپکو کیوں نہ تراشا گیا میرے دل سے
سنگِ مرمر سے ہمیشہ یہ صدا آتی ہے

صابر دت

○

شہر در شہر نظر آنے لگے پتھر لوگ
چاند کے دیس سے بھی لانے لگے پتھر لوگ

میں نے تو اپنے ہی زخموں کی نمائش کی تھی
جانے کیا سوچ کے گھبرانے لگے پتھر لوگ

سیکڑوں سال میں یہ شہر بسے تھے یارو
اب تو ہر سمت نظر آنے لگے پتھر لوگ

ہم نے ہر شخص سے جتنا بھی ہوا پیار کیا
جانے کس واسطے برسانے لگے پتھر لوگ

زندگی تیرا تصادم جو ذرا اور بڑھا
اپنے ہی آپ سے ٹکرانے لگے پتھر لوگ

○

شوقِ اظہار تک نہیں پہنچا
حرفِ دل یار تک نہیں پہنچا

آسماں کی بلندیاں چھو لیں !
آدمی پیار تک نہیں پہنچا

لٹ گئی مانگ اک سہاگن کی
قتل اخبار تک نہیں پہنچا

فتنۂ حشر لاکھ بار اٹھا
تیری رفتار تک نہیں پہنچا

جانے کیا خوف تھا کہ قاتل کا
ہاتھ تلوار تک نہیں پہنچا

زندگی چیختی رہی لیکن
شورِ سرکار تک نہیں پہنچا

○

تیری چاہت کا ملا بھی تو ملا یہ انعام
اے وطن ہم تیری گلیوں میں ہوئے ہیں بدنام

کتنی آنکھیں مرے دعوے کی گواہی دیں گی
تیری صبحوں میں نہاں آج بھی ہے ظلمتِ شام

ہم سے محنت کا تقاضہ تو بجا ہے لیکن
کام کرنا بھی اگر چاہیں تو ملتا نہیں کام

بات پینے کی تو چھوڑو کہ ڈرے جاتے ہیں
اپنے ہاتھوں سے نہ چھن جائیں یہ ٹوٹے ہوئے جام

کوئی بتلائے کہ آواز ہماری کیا ہے
کل تھے غیروں کے تو ہم آج ہیں اپنوں کے غلام

ہم سے دیوانوں پہ وہ وقت نہ آئے صابر
جب حکومت کا طرفدار بنے اپنا کلام

متفرق اشعار

پھول کا رنگ، ستاروں کی چمک، صبح کی دھوپ
جانے کیا بات ہے، ہر بات پہ رو دیتے ہیں

مرے شعور نے مجھ کو تباہ کر ڈالا
کسی کا جرم ہو اپنی خطا لگے ہے مجھے

طرزِ گفتار ہے کہ خوشبو ہے
ہونٹ پھولوں کے بات پھولوں کی

ذکر جب بھی کسی محفل میں چھڑا ہے اپنا
اجنبی بن گئے اور جا کے الگ بیٹھ گئے

حسن کیا جانے محبت کا سلیقہ یارو
عشق نے درد کے ماروں سے محبت کی ہے

ہم ثریا سے بھی پرے ہوتے
تیری خاطر کہاں سے لوٹ آئے

پھونک ڈالی جنھوں نے شامِ فراق
ہم بھی شامل تھے اُن شراروں میں

FULL MANY A GEM OF PUREST RAY SERENE,
THE DARK UNFATHOM'D CAVES OF OCEAN BEAR:
FULL MANY A FLOWER IS BORN TO BLUSH UNSEEN,
AND WASTE ITS SWEETNESS ON THE DESERT AIR:

——THOMAS GRAY——

ہیں اور بھی دُنیا میں...

مُرتّب: حسن کمال

جب صاحب دت نے مجھ سے یہ فرمائش کی کہ اُن کے غزل نمبر کے اس حصے کی ادارت کے فرائض میں سنبھالوں جس میں ایسے شعراء کا کلام ہو جو نہ کسی ادبی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں اور نہ ہی کسی ادبی سیاست سے وابستہ ہوں، ساتھ ہی جو نسبتاً کم مشہور یا گمنام ہوں، تو میں سمجھ گیا کہ موصوف مجھے پھنسا رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک آزمائشی بلکہ خطرناک مرحلہ تھا۔ غزلوں اور خطوط کے ایک انبار میں سے چند کو چننا اور باقیوں کو نظر انداز کرنا بجائے خود ایک جوکھم کا کام ہے۔ سر پر جانب داری یا دوست نوازی، تعصب یا ذاتی پرخاش کا خنجر الگ لٹکتا رہتا ہے۔ میں نے اُن کی پیش کش ایک چیلنج سمجھ کر قبول تو کر لی لیکن ساتھ ہی ایک ترکیب بھی نکالی، ترکیب یہ کی کہ تمام شعراء کے نام اور مقطعوں کو کاغذ سے ڈھکوا دیا۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ میری ذاتی دوستی، تعصب یا تنگ نظری اُسی کاغذ تلے چھپ گئی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ میں کم از کم اپنی نظروں میں آخر تک ناجانب دار رہا۔

یہ طریقِ کار بعد میں میرے لیئے ایک بے حد خوشگوار تجربہ بھی ثابت ہوا۔ کیونکہ اس کارروائی میں کم از کم ایک ایسا شاعر ضرور دریافت ہوا جس کے تابناک مستقبل کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ ایس اے رزاق کا کلام پڑھ کر شاید آپ بھی اس بات کی تائید کریں گے۔

ایک بات کا مجھے افسوس بھی ہے۔ اس فہرست میں آپ کو چند ایسے نام بھی ملیں گے جو نہ تو گمنام کہے جا سکتے ہیں اور نہ ہی کسی ادبی گروہ بندی یا سیاست سے بری۔ میں نام نہیں لینا چاہتا، لیکن ان حضرات کو بھی شامل کرنے کے باوجود میں اپنی ناجانبداری اب بھی محفوظ تصور کرتا ہوں۔

جن شعراء کا کلام آپ اِس گوشے میں دیکھیں گے شاید آپ اتفاق کریں گے کہ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو کئی جدید شاعروں پر بھاری ہیں اور کئی ایسے ہیں جن کے پاس بہت سے ترقی پسندوں اور جدیدیوں سے زیادہ امکانات اور گنجائشیں ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ گمنام شعراء کئی جدیدیوں پر اس لئے بھاری ہیں کہ نہ صرف انکے اشعار قابلِ فہم ہیں بلکہ اُن کے پاس اُن کا اپنا لہجہ ہے جو اُنھوں نے کسی مغربی یا مشرقی شاعر سے نہیں چُرایا۔ اور اُن کے پاس ترقی پسندوں سے زیادہ امکانات اور گنجائشیں اس لیئے ہیں کہ ان کے اشعار کے اندر اور باہر آس پاس کی دُنیا دھڑک رہی ہے۔ آخر میں مَیں یہ کہہ کر آپ سے اجازت لوں گا کہ اگر یہ گوشہ آپکو پسند آئے یا اگر اس میں آپ کو شگفتگی اور تازگی محسوس ہو تو اس کا تمام تر افتخار ان خوبصورت شاعروں کے سر ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے آپ اسے پسند نہ فرمائیں تو سارا قصور میرا اور میری پسند کا ہے۔

ایس اے رزّاق

ناسک

جی ہاں قطعی گمنام ہوں، نہ میرا لکھا ہوا کسی نے پڑھا نہ کہا ہوا کسی نے سُنا۔ سنِ ولادت ۱۹۳۵ء وطن ناسک، ایک نامعلوم سا "روگ" بچپن ہی سے دامنِ دل تھامے ہوئے ہے۔ کوئی حکیم نکتہ داں ایسا نہیں ملا کہ اس "روگ" کا علاج کرتا یا اظہارِ درد کا کوئی آزمودہ نسخہ مرحمت فرماتا۔ اس اندھے درد نے شعر گوئی کی بیساکھی تھامے نہ جانے کہاں کہاں کے فاصلے طے کئے۔ لیکن آج تک سمت معلوم نہ ہوئی۔

۱۹۵۴ء میں ایس ایس سی کا امتحان دیا۔ اس وقت تک علاوہ دیگر شعراء و ادبا کے غالب اور اقبال کا میں مطالعہ کر چکا تھا۔ اِن دونوں قد آور درختوں کی بلندی و وسعت سے تو میں اس وقت ناآشنا تھا۔ البتہ ان کے سایوں میں سکون بہت ملا۔ روشنی و خوشبو حاصل ہوئی۔ غالب نے درد کو گہرا کر دیا۔ اقبال نے نکھار دیا۔ والد کا نام عبدالحمید تھا۔ میرا نام عبدالرزاق ہے۔ اس طرح رزاق حمید کہلانا پسند کرتا ہوں۔ ۱۹۶۰ء میں جے جے اسکول آف آرٹ بمبئی سے .A.T.D کیا، نیشنل ہائی اسکول ناسک میں ڈرائنگ ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی چونکہ ادب سے دلی تعلق ہے، خیال پیدا ہوا کہ یہ اعتبار سند ہی سہی اس میدان کو سر کر لیا جائے۔ چنانچہ بی اے اور ایم اے دونوں فرسٹ ڈویژن میں کامیاب کیا۔ اس وقت کے ٹی ایچ ایم کالج، ناسک میں بھی اردو فارسی پڑھاتا ہوں۔ پہلی بار آپ سے نیاز حاصل ہو رہا ہے، اگر یہ مکمل طور پر حاصل ہو جائے تو ناز کروں گا ؎

بلند ہے تو یہ مطلب نہیں کہ غیر بھی ہے　زمین ہی کے لئے آسمان ہوتا ہے

عبدالرزاق

ملو کسی سے تو لے آؤ ایک تازہ خلش　کرو علاج تو زخمِ علاج ملتا ہے

نہ تکلف نہ خوشامد نہ گذارش کی نظر　ہم نے تدبیر ہی کیا کی ہے کہ رک جائے کوئی
کیا عجب زندگی سے چھین لے اک اک لمحہ　اور پھر ایک ہی لمحہ میں بدل جائے کوئی

آنکھ جھپکا کے بڑھا آگے تو اک صحرا تھا　اُف وہ فردوس جہاں ہم نے تمہیں دیکھا تھا
گرد آنکھوں ہی لئے پھرتا ہے اک عالم کی　یہ مسافر ترے کوچے سے ذرا گزرا تھا

زہر گر دے نہ سکا مے سے بھی رکھا محروم ⁂ بات صرف اتنی نہیں تھی کہ مجھے جینا تھا

آئے اور ٹھہرے نہیں تم تو شکایت کیسی ⁂ اِک کھلے در کے سوا اور مرے گھر میں کیا تھا

میری تصویر پہ پھیری ہے سیاہی تم نے ⁂ یہ جو تکلیف اُٹھائی تو تعلق کیا تھا

جنسِ کم مایہ کو بھی کام میں لایا جائے ⁂ ہم سے مخلص کو بھی نزدیک بُلایا جائے

رائیگاں جاتے ہیں افسوس یہ لمحے لیکن ⁂ کون ہے؟ جس کے لئے وقت بچایا جائے

آپ اب جا ہی رہے ہیں تو تکلف کیسا! ⁂ یہ ضروری تو نہیں ہاتھ ملایا جائے

شہر آراستہ ہے نت نئی دیواروں سے ⁂ اپنا گھر چھوڑ کے کیا دیکھنے جایا جائے

آپ فرمایئے ہم سُنتے ہیں لیکن صاحب! ⁂ باقی کیا ہے کہ جسے سامنے لایا جائے
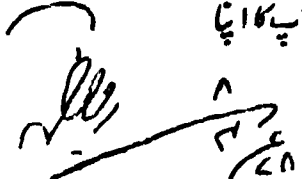
اُس سے مِل کر اُسے خاموش کھڑا چھوڑ دیا ⁂ ایک دفتر سرِ بازار کھُلا چھوڑ دیا

اتنے آنسو ہی کہاں تھے کہ بجھاتے جو یہ آگ ⁂ اپنا گھر ہم نے یونہی جلتا ہوا چھوڑ دیا

ہم کو منزل سے تھیں وابستہ اُمیدیں اتنی ⁂ راہ چلتے ہوئے جو کچھ بھی مِلا چھوڑ دیا

آپ چاہیں تو پرو سکتے ہیں موتی اِس میں ⁂ دُور کا آپ کے نزدیک سِرا چھوڑ دیا

جانے دے اے خلشِ دِل نہ دِلا یاد اُسکی ⁂ ہم نے اِک بار جسے چھوڑ دیا چھوڑ دیا

رؤف خیر

حیدر آباد

اپنے بارے میں ہلکے سے تعارف کے طور پر عرض کروں کہ میں نے ۱۹۷۲ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن (بی اے) کیا ہے۔ اور ۱۹۶۹ء سے عدالت (سٹی سول کورٹ) میں اسٹینوگرافر ہوں۔ پیدائش ۱۹۴۸ء نومبر پانچ کی ہے

جون ۱۹۷۸ء میں میرا پہلا شعری مجموعہ "اِقرا" اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی اعانت کی وجہ سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔
امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا ــــ

آپ کا اپنا

عجب پرندہ ہے ہر زد سے بچ نکلتا ہے ؛ پتہ نہیں اُسے کس کا نشانہ ہونا ہے
میں چُپ نہیں ہوں کہ اس دورِ ابتلا میں مجھے ؛ حریفِ خامشیِ جبر ہا نہ ہونا ہے
بھلا دیا ہے کسی نے تو کوئی غم نہ کرو ؛ ہر ایک شخص کو اِک دن فسانہ ہونا ہے
سُنو یہاں سے مرے دوستو اجازت دو ؛ مجھے تلاش میں اپنی روانہ ہونا ہے
رؤف خیر چلو یہ بھی اب غنیمت ہے ؛ بھلائی کہتے ہیں جسکو بُرا نہ ہونا ہے

اِس سیلِ بے اماں کا بہاؤ بھی مان لو ؛ پھر مجھ کو ایک نوح کی ناؤ بھی مان لو
یہ چوبِ آتشیں یہ دھوئیں کی گواہیاں ؛ جنگل میں قافلے کا پڑاؤ بھی مان لو
تاپے اگر ہیں ہاتھ تو دل بھی اُجالتے ؛ جب آگ مان لی ہے الاؤ بھی مان لو
خالی مکان دیکھ کے آسیب گھُس نہ جائیں ؛ پردیسیو پلٹ کے اب آؤ بھی مان لو
یہ اور بات ہے کہ اُسے ہم نے طے کیا ؛ آیا تھا راستے میں چڑھاؤ بھی مان لو
ہر بات کا ثبوت نہ مانگا کرو یہاں ؛ کچھ بے نشان ہوتے ہیں گھاؤ بھی مان لو

محمد وسیم الدین

رتلام

تاریخ پیدائش یکم جولائی ۱۹۳۲ء - ابتدائی و ثانوی تعلیم - ایلچ پور (ودربھ) بی - اے - ساگر یونیورسٹی ۱۹۵۵ء - ایم - اے (انگریزی) جبلپور یونیورسٹی ۱۹۶۱ء - ایم - اے (اردو) جبلپور یونیورسٹی ۱۹۶۴ء - بی ٹی (بی - ایس ایم) جبلپور ۱۹۵۸ء - ملازمت - (۱) پرنسپل انجمن ہائر سکنڈری اسکول گوہلپور، جبلپور ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۸ء - (۲) محکمۂ تعلیمات مدھیہ پردیش - ۲۰ مارچ ۱۹۶۸ء تا حال - لکچرر - شعبۂ اردو گورنمنٹ حمیدیہ آرٹس اینڈ کامرس کالج بھوپال ۲۰ مارچ ۱۹۶۸ء سے ۲۰ مئی ۱۹۷۳ء - موجودہ عہدہ - اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج جاؤرہ، ۲۱ مئی ۱۹۷۳ء سے تا حال - مشاغل - درس و تدریس - شاعری - لسانیات - اور تنقیدی مضامین کا مطالعہ

رہائشی پتہ - ۳۸ - بوہرہ باکھل جاؤرہ - ضلع رتلام (ایم - پی)

محمد وسیم الدین

نئی تراش سسکتی رہی مکانوں میں ؛ پرانا مال ہی بکتا رہا دکانوں میں

میں ایک اکائی بہر حال ہوں معانی کی ؛ خدا کے واسطے بانٹو نہ مجھکو خانوں میں

سمیٹے بازوئے ہمت پرند بیٹھے ہیں ؛ ہوا کا زور نہو جیسے بادبانوں میں

پڑی ہے لاش سر راہ ایک بے ماتم ؛ تمام شہر ہے الجھا ہوا بیانوں میں

چلاؤ تیشۂ حقیقت تو آشکارا ہو ؛ سنا ہے دودھ کا دریا ہے ان چٹانوں میں

درخت نیچے سہی سائے ہیں مسافر دوست ؛ سہارا یہ بھی نہیں اونچے سائبانوں میں

وحشت عزلت میں پھراتا رہا تنہا مجھ کو ؛ اور دریا بھی دکھاتا رہا صحرا مجھ کو

جو بھی غیروں نے کہا تھا وہی اپنوں نے کہا ؛ میں سمجھتا ہوں کسی نے نہیں پرکھا مجھ کو

شان بھارتی

(دھنباد)

میں یعنی شمس الہدیٰ نے تقریباً دس سال پہلے شان بھارتی بننے کی کوشش کی تھی۔ آج شمس الہدیٰ گھر میں اجنبی ہے، جبکہ شان بھارتی ملک گیر شہرت کا حامل، اور اس شہرت کی بنیاد اس تعلق پر ہے جو ایک ادیب اور ادب نوازوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرتا ہے۔ میری ادبی تربیت شفا گوالیاری (مرحوم) نے کی تھی، اور اب بفضلِ خدا کئی بچوں کا باپ ہوں۔ ملک کے مقتدر جرائد مثلاً "شاعر"۔ "تحریک"۔ "بیسویں صدی"۔ "آجکل"۔ "روبی"۔ "فلمی ستارے" وغیرہ میں میری تخلیقات اشاعت پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے بھی اکثر کلام نشر ہوتا رہتا ہے۔ ایک شعری مجموعہ زیرِ طبع ہے۔ ادب برائے زندگی کا شدت سے حامی ہوں۔

شان بھارتی

پڑی وہ زد کہ نگاہوں کا حوصلہ ٹوٹا ٭ تمہارے عکس کی جھلمل سے آئینہ ٹوٹا

زمین شق ہوئی، آنکھوں میں بھر گیا سورج ٭ ہمارے سر پہ اچانک وہ حادثہ ٹوٹا

گجر کا شور، اذاں کی پکار کیا کہیئے ٭ خدا سے میرے تکلّم کا سلسلہ ٹوٹا

ہماری فکر حدِ آسماں سے آگے تھی ٭ مگر کبھی نہ روایت سے واسطہ ٹوٹا

تغیّرات کی رَو کب رکی ہے روکے سے ٭ ہر ایک دور میں لمحوں کا زاویہ ٹوٹا

بلا سے گر رہے یہ ناشُنیدہ ٭ مری مانو لکھوا اپنا قصیدہ

شبِ غم کاٹنے والوں سے پوچھو ٭ ہے کتنی شوخ صبحِ نو دمیدہ

کرو گے تم اسے نذرِ جنوں کیا ٭ قبائے زندگی خود ہے دریدہ

سنبھلنا اور بھی دشوار ہوگا ٭ مجھے کہتی ہے دنیا برگزیدہ

میرے علاوہ سارا زمانہ سراب تھا ؛ خود اعتماد ہونا بھی کیا عذاب تھا

میں اس سے زندگی کا پتہ پوچھتا بھی کیا ؛ جو صاحبِ نظر تھا وہی محوِ خواب تھا

محمد سعید اختر بنارسی
بنارس

نام: محمد سعید اختر۔ والد کا نام: مولوی محمد کریم مرحوم۔ پیدائش: ۳۰ر جون ۱۹۳۴ء وطن: بنارس۔ میرا سرمایۂ شاعری صرف بیس پچیس غزلوں پر مشتمل ہے۔ مجھے اپنے شاعر ہونے پر کوئی اصرار نہیں۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی خلش کبھی کبھی کسی نہ کسی تخلیق کا سبب بن جاتی ہے۔ این۔ای ریلوے کے ہیڈ کوارٹر (گورکھپور) میں کلرک کی خدمت پر مامور ہوں۔ نظریاتی طور پر ترقی پسند ہوں لیکن شدت پسند نہیں اس لئے قدامت اور جدیدیت کے کارناموں کا بھی معترف ہوں۔ یہ بھی لکھ دوں کہ میں ادب پر کسی سیاسی پارٹی کا غلبہ نامناسب سمجھتا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ادیب نظریاتی طور پر کسی سیاسی پارٹی کے قریب ہو لیکن اس کی چھاپ ایسی نہ ہو کہ ادب اچھا خاصا پروپیگنڈہ ہو جائے۔

وہ انقلاب کہ تھے کان جس کی آہٹ پر ؛ بہت قریب سے بچ کر گذر گیا ہے میاں

اِن آبلوں کی جلن سے قدم رُکے ہیں کہیں ؛ شکستہ پائی سے ذوقِ سفر گیا ہے میاں

اگرچہ دستِ ہوس کو ہے فوقیت حاصل ؛ مگر حضور کا چہرہ اُتر گیا ہے میاں

محمد احمد رمز
کانپور

نام محمد احمد۔ تخلص رمز۔ جائے پیدائش ستیلہ پور (یو۔پی)، تاریخ پیدائش ۴ر اکتوبر ۱۹۳۵ء تعلیم ہائی اسکول (۱۹۵۱ء) بہ سلسلۂ ملازمت ہمدرد دواخانہ دسمبر ۱۹۵۶ء تا مارچ ۱۹۶۲ء دہلی میں قیام رہا۔ پھر کانپور تبادلہ

ہوا اور اپریل ۱۹۶۰ء تا دسمبر ۱۹۷۰ء ہمدرد دی سے منسلک رہا۔ گزشتہ دو تین برسوں سے ایک معافی فروٹ اینڈ ویجیٹیبل کمیشن ایجنسی میں بطور کلرک ملازم ہوں۔ ۱۹۵۰ء سے باقاعدہ شعر کہہ رہا ہوں۔ شعر گوئی کے ضمن میں ہمیشہ جدید رہا ہوں۔ گمنام بھی ہوں اور گمراہ بھی، لیکن یہ گمنامی شہرت اور گمراہی منزل بن چکی ہے۔

آپکے جواب کا انتظار رہے گا۔ امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ نیاز مند

محمد احمد رمز

۲۸
۳
۷۸

پتہ: محمد احمد رمز معرفت حاجی ولی محمد، سبزی منڈی، کانپور (یو۔ پی)

سارے نقش بکھر جائیں گے تیز ہوا کا موسم ہے ٭ اُتنا نشیب و خم بھی دیدے جتنی خاک فراہم ہے

جیسے خلاء کے پسِ منظر میں رنگ رنگ کے نقش و نگار ٭ باتیں اسکی وزن سے خالی لہجہ بھاری بھرکم ہے

جیسے ٹیڑھی میڑھی شاخیں یکجا ہوں تو شجر کہلائیں ٭ چہرہ چہرہ کچھ بھی نہیں اسکا دیکھو تو وہ مجسم ہے

معنی و لفظ سے طرزِ دیاں تک رُندھ چکا ہوں محاذِ ہنر ٭ اب جو پتھر ہے پانی ہے جو تلوار ہے مرہم ہے

بتاؤں کیا مجھے بھی کچھ پتہ نہیں ٭ چھپا تھا کیا نظر سے کیا نظر میں ہے

بلند ہو رہی ہے سطحِ سیلِ خوں ٭ پناہ راستے میں اب نہ گھر میں ہے

مٹی نہیں سیہ لکیر زہر کی ٭ ابھی جو خوف چھت پہ تھا وہ در میں ہے

بکھر کے ذرہ ذرہ میں ہوں دشت میں ٭ سمٹ کے برگ برگ وہ شجر میں ہے

جیسے فلک بھی کوئی کھنڈر ہے نئی پرانی یادوں کا ٭ لگتے ہیں آسیب تماشہ کچھ گہرے کچھ ہلکے رنگ!

کیا کیا پیکر ڈھال دیئے ہیں سیلِ غبارِ تصور نے ٭ آنکھوں سے باتیں کرتے منظر دل کی تہوں کو چھوتے رنگ

میں اک قوسِ لوا ہوں میرا سلسلہ امکاں در امکاں ٭ منظر جاں سے پس منظر تک بول رہے ہیں بہتے رنگ

کیا وہ انعامِ بال و پر دے گا ∴ اک سفر اور اک سفر دے گا

تہی آغوش ہے حصارِ وجود ∴ یہ صدف کیا مجھے گہر دے گا

ماورائے قیود و سمت ہوں میں ∴ مجھ کو آواز وہ کدھر دے گا

انگلیوں کو لہولہان کرو ∴ تیشہ کیا دولتِ ہنر دے گا

وقت بے وقت دستکوں کا عذاب ∴ اور کیا مجھ کو میرا گھر دے گا

کرتے رہیے تبصرے گوش و دہن پر ∴ گزری جو گزری چراغِ انجمن پر

نطق بے آواز ہے ہر سانس میری ∴ حرف کیا بولیں مرے اظہارِ فن پر

پڑ گئی ہے اُس پہ کچھ اُفتاد ایسی ∴ رینگتا پھرتا ہے اپنے ہی بدن پر

کس قدر لمبی کہانی تھی لہو کی ∴ ختم ہو پائی نہ جو تیغ و کفن پر

زہر تھا گزرے اُجالوں کا نہ نکلا ∴ رات بھر کوڑے برسائے بدن پر

میانِ بندہ و معبود فاصلہ رکھنا ∴ تھکیں بھی ہاتھ تو گنجائشِ دعا رکھنا

گرے گا ٹوٹ کے سر پر یہ آسماں اک دن ∴ گرفتِ خوف سے خود کو مگر جدا رکھنا

کوئی بھی حرف نہ ابھرے نہ کوئی نقش بنے ∴ طلب کو گُنگ توجہ کو بے صدا رکھنا

تکلفاتِ عزیزاں سے ڈر گیا ہوں بہت ∴ مجھے مرے ہی انا خانے میں چھپا رکھنا

یہ کم نہیں کہ بنے موت اعتبارِ حیات ∴ وہ رمز گھر پہ جب آئے تو دل بڑا رکھنا

قدم بڑھے تو کہیں رہگزر میں کچھ بھی نہ تھا ∴ سوائے گردِ تعلق سفر میں کچھ بھی نہ تھا

ملا وجود ہی بکھرا پڑا تھا چاروں طرف ؛ فلک پہ کچھ بھی نہ تھا بحر و بر میں کچھ بھی نہ تھا

صدائے تیشہ تھی جو نقشِ جاوداں ٹھہری ؛ وگرنہ دامنِ سنگ و شرر میں کچھ بھی نہ تھا

مری صدا تو الگ ہی سنائی دیتی تھی ؛ یہ کیسی بھیڑ تھی اِس شور و شر میں کچھ بھی نہ تھا

ہمیں تھے عکسِ تماشہ ہر ایک منظر میں ؛ اُٹھے تو آئینۂ دشت و در میں کچھ بھی نہ تھا

بکھر اکھڑا تھا میں یارانِ کم شعار میں رمزؔ ؛ نگاہ جھپکی تو دستِ ہنر میں کچھ بھی نہ تھا

ناظمؔ خلیلی

رائچور

۳۰ دسمبر ۱۹۵۴ء کو نگینہ ضلع بجنور (یو پی) میں پیدا ہوا۔ سلسلۂ تعلیم ابھی جاری ہے، شاعری ۱۹۶۸ء سے اور نثر نگاری ۱۹۷۵ء سے کر رہا ہوں۔ میری شعری تخلیقات بیشتر رسائل میں شائع ہو چکی ہیں جن میں "شمع"۔ "تعمیر"۔ "شاعر"۔ "تحریک" وغیرہ شامل ہیں۔

آپ کا

ناظم خلیلی

۲۷ مارچ ۷۸ء

پگڈنڈیوں کے جال سے خود کو بچا گیا ؛ وہ راہرو جو اپنے ہی اندر چلا گیا

سارا بدن چراغ کی مانند جل اُٹھا ؛ خاشاک جان کر کوئی ماچس دکھا گیا

بہتے ہوئے خیال کی خوشبو اُڑی تو تھی ؛ لیکن کثیف گرد کا طوفان چھا گیا

آئی سحر ہتھیلی پہ سورج لئے ہوئے ؛ خوابوں کا چلتا چلتا فسوں لڑکھڑا گیا

سورج کی سب نے کر دی تھی تجویز مسترد ؛ اک بار پھر اندھیرا اُجالوں کو کھا گیا

رئیس مالیگانوی

مالیگاؤں

گھریلو ماحول نے نثار احمد نام دیا، جبکہ ادبی ماحول میں رئیس مالیگانوی کے نام سے بدنام ہوں۔ حضرت ادیب مالیگانوی سے رشتۂ تلمذ استوار کیا۔ جو ابھی تک برقرار ہے۔ جب شعلۂ فکر و احساس چنگاریاں بن کر بھڑکیں تو شعر و ادب کے تیور کچھ اور ہی تھے۔ اس تیور کے تیکھے پن اور اس کے مزاج کو سمجھتے ہوئے، خیال و فکر کے تانے بانے تیار کئے جس کا پہلا پیکر "اعراض" کے روپ میں چھپ چکا ہے۔

رئیس مالیگاؤں

ان کی تقدیر میں پیوند زمیں ہونا تھا ⁂ گرتی دیوار کو جو لوگ بچانے آئے

میدانِ کارزار میں شل ہوگئے تھے کیوں؟ ⁂ اُس کو تو اپنے ہاتھوں پہ بیحد غرور تھا

یوسف جمالؔ

راجگانگ پور

نام محمد یوسف اور تخلص جمالؔ ہے۔ ۱۱ فروری ۱۹۴۷ء میں عالم وجود میں آیا۔ ۱۹۶۲ء سے دنیائے ادب میں قدم رکھا، شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری، تنقید اور تراجم کی طرف بھی توجہ ہے۔ شعری مجموعے "سوکھے جزیرے کی دعا" زیر ترتیب ہے۔ ملکی اور غیر ملکی افسانوں کا اُردو مجموعہ ادارہ تعمیر نو کے زیر اہتمام آنے والا ہے۔ مضامین کا ایک مجموعہ ترتیب کی منزل پر ہے۔ ماہنامہ "جلوہ نما" بریلی، دو ماہی "شاخسار" کٹک ماہنامہ "پرواز" لدھیانہ اور ماہنامہ "سہیل" کی ادارت سے وابستہ رہ چکا ہوں۔ تادم تحریر "علم و دانش" سری نگر کا مدیر اعزازی ہوں۔ میری نگارشات آل انڈیا ریڈیو سری نگر کشمیر، آل انڈیا ریڈیو پٹنہ اور آل انڈیا ریڈیو دہلی سے مع ٹیلی ویژن نشر ہو چکی ہیں۔ فی الحال درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہوں۔

یوسف جمال
28.3.78

جس قدر دی جسم کو معتوض سانسوں کی زکات ⁂ کیا بتاؤں جسم اتنا ہی عذابوں میں رہا

تیرگی کرے کی اس صورت مٹانے دے مجھے ؎ ایک مٹھی دھوپ تو باہر سے لانے دے مجھے

میں تھا پہلے جھیل لیکن بات یہ پہلے کی ہے ؎ اب جو دریا ہوں تو ساگر میں سمانے دے مجھے

کیا تعارف ہو مرا اک رمز ہوں میں اور بس ؎ کون ہوں اور کیا ہوں پہلے خود کو پانے دے مجھے

جب نیا موسم کوئی آئے تو استقبال کو ؎ گیت خوشبو کے خزاؤں میں سنانے دے مجھے

کھوکھلا شہتیر بن کر گر پڑیں گے ایک دن ؎ یونہی دیمک کی طرح خود کو اگر چاٹا کریں

شکاری جہاں جال تانے رہیں گے ؎ وہیں پر ہلاکت کے دانے رہیں گے

جو چندن کی خوشبو ہے آباد مجھ میں ؎ تو سانپوں کے بھی تو ٹھکانے رہیں گے

یوسف گوہر

شاہجہاں پور

آج سے چالیس برس پہلے یعنی ۱۲ اپریل ۱۹۳۹ء کو کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ ننھی سی جان عہدِ شباب میں ایک ادیب و شاعر ہوگا۔ شاعری مجھے ورثہ میں ملی ہے میرے بڑے بھائی جناب جوہر شاہجہاں پوری، استاد الملک حضرت دلؔ شاہجہاں پوری کے شاگرد تھے اور ماموں صاحب فارسی کے ایک اچھے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ میں نے سن ۱۹۵۲ء سے دنیائے شاعری میں قدم رکھا اور چند سال کی کاوشوں کے بعد باقاعدہ شعر کہنے لگا۔ ملک کے اکثر و بیشتر جرائد میں میرے افسانے اور غزلیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ غزل کے علاوہ طنز و مزاح میں بھی دخل رکھتا ہوں۔ مخلص

یوسف گوہر شاہجہاں پوری

۲۶ مارچ ۱۹۷۸ء

میرا قاتل تو مجھی میں ہے نہاں دور نہیں ؎ تم عبث ڈھونڈ رہے ہو اُسے گھر گھر جا کر

اپنے مقصد کے لئے جھوٹ روا ظلم روا ٭ اور اپنے کو سمجھتے ہو پیمبر لوگو!

گوہر عثمانی

مراد آباد

نام محمد احمد عثمانی، تخلص گوہر، سکونت شمالی ہند کا مشہور شہر مراد آباد۔ تعلیم انگریزی، فارسی اور اردو، ذریعۂ معاش پچہری، کلکٹری مراد آباد میں ملازمت۔ شعر و ادب کا ذوق فطری۔ تقریباً پندرہ سال کی عمر سے کہنا شروع کیا، ہمیشہ غزل سے دلچسپی رہی۔ اِس وقت تک کم و بیش ایک ہزار غزلیں کہی ہیں۔ قطعات اور نظمیں بہت مختصر۔ مشہور غزل گو شاعر حضرت قمر مراد آبادی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ ہندوستان کے ادبی رسائل اور اخبارات میں بیشتر کلام شائع ہو چکا ہے۔ اکثر آل انڈیا ریڈیو سے بھی ادبی پروگراموں میں حصہ لیتا ہوں۔ اس وقت عمر کے باون سال اختتام پذیر ہو رہے ہیں۔ مجموعۂ کلام "سلکِ گہر" زیر ترتیب ہے۔

گوہر عثمانی

یوں بھی پرائی آگ میں جلنا پڑا مجھے ٭ ٹھوکر لگی کسی کے سنبھلنا پڑا مجھے

وہ دوست جن میں بوئے وفا نام کو نہ تھی ٭ کچھ دوران کے ساتھ بھی چلنا پڑا مجھے

فاروق شفق

کلکتہ

میری پیدائش شیراز ہند جونپور (یو۔پی) کے ایک چھوٹے سے موضع رانی منؤ میں ۱۲ جنوری ۱۹۴۵ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ ۱۹۵۶ء میں والد صاحب نے کلکتہ بلالیا۔ اس کے بعد ہائی اسکول سے یونیورسٹی تک کی ساری تعلیم کلکتہ ہی میں ہوئی۔ اسی یونیورسٹی سے ۱۹۷۲ء میں اردو ادب میں ایم اے کیا۔ اندنوں "اردو غزل میں علامت کی ابتدا اور اس کا ارتقاء" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کے لئے کام کر رہا ہوں۔ روزی روٹی کے لئے درس و تدریس کا شغل بھی جاری ہے۔
شاعری کا جہاں تک تعلق ہے میں نے باقاعدہ طور پر ۱۹۶۶ء میں شاعری شروع کی۔

ادبی دنیا سے روشناس کرانے کا سہرا "شب خون" کے سر ہے ۔اس وقت سے اب تک میری تخلیقات ہندستان کے تمام اہم رسائل وجرائد میں پابندی سے شائع ہو رہی ہیں ۔غزلوں کا پہلا مجموعہ "شہر آئندہ" کے نام سے دیا جا چکا ہے جو عنقریب شائع ہوگا ۔

مجروح شفق

دور سے دھوپ سی کہرے کو دکھاتے گذرا ٭ جو بھی گذرا وہ فقط ہاتھ ملاتے گذرا

دل میں دونوں کے بہت کچھ تھا مگر جانے کیوں ٭ جس قدر بھی تھا ملاتے ہنساتے گذرا

اس نے دیکھا ہی نہیں پاس کے آنگن میں کبھی ٭ اس کا تو وقت ہی دیوار اٹھاتے گذرا

مہر و اخلاص، رواداری، مروت، نیکی ٭ بس یہی قصۂ شفق پڑھتے پڑھاتے گذرا

غلاف بن گیا پہچان آدمی کی یہاں ٭ جسے بھی دیکھو وہ کچھ اوڑھ کر نکلتا ہے

چھپائے کوئی مگر سبز موسموں کا نشہ ٭ مچل اٹھے تو بدن توڑ کر نکلتا ہے

ہوا کی ان گنت آنکھیں ہوا کے ہاتھ ہزار ٭ وہ دیکھیں کیسے بچا کر نظر نکلتا ہے

جو ایک پل کو رکیں یہ پرند تو پوچھوں ٭ یہ روز روز کہاں کا سفر نکلتا ہے

کہرا اوڑھے اونگھ رہے ہیں خستہ مکاں ٭ آج کی شب بیمار دلوں پر بھاری ہے

کھلتے کھلتے تو بس کھلتی ہی جاتی ہے ٭ لڑکی ہے یا کپڑوں کی الماری ہے

انساں، پیڑ، مکان سبھی ہیں گرم سفر ٭ جانے کہاں کی سب یہ تیاری ہے

محمد غلام رسول اشرف
ناگپور

میں بہت کم جانا پہچانا شاعر ہوں۔ کبھی کبھی میری تخلیقات رسائل میں شائع ہو جاتی ہیں۔ "رقیب" اردو ویکلی کا میں کا دیر اعزازی اور "اردو سبھا" ناگپور کا سکریٹری ہوں۔

دستخط

اس طرح ترا عکس بھی ہو جائیگا ناپید ٭ پتھر نہ چلا دیکھ میں شیشے کا مکاں ہوں

ہنستے ہوئے لمحوں کے تعاقب میں چلا تھا ٭ اے کاش بتا سکتا کہ میں آج کہاں ہوں

ساحل احمد
الہ آباد

خشک پتے ڈالیوں سے ٹوٹ کر ٭ اپنے سارے تجربے پی جائیں گے

اب کہاں شام، کہاں وہ چہرے ٭ چھپ گیا ریت کو لے کر پانی

خورشید افسر
سیتاپور

نام: سید خورشید افسر تخلص افسر۔ ۱۶ مارچ ۱۹۴۱ء بروز شنبہ ضلع سیتاپور کے مشہور قصبہ بسواں میں پیدا ہوا۔ اب تک نظم و نثر میں میری تقریباً ایک درجن تصانیف و تالیفات شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ میونسپل بورڈ بسواں کا سابق وائس پریسیڈنٹ اور اتر پردیش [illegible] کا ممبر ہوں۔ یوپی تعلیمی کمیٹی کا مشیر رہ چکا ہوں۔ شاعری میں میں کسی جماعت یا گروہ بندی کا قائل نہیں ہوں۔

خورشید افسر

جب زندگی سے مجھکو بہت پیار ہوگیا ⁂ میرا وجود سایۂ دیوار ہوگیا!

سوچا تھا پھیل جاؤں گا خورشید کی طرح ⁂ میں اپنے ہی بدن میں گرفتار ہوگیا

گلزار و دشت ایک ہوئے جا رہے تھے آج ⁂ خوشبو کا عکس بیچ کی دیوار ہوگیا

لمحات کی کراہ بڑی دلخراش ہے ⁂ ذہنوں کے ساتھ وقت بھی بیمار ہوگیا

احباب کا خلوص کچھ اتنا لطیف تھا ⁂ اکثر میں اپنے آپ سے بیزار ہوگیا

اقبرؔ کوئی کسی کو یہاں جانتا نہیں ⁂ کتنا بلند شہر کا معیار ہوگیا

ہندی گورکھپوری

شیخ پور

نام: محمد وحید اللہ انصاری ۔ پیدائش: جولائی ۱۹۱۷ء ۔ مقام: شیخ پور، گورکھپور ۔ اردو فارسی کی تعلیم والد بزرگوار شیخ محمد کریم اللہ سے حاصل کی ۔ ۱۹۳۲ء میں بنارس ہندو یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا ۔ کلکتہ میں علامہ عبدالجبار حیدری کے اصرار پر روزنامہ "زمانہ" کے ادارہ کی رکنیت قبول کی ۔ ۱۹۴۲ء میں فیض آباد میں فوجی محکمۂ تعلیم میں میر منشی کے عہدے پر فائز رہا ۔ قومی نظموں کا مجموعہ "قفس سے آشیانہ تک" شائع ہو چکا ہے جس پر اردو اکیڈمی اترپردیش کا انعام ملا ہے ۔ "ہندی اردو سنگم لکھنؤ" کی طرف سے قومی شاعری ایوارڈ بھی مل چکا ہے ۔ مستقل قیام گورکھپور ہی میں ہے ۔ میرے متعلق محبی مجروح صاحب سے اور حالات معلوم ہو سکتے ہیں ۔

ہندی

بادِ صبا بھی ہو کے بہت تند خو چلی ⁂ جب میں چلا تلاش چلی جستجو چلی

پھینکنا ہے مجھے ظلمت کے خداؤں کی طرف ⁂ مجھ کو اک سنگ "ہمالہ" کے برابر دیدے

کچھ ایسا ربطِ خاص زمانے کو مجھ سے تھا ⁂ ہر گفتگو کے ساتھ مری گفتگو چلی

محمد حسن بھائی

ناگپور

میری پیدائش سنہ [illegible]ء کو ناگپور میں ہوئی۔ فی الحال سائنس کا طالب علم ہوں۔ غزلیں کم اور متفرق نظمیں زیادہ کہتا ہوں۔

محمد حسن بھائی

آگے جانے کس رستے سے مل جائیں ٭ کیا ہے بھروسہ ان انجانے رستوں کا

کس پر چھیٹو گے اور کس کو جکڑو گے ٭ سائے ہیں سب اور یہ دیس ہے سایوں کا

اظہر شکیل

اورنگ آباد

میں نے ۱۹۵۵ء میں ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں آنکھ کھولی۔ لکھنے کا شوق ۱۹۷۱ء سے جاری ہے۔ اکثر غزلیں اور مضامین مختلف اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

اظہر شکیل

[illegible] ہے ٭ وہ رستہ میرا رستہ دیکھتا ہے

[illegible] کیسے ٭ کہیں اندھا بھی شیشہ دیکھتا ہے

[illegible] دھوپ کا کرنا ہے اظہر ٭ تو کیوں رستہ میں سایہ دیکھتا ہے

شکیل شاعر

رامپور

میرا پورا نام شکیل احمد خاں ہے۔ تخلص شاعرؔ کرتا ہوں۔ رامپور کی سرزمین پر پیدا ہونا میرے لئے باعث فخر ہے رامپور اردو ادب کا تیسرا اسکول مانا جاتا ہے۔ قانون کے سال دوم کا طالب علم ہوں۔ میرے یہاں فارمنگ ہوتی ہے۔ گھریلو زندگی کو خوشگوار بنانے میں فارمنگ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مخلص شکیل شاعر

وقت آیا جلا دیا مجھ کو ⁂ وقت گزرا بجھا دیا مجھ کو
ضرب لگنے سے ٹوٹ جاؤں گا ⁂ آئینوں میں سجا دیا مجھ کو

اظہار عابد

کانپور

اصلی نام سید آل رسول المتخلص اظہار عابد، تاریخ پیدائش ۱۹۲۶ء ہے۔ عربی اور اردو کی ابتدائی تعلیم و تربیت والدین کی بے پایاں شفقت و نگرانی میں حاصل کی۔ استعداد فی الحال میٹرک، ادیب اور ادیب ماہر تک ہے۔ آجکل میں نگر ہا پالیکا بیسک شکشا وبھاگ میں اردو مدرس کی حیثیت سے فائز ہوں۔

اظہار عابد بقلم خود
۱۸ اپریل ۱۹۷۸ء

گرا چٹان پہ ہمراہ منظروں کے تمام ⁂ وہ آئینہ کہ جو پرچھائیوں کا خرمن تھا
مرے بدن کی جو دیمک بنا رہا برسوں ⁂ پتہ چلا کہ وہ اپنا ہی تھا دشمن تھا
میں پاک ظرف تماشائے داغ بنکے رہا ⁂ وہ تا تلوں میں بھی رہ کر سفید دامن تھا

لمحوں کی سرخ و زرد ہوائیں عجیب تھیں ⁂ رنگوں میں بانٹنے کی سزائیں عجیب تھیں!
بے چہرہ گردنوں کو لئے پھر رہے تھے لوگ ⁂ رکھی یہ تھیں جواز خطائیں عجیب تھیں!
بے نور آسمان تھا بے رنگ تھی زمین ⁂ ہونٹوں پہ تھرتھراتی دعائیں عجیب تھیں!
یوں ہی پکار اٹھا تھا پہاڑ وں کے درمیاں ⁂ ٹکرا کے جو بھی آئیں صدائیں عجیب تھیں!
ہر یاد رفت رنگ پہ عابد تھا اختیار ⁂ موسم کی مشعلوں میں بلائیں عجیب تھیں!

صبا جائسی

جائس

نام - کبیر احمد جائسی - تاریخ پیدائش - ۱۶ ر نومبر ۱۹۳۶ء - وطن و جائے پیدائش - قصبہ جائس ضلع رائے بریلی (یو - پی) - تعلیم - ایم - اے (فارسی) پی ایچ ڈی - علیگ - پیشہ - لکچرر فارسی - شعبۂ مطالعات علوم اسلامیہ و عربیہ ایرانیہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی -

مطبوعات (طبع زاد) ۱ - نقوشِ فانی، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۵۸ء (۲) صحرا صحرا، کتاب گھر علی گڑھ ۱۹۶۹ء (۳) بازگشت، مکتبۂ جامعہ دہلی ۱۹۷۵ء — تراجم (۱) تاریخی اور علمی مقالات، مکتبۂ برہان دہلی ۱۹۷۶ء (۲) تاریخ ادبیاتِ تاجیکستان، انجمن ترقی اردو ۱۹۷۷ء — ترتیب (۱) درس فارسی، کتاب گھر علی گڑھ ۱۹۶۷ء (۲) مولانا عبد السلام ندوی کی یاد میں، شبلی کالج اعظم گڑھ ۱۹۵۹ء -

صبا جائسی

مجھے یونہی اُلجھا ہوا چھوڑ دو ؛ حکایاتِ قدرت نفسا چھوڑ دو

ہواؤ مرا راستہ چھوڑ دو ؛ کہاں تک چلوگی خلا در خلا

سرِ شام مجھ کو بجھا چھوڑ دو ؛ یہاں کون ہے کس لئے میں جلوں

جو پردا گرا ہے گرا چھوڑ دو ؛ کرو کچھ تو اب خیرہ چشمی پہ رحم

نظام الدین نظام

بمبئی

بوڑھے برگد تک چلیں، پرچھائیں کا سودا کریں ؛ چلچلاتی دھوپ میں کیوں بے سبب جھلسا کریں

اپنے اندر اب اسی خوددار کو پیدا کریں ؛ اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹا تھا جس انسان کا

اور پھر ماتم اُسی انسان کا برپا کریں ؛ شب کے سناٹے میں اس کو قتل کر دیں دوستو

رشید عبدالسمیع جلیل

حیدرآباد

طوفان اٹھ رہا تھا سمندر میں دور تک ٭ ساحل کی نرم ریت پہ ٹھنڈک لہو کی تھی

آنکھیں بچھا رہا تھا کہ منظر گذر گیا ٭ گردش مری نگاہ میں اپنے لہو کی تھی

بے چہرہ ساعتوں کا سفر کیا عذاب تھا ٭ تم چپ تھے اور مجھ کو خلش گفتگو کی تھی

رشید امکان

اُجین

ڈاکہ پڑا ہو جیسے کوئی رات گاؤں میں ٭ سہمے ہوئے ہیں ایسے مکانات گاؤں میں

آ میں تجھے یہاں سے کہیں اور لے چلوں ٭ پیلے نہ ہو سکے تیرے مرے ہاتھ گاؤں میں

گاگر نہ چھو سکیں گے تیرے ہاتھ پھر کبھی ٭ جس روز پھیل جائے گی یہ بات گاؤں میں

کیوں پا رہا ہوں خود کو چتا پر رکھا ہوا ٭ شاید کسی کی آئی ہو بارات گاؤں میں

واجد قریشی

اُجین

خون میں لتھڑے ہوئے رشتوں کا اثر دیکھ ابھی ٭ ہر ہتھیلی پہ نظر آئے گا سر دیکھ ابھی

آ ہی جائے گا کوئی پل میں وہ مشعل لے کر ٭ سب کے کھل جائیں گے پھر عیب و ہنر دیکھ ابھی

اغوا کر لیگی کوئی ساعتِ یک رنگ ہمیں ٭ سرد ہو جائیں گے سانسوں کے نگر دیکھ ابھی

اپنے سائے سے ہی خود اپنا تحفظ کر لے ٭ دھوپ کے قہر میں دیوار نہ در دیکھ ابھی

وہ اذیت ناک سا اِک مرحلہ دے تو گیا ÷ صاعقہ در صاعقہ اِک حوصلہ دے تو گیا

[illegible] فیصلہ ہوتا ÷ زمیں ہماری مگر سانپ تھے دفینوں پہ

مطرب بلیاوی

بلیا

زخمِ تازہ کی مہک بند کتابوں میں کہاں ÷ میرے اشعار کی تفسیر حجابوں میں کہاں

میرے افکارِ گراں بار نہ اُٹھ پائیں گے ÷ جرأتِ فکر و نظر آپ کے نصابوں میں کہاں

زندگی جس سے تھی منسوب بعنوانِ حیات ÷ کھو گیا جانے وہ پیکر میرے خوابوں میں کہاں

داغ ہی داغ ہیں چہروں پہ جبینوں پہ دھواں ÷ تم چلے آئے ہو اِن خانہ خرابوں میں کہاں

پگھلتے وقت کے منہ میں بھی اب زباں رکھیے ÷ کوئی تو جنگ فضاؤں کے درمیاں رکھیے

زمیں تلووں کی ایسا نہ ہو کھسک جائے ÷ ذرا سلیقے سے مٹھی میں آسماں رکھیے

سمٹ کے تلخ حقیقت نہ کوئی رہ جائے ÷ کشادہ اور ابھی دل کی داستاں رکھیے

جھلس رہا ہوں کہ تپتی ہوئی فضائیں ہوں ÷ میرے وجود پہ نظروں کا سائباں رکھیے

جدید ذہنوں کا معیار کون پرکھے گا ÷ خوشا نصیب ہیں یونہی رائیگاں رکھیے

بدل ہی جائیگا مطرب نئے ادب کا مزاج
زباں کو حسنِ تکلم کا رازداں رکھیے

قطب سرشار

محبوب نگر

میرا نام ماں باپ نے قطب الدین رکھا ادبی دنیا قطب سرشار کے نام سے جانتی ہے۔ پیشۂ تدریس سے وابستہ ہوں۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے ایم اے کی ڈگری لی ہے۔ بنیادی طور پہ شاعر ہوں مگر افسانے مضامین اور ڈراما بھی لکھے ہیں۔ اوری زبان اردو کے علاوہ تلگو میں بھی لکھتا ہوں۔ اب تک تلگو کے تین شعری مجموعوں ایک ناولٹ اور ایک افسانوی مجموعے کا ترجمہ کیا ہے۔ اظہر آفسر کے ایک ڈرامہ کا تلگو میں ترجمہ کیا ہے۔

قطب سرشار

بارِ گراں اٹھانا تھا پتھر اُٹھا لیئے ✤ درپن ہے سامنے ذرا خود کو سنبھالیئے

موجوں کا اضطراب ہمیں اتنا بھا گیا ✤ ساحل پہ ہم نے چند گھروندے بنا لیئے

برگد کا پیڑ اور گیا بھی وہی ہے آج ✤ گوتم کے بدلے مٹی کے پیکر بنا لیئے

یوں گھومتے ہیں سڑکوں پہ فرعون بے خطر ✤ جیسے خدا نے سارے صحیفے اٹھا لیئے

عالم غازیپوری

علی گڑھ

نام: محمد عالمگیر، تخلص: عالم۔ ضلع غازیپور (یو پی) کے موضع فخن پورہ میں پیدا ہوا عمر ۲۵-۲۶ درمیان ہوگی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طب (بی یو ایم ایس) کے آخری سال میں ہوں۔

خیر اندیش   محمد عالمگیر عالم غازیپوری

اشکِ خوں اس طرح ٹپکتے ہیں ✤ جیسے تارے گرا رہی ہے آنکھ

ہم سے سب کچھ چھپا رہے ہو تم ✤ پھر بھی سب کچھ بتا رہی ہے آنکھ

سارے عالم میں شام ہوتی ہے ✤ اک حسینہ جھکا رہی ہے آنکھ

اسلم حمیدی

جبلپور

نام: عبدالسلام ۔ تخلص: اسلم ۔ قومیت: انصاری ۔ میں ۱۹۳۹ء میں جبلپور کے ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا ۔ مجھے اُردو، عربی کے علاوہ حسبِ ضرورت فارسی میں دخل ہے ۔ قبلہ الحاج منشی حمید اللہ صاحب حمید سے شرفِ تلمذ کی بناء پر اسلم حمیدی پکارا جانا پسند کرتا ہوں ـــــ خادمِ ادب

اسلم حمیدی

وہ شخص آج ڈھونڈ رہی ہے جسے نگاہ ⁂ مدت ہوئی ہواؤں کا رُخ موڑتا رہا

تحقیق میں نے کی تو ملا آج یہ پتہ ⁂ میرا ہی خون مجھ پہ ستم توڑتا رہا

سرور عثمانی

گیا

والدین کا رکھا ہوا نام سرور جاوید کچھ عجیب سا ہے ہیں نے از سرِ نو اپنا نام سرور عثمانی رکھ چھوڑا ہے ۔ ۱۶ر جولائی ۱۹۴۶ء میری پیدائش کا دن ہے ۔ یونین بینک آف انڈیا کا ملازم ہوں ۔ تقریباً پندرہ سالوں سے شعر کہنے کی کوشش کر رہا ہوں پھر بھی قدرے غیر معروف شاعر ہوں ۔ ابھی تک کسی بھی ادبی گروپ سے وابستہ نہیں ہو سکا ہوں ۔

سرور عثمانی

ادب کلا سے کانا ہے ⁂ تجریدی افسانہ ہے

شعر اچھے کہہ سکتا تھا ⁂ شاعر بہت پرانا ہے

عالی، اعلیٰ ہے علوی ⁂ نام سے وہ فرزانا ہے

پر پھیلانے کی ہے دیر ⁂ مرغا، مرغی، دانا ہے

ہم بھی بگلا بھگت نہیں ⁂ وہ بھی گھاگ پرانا ہے

پاشی جی ہشیار رہو ⁂ علوی بڑا سیانا ہے

لکھ دو سرور ایک غزل ⁂ چوپالوں میں گانا ہے

اتیج تصوّر

چنڈی گڈھ

صبح کا تارا کب جاگے گا، کب سوئیگی کالی رات ٭ ابھی تو زخموں کی بارش میں ریت بسا کھر ہے دل کی بات
کس کی کھوج میں پھرتے پھرتے سدھ بدھ بھی کھو بیٹھے ہیں ٭ وقت کی انجانی نگری میں بیت چلے جیون کے دن رات
اپنی آنکھوں کے بستر پر کس کیلئے اب پھول چُنوں ٭ سپنے سفر سے کب لوٹے ہیں کب بنتی ہے بگڑی بات
سپنا تو پھر سپنا ٹھہرا، نیند کی جھلک بھی نہ ملی ! ٭ بے کل آنکھیں دیکھ کے مل دی کیا گوری کیا کالی رات
میں نے اک اک شعر میں اپنے، درد کی گرہیں کھولی ہیں ٭ پھر بھی تصوّر یوں لگتا ہے، دل کی رہی دل میں بات

اجلال مجید

بھوپال

جان نثار اختر مرحوم کے ہم زلف ہیں۔ بھوپال کے ایک کالج میں پروفیسر ہیں۔

کوئی مندر، کوئی مسجد، کوئی میخانہ ہے ٭ گردشِ وقت ذرا سُن مجھے سستانا ہے
محبسِ زیست سے باہر ہیں مناظر کیا کیا ٭ روزنِ زخم کرو وا جو انھیں پانا ہے
پاؤں مٹی میں جمے ہونے کا مطلب پیڑ و ٭ برگِ گم کردہ سرِ شاخ ہی پا جاتا ہے
درو دیوار و ستوں سب کے نابود ہوئے ٭ عافیت سے ہے اگر کچھ تو وہ تہہ خانہ ہے
اک ذرا سوچ بیاباں کی اس آندھی میں ٭ یہ تمنا کیلئے مرا کیا ترا چلا جاتا ہے

ندرت نواز

امروہہ

میری پیدائش امروہہ میں ۹ جولائی ۱۹۴۰ء کو جولائی کے مہینے میں ہوئی ۔ یہاں کی آئے دن کی ادبی محفلوں اور تنقیدی پروگراموں نے میرا رجحانِ طبع شاعری کی طرف موڑ دیا اور ۱۲ سال کی عمر سے ہی شاعری کا آغاز ہوگیا ۔ اُستاد کوئی نہیں ہے ۔ ہندستان اور پاکستان کے سبھی اہم اور معروف جرائد میں میری منظومات شائع ہوتی رہی ہیں ۔ آل انڈیا ریڈیو دلّی کی اُردو مجلس سے اکثر میرا کلام نشر ہوتا ہے ۔ اس وقت ٹیکس انسپکٹر کی حیثیت سے سرکاری ملازم ہوں ۔ مجھے آواز کے فن سے بھی گہرا شغف ہے ۔ فنِ موسیقی کو اپنی روح محسوس کرتا ہوں ۔

ندرت نواز

پہلے خود کو جلائے گا سُورج ⁂ پھر کہیں جگمگائے گا سُورج

لمحہ لمحہ کرے گا ایک جتن ⁂ اور صدیاں بنائے گا سُورج

میرے آنسو نہ پی سکا اب تک ⁂ یوں تو دریا سکھائے گا سُورج

بہتے پانی میں جھانک لینے دو ⁂ خود بخود ڈگمگائے گا سُورج

زُلف لہرا کے مت چلو دن میں ⁂ راستہ بھول جائے گا سُورج

چل کے نُدرت نواز کے گھر تک ⁂ جانے کس روز آئے گا سُورج

نظمی صدیقی سلونوی

بارہ بنکی

سلون، ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوا ۔ گورکھپور میں تعلیم حاصل کی اور ۱۹۵۲ء سے بارہ بنکی میں مستقل طور پر اقامت پذیر ہوں ۔ ابتداء میں کچھ غزلیں، نظمیں لکھیں لیکن جلد ہی افسانہ نگاری اور مقالہ نویسی کی طرف مائل ہوگیا ۔ "زلزلے" "خوشامد" ، "دوسرا رخ" اور "وہ کون ہے" نام کے چار ناول بھی لکھے جس میں صرف "زلزلے" طبع ہوا ۔ پھر ۱۹۶۲ء سے باقاعدہ شاعری کر رہا ہوں ۔ دن بھر پڑھتا پڑھاتا ہوں ۔ شام کو مطب کرتا ہوں ۔ فرصت ملی تو شعر و شاعری سے بھی شغل کر لیتا ہوں ۔ اس میں میرا ذوقِ سلیم میرا صحیح رہنما ہے ——

نظمی صدیقی

اس سے پہلے کہ گنو تیر و تبر کتنے ہیں ٭ یہ بھی دیکھو کہ مرے جسم پہ سر کتنے ہیں

ہم نے جب شہر کے سب شیش محل گن ڈالے ٭ تب یہ معلوم ہوا دست ہنر کتنے ہیں

ایک مجہول جریدے پہ لکھا دیکھا ہے ٭ ہم سے میدان صحافت میں نڈر کتنے ہیں

اپنے اُجڑے ہوئے بے نام سے اک گھر کے سوا ٭ میں نہیں جانتا اللہ کے گھر کتنے ہیں

شب کو مر جاتے ہیں جی اُٹھتے ہیں پھر صبح کو ہم ٭ ہم ہی کچھ سمجھے ہیں دنیا میں امر کتنے ہیں

یوں تو اس عہد میں فنکار بہت ہیں تنظیمؔ ٭ فیصلہ کون کرے اہل ہنر کتنے ہیں

شمیم قاسمی

سہسرام

میں نے اپنی ادبی زندگی کا سفر کہانیوں سے شروع کیا۔ میری چند ابتدائی کہانیاں "رگ سنگ"، "مورچہ"، "پیکر"، "بیسویں صدی"، "صبح نو"، "تحریک"، "آجکل" وغیرہ میں شائع ہوئیں لیکن بنیادی طور پر میں نے صنفِ شاعری سے خود کو بہت قریب پایا۔ میں اب تک ادبی سطح پر کسی بھی گروپ بندی کا شکار نہیں رہا ہوں۔ میرا پہلا شعری مجموعہ "بے رنگ موسم" زیرِ ترتیب ہے۔

شمیم قاسمی ۔۔۔

تو نور ہے تو کبھی سامنے مجسّم آ ٭ کہ ہو رہے ہیں چراغِ لہو بھی مدھم آ

فصیلِ وقت کے نقش و نگار ہی تو نہیں ٭ حروفِ دل بھی مٹے جا رہے ہیں مبہم آ

شگفتگی کی رمق اب کہاں درختوں پر ٭ ہے کائنات پہ حاوی خزاں کا موسم آ

پیام صبح یہاں معتبر ذرائع سے ٭ لہو لہو ہے ابھی داستان آدم آ

کسی بدن پہ نہیں ہے یقین کا چہرہ ٭ بہ چار سمت ہے بے چہرگی کا ماتم آ

قیس رامپوری

نئی دہلی

۲۲/۴ سال سے کسی بھٹکے ہوئے خانہ بدوش کی طرح میرا شعری سفر جاری ہے۔ ۲۰ سال قبل اپنے اُستاد شاد عارفی مرحوم کی قربت اور ترقی پسند مصنفین کی تحریکات سے اس درجہ متاثر ہوا کہ آج تک انھیں نظریات و احساسات کا اسیر بنا ہوا ہوں۔

قیس رامپوری

حالات بدل دیتے ہیں ہاتھوں کی لکیریں ٭ کیوں دست شناسوں کا پتا پوچھ رہا ہے

خوابوں کے دریچے بھی تو ویران پڑے ہیں ٭ جب سے مری راتوں کا خدا روٹھ گیا ہے

ہوں جیسے اجالوں کے تعاقب میں اندھیرے ٭ ہر جسم کسی جسم کو یوں ڈھونڈھ رہا ہے

اس عہد کے فنکار کو کیا ہو گیا اے قیسؔ ٭ خود تشنہ ہے اور سب کو لہو بانٹ رہا ہے

لطیف جعفری

مالیگاؤں

زمانۂ طالب علمی سے ہی نثر نگاری کی طرف رجحان رہا۔ کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۹۶۰ء سے شعر و سخن میں بھی کچھ کہنے کی کوشش کی۔ اسی برس انجمن نوجوان مصنفین کی بنیاد چند قلمکار دوستوں کے اشتراک سے ڈالی اور یہی انجمن ۱۹۶۷ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے روپ میں تبدیل ہوئی جس کا گزشتہ کئی برسوں سے سیکریٹری ہوں۔

مخلص
لطیف جعفری
27/3/78

اُمید کی جھکتی چٹانوں کا سلسلہ ٭ اِک گہری دُھند میں کے مجھے بھی نگل گیا

اُس شہر میں مجھے کوئی اپنا نہ کہہ سکا ٭ جس شہر کے لئے میں کوئی اجنبی نہ تھا

احساسِ غم کی دھوپ سے بچنے کے واسطے ٭ کچھ دیر دھوپ میں وہ کھڑا سوچتا رہا

سعادت نظیر

حیدرآباد

حیدرآباد (اے پی) کے ایک قدیم محلہ سلطان شاہی کے بسنے والے "یوسف زئی" گھرانے میں آنکھ کھولی تو "محمد سعادت اللہ خاں" تاریخی نام پایا لیکن گھر والے "نذیر پاشا" پکارنے لگے اور ادبی حلقوں میں سعادت نظیر کے نام سے روشناس ہوا۔ ۱۲ر اگست ۱۹۴۷ کی صبح کو اپنی عمر کے اکاونویں مرحلے کا آغاز ہوا۔ ایم اے۔ بی ایڈ ہوں۔

چمن میں، دشت میں، تاروں کے بن میں ؛ بچاؤں دل کو کس کس انجمن میں
مجھے محسوس ہوتی ہے تری بو ؛ نہ جانے کیوں گلوں کے پیرہن میں؟
تری نسبت سے پیدا ہو گئی ہے ؛ حلاوت تلخیٔ کام و دہن میں

شمیم طارق

بمبئی

حروفِ تہجی ہیں بے حس لکیریں ؛ ادھورا کسی رسمِ خط کی طرح میں
مری خواہشیں ہیں سمندر سمندر ؛ اسے چیرتا ایک بط کی طرح میں

محمد علی تاج

بھوپال

اٹھیں اور ان کے خط ہی دیکھ ڈالیں ؛ جنھیں دیکھا نہیں دو اک برس سے

جاوید

انچارج اردو سیکشن آل انڈیا ریڈیو، بمبئی

خواب آنکھوں سے کیوں بچھڑتے ہیں + سارے افسانے پاؤں پڑتے ہیں
گرد ین کر زمیں سے اٹھتی ہے ؛ ہم بھی کیسی ہوا سے لڑتے ہیں

زندگی میں عذاب آئے گا ٭ گھر کے بچّوں کو خواب پڑتے ہیں
میری خاموشیوں کے دامن میں ٭ اُس کے ہونٹوں سے پھول جھڑتے ہیں
دُور ہوتے ہوئے قدموں کی خبر جاتی ہے ٭ خشک پتّے کو لیے گردِ سفر جاتی ہے
رات آجائے تو پھر تجھ کو پکاروں یارب ٭ میری آواز اجالے میں بکھر جاتی ہے
پاس آتے ہوئے لمحات پگھل جاتے ہیں ٭ اب تو ہر چیز دبے پاؤں گزر جاتی ہے
دیکھو ہم سے گذارش ہے یہاں مت آؤ! ٭ اس بڑے شہر میں تنہائی بھی مر جاتی ہے
اور تو کچھ نہ ہوا جی کا زیاں بھول گیا ٭ میں بہت سوچنے والوں کی زباں بھول گیا

پی۔این۔ رنگین

بمبئی

رنگین صاحب پُرانے صحافی اور شاعر ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں لاہور سے روزنامہ "ایوننگ نیوز" نکالا کرتے تھے۔ پھر وہیں سے ہفتہ وار "کیلاش" جاری کیا۔ ۱۹۴۸ء میں کلکتہ آئے اور ماہنامہ "کسوٹی" جاری کیا۔ پچھلے کئی برسوں سے راما نند ساگر صاحب کے ساتھ ہیں۔

حکایتِ دلِ محزوں سنا نہیں سکتا ٭ میں اپنے غم کو فسانہ بنا نہیں سکتا
گماں ہوتا نہ کسی کو میری محبت کا ٭ زباں پہ نام بھی اس بُت کا لا نہیں سکتا
ہے اُنکی یاد تو اب خواب میں بھی دامن کش ٭ اب اس کی یاد سے دامن چھڑا نہیں سکتا
یہ آگہی نہیں جو راستے بدل لے گی ٭ کبھی جنوں کا قدم ڈگمگا نہیں سکتا
میں کس طرح غمِ دوراں کو بھول سکتا ہوں ٭ اگر مجھے غمِ دوراں بھلا نہیں سکتا
وہ دِل کو دل سے بھلا کیا ملائیگا رنگین ٭ نظر نظر کو بھی جو نظر سے ملا نہیں سکتا

ڈاکٹر وحید اختر

علیگڑھ

کئی کتابوں کی ہے اک کتاب آنکھوں میں ٭ کوئی سوال کرو ہے جواب آنکھوں میں

نہ مے کشی ہے گوارا انھیں نہ زہد پسند ٭ عفیف ان کی نظر اور شراب آنکھوں میں

ہمیں بھی ہے یہ تمنا کسی کو سجدہ کریں ٭ کوئی بچے بھی تو خانہ خراب آنکھوں میں

اگر ہیں روح و بدن ایک یہ دوئی کیوں ہے ٭ ادا ادا ہے بلا و عتاب آنکھوں میں

وصالِ جسم سے یہ فاصلہ نہ طے ہو کبھی ٭ نگاہ پردہ ہے یاں واں حجاب آنکھوں میں

کبھی برہنگیِ جسم خود حجاب بنے ٭ کبھی تمام بدن بے حجاب آنکھوں میں

جو اشک آنکھوں سے اُن کی گرے وہ گوہر ہیں ٭ نہ گر سکے تو ہنسیں آفتاب آنکھوں میں

کسی کی ایک نظر میں سمٹ گیا ہے جہاں ٭ زماں و مکاں کی کھنچی ہے طناب آنکھوں میں

شکست و فتح، نشاط و الم، وصال و فراق ٭ لکھا ہے عمر کا سارا حساب آنکھوں میں

وحیدؔ لائیے ایمان کافر آنکھوں پر ٭ خدا ملے گا ان ہی بے نقاب آنکھوں میں

جس کو مانا تھا خدا، خاک کا پیکر نکلا ٭ ہاتھ آیا جو یقیں وہم سراسر نکلا

اک سفر دشتِ خرابی سے سرابوں تک ہے ٭ آنکھ کھولی تو جہاں خواب کا منظر نکلا

کل جہاں ظلم نے کاٹی تھیں سروں کی فصلیں ٭ نم ہوئی ہے تو اسی خاک سے لشکر نکلا

تھی تہی دست ہر اک شاخ خزاں تھی جب تک ٭ فصلِ گل آئی تو ہر شاخ سے خنجر نکلا

خشک آنکھوں سے اٹھی موج تو دنیا ڈوبی ؛ ہم جسے سمجھے تھے صحرا وہ سمندر نکلا
دشتِ بے حاصلیِ عمرِ تمنا کفِ خاک ؛ بحرِ وحشت کے لیے بوند سے کم تر نکلا

دو .یاں سنگ کو بھی شمع بنا دیتی ہیں ؛ چھو کے دیکھا تو جو دل موم تھا پتھر نکلا

زیرِ پا اب نہ زمیں ہے، نہ فلک ہے سر پر ؛ سیلِ تخلیق بھی گرداب کا منظر نکلا

گم ہیں جبریل و نبی، گم ہیں کتاب و ایماں ؛ آسماں خود بھی خلاؤں کا سمندر نکلا

غمِ انساں کی رسالت پہ ہوئے ہم فائز ؛ اپنی ہی شاخِ سخن پر یہ گلِ تر نکلا

عرش پر آج اترتی ہے زمینوں کی وحی ؛ کرۂ خاک ستاروں سے منور نکلا

ہر پیمبر سے صحیفے کا تقاضا نہ ہوا ؛ حق کا یہ قرض بھی نکلا تو ہمیں پر نکلا

گونج اٹھا نغمۂ کن وشتِ تمنا میں وحید ؛ پائے وحشت حدِ امکاں سے جو باہر نکلا

ہم جو ٹوٹے تو غمِ دہر کا پیمانہ بنے ؛ خاک میں مل کے بھی خاکِ رہِ میخانہ بنے

کون اس بزم میں سمجھے گا غمِ دل کی زباں ؛ بات چھوٹی سی جب افسانہ در افسانہ بنے

سنگ اندازوں سے اونچا ہے بہت اپنا مقام ؛ ورنہ ممکن تھا نشانہ سرِ دیوانہ بنے

زندگی ہم ترے اتنے تو خطاوار نہ تھے ؛ کہ جسے اپنا بنائیں وہی بیگانہ بنے

اک تمنا کوئی ایسا تو بڑا جرم نہ تھی ؛ آنکھ تا رگ چھلکتا ہوا پیمانہ بنے

نوٹ :- وحید اختر صاحب غزل کے منفرد شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں کلاسیکل رچاؤ ہے۔ چونکہ ان کا کلام ہمیں دیر سے وصول ہوا۔ اس لئے ہم اسے یہاں شائع کر رہے ہیں۔ ادارہ اس بات پر معذرت خواہ

اُردو میں رسالہ "فن اور شخصیت" نے جسے صابر دت
نکالتے ہیں، صحافت کا ایک نیا دور شروع کیا ہے۔ آج تک
ایسے بھرے پُرے اور جاندار نمبروں کے لئے ہندوستان کے اُردو والے
عوام پاکستان کے "نقوش" اور "افکار" جیسے رسالوں کے خاص نمبروں کا انتظار
کرتے تھے جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوستان میں اُردو کا خادم کوئی نہیں ہے۔
اگر کوئی ہے بھی تو صرف سرکار۔ سرکاری جلسوں کی طرح بھارت میں اُردو کو
جلسے کی چیز بنا دیا گیا تھا۔ لیکن کسی سرکاری اعانت کے بغیر "فن اور شخصیت"
کے تین خاص نمبر نکال کر یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ اُردو صرف اقلیتوں
کی نہیں بلکہ ہندوستانی عوام کی بھی زبان ہے۔ اُردو کو سیاست کے
چکر اور سرکار کی قید سے چھڑانے کا حوصلہ "فن اور شخصیت" نے دکھایا ہے۔

(کملیشور)

زبانِ خلق

(کملیشور نمبر کے بارے میں)

کشمیری لال ذاکر
چنڈی گڑھ

مائی ڈیر صابر!

کملیشور نمبر مل گیا۔ میں نے اس کا بیشتر حصہ پڑھ لیا ہے۔ تمہیں داد دیتا ہوں جس مستقل مزاجی اور حوصلے سے تم کام کر رہے ہو۔ کیونکہ اس نمبر کا نگراں بھی میں ہی ہوں اس لئے زیادہ کہوں گا تو لوگ سمجھیں گے اپنی تعریف کر رہا ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم نے کملیشور کو جس انداز سے اردو پڑھنے والے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے وہ بیحد دلکش، تاثر انگیز اور جان دار ہے۔ دو ایک دوست یہ پرچہ شاید پریم وار برٹنی کے پاس دیکھ کر آئے تھے۔ تعریف کر رہے تھے۔

تمہارا بھائی

ذاکر

قرۃ العین حیدر
بمبئی

جناب صابر دت صاحب!

آپ نے کملیشور نمبر سے متعلق میری رائے مانگی ہے۔ آپ نے واقعی بڑی محنت اور لگن سے یہ نمبر مرتب کیا ہے۔ کملیشور ہندی کے ایک اچھے ادیب ہیں۔ ان کے افسانے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عصری ہندی کہانی اُردو افسانے سے قطعی مختلف نہیں ہے۔ وہی کردار ہیں، وہی ماحول اور وہی مسائل۔ کملیشور کے ہاں زبان بھی وہی ہے جو اردو افسانوں کی زبان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کملیشور نمبر دلچسپی اور شوق سے پڑھا جائے گا۔ "گرمیوں کے دن" اور "بکھرے پتے" کے مصنف کو اُردو میں متعارف کر کے آپ نے بہت معقول کام کیا۔

والسلام۔

قرۃ العین حیدر

پرکاش پنڈت
دِلّی

پیارے صابر دت!

کملیشور نمبر ملا۔ دیکھ کر طبیعت صاف ہو گئی۔ ایسا شاندار نمبر نکالنے پر میری دلی مبارکباد قبول کرو۔

تمہارا

پرکاش پنڈت

انتظار حسین

۳۸ ۔ جیل روڈ ــــ لاہور

میرے عزیز بھائی صابردت جی

کملیشور نمبر کی نوازش کے لئے میں آپ کا بیحد ممنون ہوں۔ یہ نوازش کرکے آپ نے مجھے ہمعصر افسانہ نویس کی ایک نئی دنیا سے روشناس کرایا ہے۔ ابتک میں نے ہندی کہانی انگریزی ترجموں سے جہاں تہاں پڑھی تھی۔ اور اس کا کچھ ایسا قائل نہیں ہو سکا تھا۔ ہندی کہانی سے یہ میرا پہلا باقاعدہ تعارف ہے۔ یہ تعارف میرے لئے ایک خوشگوار تجربہ بن گیا ہے۔ کملیشور جی کی کہانیاں میں بس پڑھتا چلا جا رہا ہوں۔ اپنے ردعمل کو بعد میں یکجا کر دوں گا۔ ہاں ایک بات کہتا ہوں۔ تقسیم کے بارے میں کملیشور جی کا جو نقطۂ نظر ہے وہ فی الوقت زیر بحث نہیں۔ مگر یہ کہ اسی نقطۂ نظر کے تحت اردو میں جو کہانیاں لکھی گئی ہیں کم از کم ان کے مقابلے میں (قرۃ العین حیدر کے استثناء کے ساتھ) یہ کہانیاں زیادہ جاندار ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ آپ کا رسالہ کچھ اور ہندی کے افسانہ نگاروں سے اور ہو سکے تو تامل، تلگو وغیرہ کے افسانے سے بھی ہمارا تعارف کرائے۔ اردو کے لکھنے والوں پر خصوصی نمبر نکالنے کے مقابلے میں شاید یہ کام اردو ادب کے لئے زیادہ بامعنی ہو۔

نیازمند
انتظار حسین

چودھری محمد نعیم

شکاگو (امریکہ)

برادرم صابردت صاحب۔ تسلیمات۔

الطاف نامہ ملا تھا۔ اس کے کچھ دن بعد پارسل بھی پہنچا۔ آپ تو غضب کے مہربان نکلے۔ دو ضخیم کتابیں اور وہ بھی ہوائی ڈاک سے۔ بھئی آپ کا بیحد مشکور ہوں۔ اس ذاتی نوعیت کے شکریہ کے اظہار کے بعد یہ کہنا بھی از حد ضروری ہے کہ یہ دونوں کتابیں شائع کرکے آپ نے ہم اردو والوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ کملیشور کے بارے میں اکثر اردو والوں کو یہ بدظنی رہی ہے کہ وہ اردو دشمن ہیں۔ حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ وہ بات دو ٹوک کہتے ہیں اور ان کے قول سے اختلاف بھی ممکن ہے، لیکن ان کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ۶۵ء کی ہند پاک جنگ سے متعلق جو تحریریں اردو دانشوروں کی شائع ہوئی تھیں ان پر کملیشور نے بھی تبصرہ کیا تھا اور میں نے اپنے ایک مضمون میں اس کے حوالے سے بحث بھی چھیڑی تھی۔ اور یاد آتا ہے کہ اسی سلسلے میں کملیشور جی سے مختصر سی خط و کتابت بھی رہی تھی۔ آپکے خاص نمبر کے ذریعہ اب ان کی شخصیت سے خاصی واقفیت ہو گئی۔ اور ان کی کہانیوں تک بھی رسائی آسان ہو گئی۔ "نیلی جھیل" اور سانپ جیسی کہانیوں نے ان کے فن کا بھی قائل کر دیا۔ ناولٹ ابھی نہیں پڑھا۔ "کتنے پاکستان" میں جو کرب چھپا ہے اس نے بہت متاثر کیا۔ لیکن فن کے اعتبار سے اس میں قلم کچھ "موٹا" استعمال ہو گیا ہے۔

ٔہندی کہانی پر ایک اچھے مضمون کی شمولیت سے اس شمارہ کی افادیت اور بڑھ جاتی۔ یہ بات بھی اچھی لگی کہ آپ
نے اپنے لکھنے والوں کو ان کے دل کی بات کہنے دی اور سنسر کی قینچی نہیں چلائی۔ مثلاً باقر مہدی صاحب کے مضمون
میں ——— دوسرا تحفہ میرے لیئے پہلے سے بھی بیش قیمت ہے۔ قرۃ العین حیدر کی اس کتاب کا مہینوں سے مشتاق
تھا۔ سنا تھا کہ پاکستان میں شائع ہو گئی ہے لیکن ابھی یہاں نہیں پہنچی تھی۔ کچھ قسطیں "آجکل" میں پڑھنے کے بعد دل
چاہتا تھا کہ کسی طرح پوری کتاب ہاتھ لگ جائے۔ قرۃ العین نے اردو فکشن کو بہت کچھ دیا ہے اور یہ ہم اردو
والوں کی بدذوقی اور بدتوفیقی ہے کہ ان کی ناولیں آج آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ مجھے "سفینۂ غم دل" اور
میرے بھی صنم خانے" کی مدت سے تلاش ہے۔ یہی حال عزیز احمد کی ناولوں کا ہے۔ ایک زمانے تک
ٹیڑھی لکیر" بھی بازار سے غائب رہا۔ آپ کسی پبلشر کو ان معیاری ناولوں کے اچھے ایڈیشن نکالنے پر راضی کر سکیں
تو کیا کہنا۔ "کارِ جہاں دراز ہے" ایک انتہائی اہم تحریر ہے۔ اس کے آئینے میں ہم اپنی حالیہ تاریخ سے تو
واقف ہوتے ہی ہیں خاص اہمیت اس بات سے ہے کہ ایک اہم فنکار کا پورا ذہنی اور ثقافتی پس منظر بھی سامنے
آجاتا ہے۔ جو انفرادی بھی ہے اور عمومی بھی۔ اس کو ہندی میں بھی شائع کیجیے اور اگر محترمہ اسے انگریزی میں شائع
کردیں تو کیا کہنا۔ آپ نے جس اہتمام سے یہ اردو ایڈیشن نکالا ہے اس کی داد دینا بھی ضروری ہے۔ خدا کرے
[illegible] اسی شان سے ہر جلد نکلے۔　　والسلام

[illegible]

فیض احمد فیض

لاہور

مکرمی صابر دت۔ تسلیم!

میں بیرون ملک سفر میں تھا اس لیئے آپ کا ۲۷ رمئی کا لکھا ہوا خط اور کملیشور نمبر حال ہی میں ملا ہے۔
کسی دوسری زبان کے ادیب پر اردو میں یہ پہلا جامع اور مکمل کام ہے۔ اس جراءت مندانہ اقدام پر آپ میری دلی مبارکباد
قبول کیجیئے۔

تصاویر وغیرہ کے بارے میں آپ کی فرمائشیں حتی الامکان پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔ اور جو تحریریں
دستیاب ہوسکیں وہ بھی بھجوا دوں گا۔ میں کافی طویل غیر حاضری کے بعد گھر لوٹا ہوں۔ اس لیئے مصروفیت بہت
ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ذرا فراغت میسر آئی تو اس طرف توجہ کروں گا۔

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ مخلص

[illegible]

پروفیسر گوپی چند نارنگ

نئی دہلی

مکرمی صابر دت صاحب ۔

کملیشور نمبر ہر لحاظ سے لائق داد ہے ۔ آپ نے فن اور شخصیت کو ایک خاص نہج پر ڈال دیا ہے اور اب تک اس کے جتنے بھی نمبر نکالے ہیں ، یادگار ہیں ، مہندر ناتھ نمبر ، جان نثار اختر نمبر اور اب کملیشور نمبر ۔ آپ کی محنت کی جتنی داد دی جائے کم ہے ۔ کملیشور اس عہد کا وہ فنکار ہے جس کا تعارف دوسری زبانوں میں ہونا چاہئے ۔ انسان ، اس کے مسائل اور اس کے دکھ درد پر کملیشور کی نظر گہری ہے ۔ اردو ادب اور ہندی ادب میں جو گہرا رشتہ رہا ہے ، ادھر وہ یک طرفہ سا ہو گیا ہے ۔ ضرورت ہے کہ آج کے ہندی ادب سے بھی اردو والوں کو کچھ واقفیت حاصل ہو ۔ آپ نے ہندی ساہتیہ کے ایک اعلیٰ فنکار کو اردو میں روشناس کرا کے جو خدمت انجام دی ہے ، اس کے لئے آپ ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں ۔

گوپی چند نارنگ

ڈاکٹر قمر رئیس

دہلی

برادرم صابر دت صاحب ۔ سلام ۔

آپ کی شکایت بجا ہے اور میں شرمندہ ہوں کہ کملیشور نمبر کے بارے میں اپنی رائے جلدی نہیں لکھ سکا ۔ سوچا اس ٹکڑوں میں بٹے ہوئے آدمی کو ٹکڑوں ہی میں پڑھو ۔ تاکہ یہ لذیذ حکایت دراز تر ہو سکے ۔ پھر یہ ہوا کہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کے نامور استادوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ اردو میں کملیشور پر ایک ضخیم خاص نمبر نکلا ہے تو انھیں بالکل یقین نہیں آیا اور جب انھیں یقین دلانے کے لئے ان کے اصرار پر میں نے انھیں یہ یادگار نمبر دکھایا تو پہلے تو وہ حیران ہوئے پھر بغل میں داب کر گھر لے گئے ۔ بڑی مشکل سے بازیافت ہوئی ۔

کملیشور جی میرے ہم سن ہیں ، معاصر ہیں اور میں جب بھی ان سے ملا ہوں یار سمجھ کر ملا ہوں ۔ لیکن تمہارے اس نمبر نے ہم دونوں کے درمیان ایک خلیج سی حائل کر دی ہے ۔ میں تو چھوٹا نہیں ہوا لیکن وہ مجھ سے بہت بڑے ہو گئے ہیں ۔ دل میں اب ان کے لئے وہی احترام وہی جذبۂ عقیدت محسوس کرتا ہوں جو مثلاً پریم چند اور گورکی جیسے بزرگ ادیبوں کے لئے محسوس کرتا آیا ہوں ۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پریم چند اور گورکی کی تخلیقی روحوں نے ایک قالب میں جنم لے لیا ہو ۔ اخلاقی اور سماجی سطح پر انسان کی آویزش اور اس سے پیدا ہونے والے تناؤ اور دباؤ ۔ یہ پریم چند کی فکر کا مرکزی نقطہ تھا جسے کملیشور نے آج کی پیچیدہ زندگی کے عرفان سے کچھ اور روشن بنا دیا ہے ۔ پھر گورکی جیسی شدت فکر و احساس اور قوت اظہار نے جیسے اس پر دھار رکھ دی ہو ۔ "راجہ نربنسیا" "کھوئی ہوئی دشائیں" "اتنے اچھے دن"

جیسی کہانیاں اس کا ثبوت ہیں۔ جہاں یہ سچ ہے کہ چھوٹا ادیب صرف اپنی زبان کا ادیب ہوتا ہے وہاں یہ بھی سچ ہے کہ بڑا ادیب ہر اُس زبان کا ادیب ہوتا ہے جس میں وہ پڑھا جائے۔ اوپندر ناتھ اشک، پرکاش پنڈت، پھر یہ سب برسوں سے ہندی میں لکھ رہے ہیں اور جیسے اب ہندی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ کملیشور کو آپ ہندی سے اردو میں لائے ہیں۔ اس سے کچھ اس فردی کی تلافی ہوگی اور کچھ اردو کے ان افسانہ نگاروں کو (جو ABS-TRACT COMPOSITION- کی بازیگری دکھا رہے ہیں) معلوم ہوگا کہ ہندی کے ممتاز افسانہ نگاروں نے کہانی کو حقیقت نگاری کے کیسے وسیع امکانات اور منزلوں سے روشناس کرایا ہے۔ ایک بار پھر اس شاندار اور یادگار نمبر پر دلی مبارکباد قبول کیجئے —— خیر اندیش

پروفیسر محمد حسن

نئی دہلی

مکرمی! تسلیم!

"کملیشور نمبر" پڑھ لیا۔ آپ نے حسبِ معمول کمال کیا ہے۔ بہت اچھا نمبر نکالا ہے۔ مبارک ہو۔ میرے ہندی داں بعض احباب کہتے ہیں کہ کملیشور اتنے بڑے افسانہ نگار اور ناول نویس نہیں جتنا اچھا آپ کا نمبر ہے۔

خاکسار

محمد

فکر تونسوی

نئی دہلی

بچے، بلکہ بچے جی!

کملیشور نمبر مل گیا۔ بلکہ سمجھو صابردت مل گیا۔ کیونکہ تم نے اس نمبر پر جو لہو صرف کیا، مجھے اس لہو کی خوشبو ایک ایک صفحہ پر محسوس ہوئی —— تمہیں مبارکباد اس لئے نہیں دیتا کیونکہ ایسے نمبر نکالنا اب تمہارے بائیں ہاتھ کا کرتب بن چکا ہے۔

البتہ مجھے جس چیز سے ایک نئی مسرت حاصل ہوئی کہ مجھے کملیشور کی کچھ وہ چیزیں مطالعہ کے لئے ملیں جس سے میرے ذہن میں اس کی ادبی عظمت کچھ اور بلند ہوگئی —— اگرچہ یہ بلندی مجھے دلکش لگی، حیرت ناک نہیں لگی۔ بہرکیف ادب کے مرلی منوہر کملیشور کو میری طرف سے گال پر ایک تھپڑ سا لگا دینا کہ گال ہی ہر محبوبہ کا پیار بھرا لطیف حصہ ہوتا ہے۔

فکر تونسوی

خواجہ احمد عباس　　　　　　　　　　　　بمبئی

ضرورت تھی کہ کملیشور جیسا سیکولر۔ انسان دوست ادیب صرف ہندی ہی میں مقید نہ رہے اُردو والے بھی اس کی شخصیت اور اس کے فن کو جانیں، اس سے متعارف ہوں اور اس سے متاثر ہوں۔ یہ کام بہت خوبی سے "فن اور شخصیت" کے ایڈیٹر نے کیا ہے۔ اس کے مشیروں اور معاونوں میں اُردو کے سب چوٹی کے ادیب شامل ہیں جن میں سے اکثر نے کملیشور کے آرٹ پر تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں اور اس کی شخصیت کو اُردو والوں سے متعارف کرایا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ کملیشور کا ایک ناول، کوئی درجن بھر افسانے اس اسپیشل نمبر میں اُردو میں منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ اسے ایک شروعات سمجھنا چاہیئے۔ مگر بہت خوبصورت اور معنی خیز شروعات۔

نرگس دت　　　　　　　　　　　　بمبئی

عزیزم صابر!

تم نے کسی غیر زبان کے ادیب پر اُردو میں پہلی بار اتنا ضخیم نمبر نکالا ہے اس کی مبارکباد قبول کرو۔ کملیشور اچھے کہانی کار ہیں۔ "اتنے اچھے دن" ۔ "کتنے پاکستان" پڑھ سکی ہوں۔ ابھی ناولٹ نہیں پڑھا ہے۔ ان کی شخصیت پر ایک دو مضامین بھی دیکھ چکی ہوں۔ ارادہ ہے کہ پورا پرچہ پڑھ لوں۔ تم بھی اتنا ضخیم پرچہ نکالتے ہو کہ ایک نشست میں ایک ہی وقت اُسے کوئی پڑھ بھی نہیں سکتا ــــ بہرحال ایسے ہی نمبر نکالا کرو۔ اُردو ادب اور زبان کو اس کی ضرورت ہے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔

تمہاری بھابی

نرگس

جیلانی بانو　　　　　　　　　　　　حیدرآباد

محترم۔ تسلیم!

کملیشور نمبر مل گیا تھا۔ میں اپنی بیماری کے سبب جلد جواب نہ دے سکی۔ شرمندہ ہوں

کملیشور نمبر دیکھ کر بیحد خوشی ہوئی۔ میں نے کملیشور صاحب کی بہت کم کہانیاں پڑھی تھیں۔ وہ کہانیاں اتنی پسند آئی کہ ان کی اور کہانیاں دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ اب اس نمبر میں ایک ساتھ بہت سی اچھی کہانیوں نے بہت متاثر کیا۔

کملیشور صاحب۔ کے فن اور شخصیت کی ہر سمت سے عکاسی کی گئی ہے۔ لیکن کتابوں کی فہرست اور ان کے پتے آپ نے نہیں دیئے۔ بہرحال کسی فنکار کو خراج تحسین پیش کرنے کا یہ سب سے اچھا اور خوبصورت طریقہ آپ نے نکالا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے ساتھیوں کی اتنی رائیں، تنقیدیں، خلوص اور محبت کو ایک جگہ دیکھ کر فنکار کو قارئین کی طرف سے سب سے بڑا ایوارڈ مل جاتا ہے۔ اس ایوارڈ کے آگے سرکاری اداروں کے انعام کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

آپ کا یہ کام بہت بڑا ہے اور بیحد محنت طلب ہے۔ میری پُرخلوص مبارکباد آپ کو اور کملیشور صاحب کو

مخلص

جیلانی بانو

نئی دہلی　　　　　　　　　　　　　　　　　　**آمنہ ابوالحسن**

جناب صابر دت صاحب۔ آداب

"فن اور شخصیت" کا کملیشور نمبر نظر سے گذرا۔ اتنے جامع نمبر کے لئے مبارکباد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ اردو ادب کو آپ کا دیا ہوا یہ تحفہ بھلایا نہ جا سکے گا۔ میری دلی مسرت قبول کریں۔ فقط

آمنہ ابوالحسن

چنڈی گڑھ　　　　　　　　　　　　　　　　　　**پریم وار برٹنی**

جانِ عزیز صابر دت!

کبھی سچائی بھی ذہنی فتور پیدا کر دیتی ہے۔ اسی لئے کملیشور نمبر کی تعریف نہیں لکھ رہا ہوں۔ کہ کہیں تمہارا دماغ خراب نہ ہو جائے۔ کملیشور کے جیون اور ساہتیہ کے دیگر اہم کارناموں کے علاوہ اس نمبر کا ایک ناقابلِ فراموش پہلو یہ بھی ہے کہ اردو اور ہندی جیسی عظیم اور ہمہ گیر زبانوں کو شعوری طور پر قریب لانے کا جتن تم نے کیا ہے۔ اور یہ ضرورت موجودہ وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے حالاتِ حاضرہ کے سوشل تقاضوں سے ہم آہنگ! جس کا سارا نہیں تو (نمایاں کریڈیٹ) تمہارے نام اور کام کو جاتا ہے۔

تمہارا

پریم وار برٹنی

حیدر آباد　　　　　　　　　　　　　　　　　　**شاذ تمکنت**

ڈیر صابر دت!

تمہارا خط ملا۔ بھئی تمہارا 'کملیشور نمبر' اچھا ہی نہیں، بہت اچھا ہے۔ اگر میں توصیفی خط نہ لکھ سکا

تو معاف کر دو۔ تمہارے یہ سارے نمبر خوشبو کی طرح ہیں، ان کی مہک دور دور تک پہنچ رہی ہے۔

تمہارا

نئی دہلی

بانی

ڈیر صابر!

'کملیشور نمبر' مل گیا۔ یہ بیرونی اور باطنی خوبیوں کا مثالی صابر نامہ ہے۔ تمہاری محنت اور اس سے کہیں زیادہ تمہاری ہوشمندی اپنا جادو جگا رہی ہے۔

تمہارا　بانی

بلراج ورما

نئی دہلی

پیارے صابر دت۔ جیو ہزار برس تم۔

مہندر ناتھ، ہمارے شاعر اختر اور اب کملیشور۔ خدا قسم صابر دت تم ادبی شخصیتوں کے سچے پارکھی ہو۔ ادبی جریدوں کی تاریخ میں ایسے ضخیم بلند پایہ اور جامع خصوصی نمبر کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں اب تک نہیں نکلے۔ میں سمجھتا ہوں کم از کم ہندوستان میں یہ ایک نئی روایت کی شاندار، قطعی نرالی اور منفرد ابتدا ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت، ترتیب و تدوین سرورق سے لے کر پشتی ورق تک ہر منظر تم لوگوں کی محنت، کاوش اور سلیقہ کا آئینہ دار ہے۔ ایسے کام کے لئے آدمی کے دل میں لگن اور دیوانگی کے علاوہ خلوص و محبت کا بھی ایک سمندر ہونا چاہیئے۔ جو یقیناً تمہارے اندر موجود ہے۔

ہندی کے ایک بڑے فنکار کو اردو دنیا میں اس نئے اور انوکھے ڈھنگ سے متعارف کرانے کی تمہاری یہ ادا ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے۔

ہم بڑے کم علم لوگ ہیں اور اپنے ہی وطن میں اپنی علاقائی زبانوں کے ادب کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ ایک پڑھا لکھا اردو والا انگریزی، امریکی اور روسی ادب کے بارے میں تو کچھ نہ کچھ جانتا ہے مگر پنجابی، کشمیری، مراٹھی، گجراتی، تامل، تلگو، کنڑ، اڑیا اور بنگالی بھاشاؤں کے ادب سے قطعی ناواقف ہے۔ یہ ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے۔ تم نے ہماری اندھی اندھیری دنیا میں ایک رنگ کی روشنی تو پھینکی ہے۔ اب لگے ہاتھوں دوسرے رنگوں سے بھی ہماری اس دنیا کو ذرا سجا سنوار کر کچھ منور کر دو، ورنہ تم پر دوست پرستی کا الزام آجائے گا۔

یوں تو ساری کی ساری کمپوزیشن ہی بڑھیا ہے مگر جو مضامین مجھے پسند آئے ان میں سرِفہرست مضمون باقر مہدی کا ہے اس کے علاوہ کشمیری لال ذاکر، سید ظہیر علی، اصغر علی انجینئر، ظفر ادیب اور جوگندر پال کے مضامین خوب ہیں۔

ہمارے عصری ادب میں کلیشور نمبر ایک اہم اضافہ ہے۔ اس عظیم ادبی خدمت کے لئے تم اور تمہارے ساتھی ہمارے ملک کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تمہارا
بلراج ورما

شکیلہ اختر　　　　پٹنہ

پیارے بھائی صابر دت! سلام و رحمت!

آپ کا پرچہ "فن اور شخصیت" کا "کملیشور نمبر" ملا۔ آپ نے اردو کی ایسی خدمت کی ہے جو بھلائی نہ جاسکے گی۔ اور ایسے انمول نمبر نکالے ہیں کہ ہندوستان میں ایسے شاہکاروں کا کوئی خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت دے آمین۔

آپ کی بہن
شکیلہ اختر

سریندر ناتھ ورما　　　　شملہ

صابر بھائی۔ آداب

"فن اور شخصیت" کا کملیشور نمبر موصول ہوا۔ یہ اندازہ لگا کر کہ فی الحال صحرا نوردی کی نوبت نہیں آئی۔ دلی تسکین حاصل ہوئی۔ بھئی خوب۔ جاں نثار اختر نمبر کی اشاعت کے بعد میں اس انتظار میں تھا کہ کب مجھے یہ پیغام جانفزا ملے گا کہ تمہاری قرقی کی نوبت آپہنچی ہے اور یہ کہ تم فقیری کا لبادہ اوڑھ کر جانب جنگل فرار ہو گئے ہو تاکہ اردو داں طبقہ کے بہی خواہوں کی نظر عتاب اور قرضداروں کے تقاضوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکو۔ لیکن یکے بعد دیگرے اتنے شاندار اور یادگار نمبروں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ تم واقعی بہت ڈھیٹ قسم کے انسان واقع ہوئے ہو اور تمہاری سخت جاں کا تازہ ترین ثبوت کملیشور نمبر ہے۔ آج کل کے اردو کش دور میں ہندی کے صف اول کے ادیب و افسانہ نگار کو اردو میں اس شان امتیازی کے ساتھ پیش کرنا ایک کرشمہ سے کم نہیں ہے۔ ہندوستان کے اکثر و بیشتر جریدے جب ناموافق حالات کا رونا رو رہے ہیں تب تم نہایت طمطراق کے ساتھ ہند و پاک کے درمیان ایسے خوبصورت نمبر شائع کرکے خلوص و یگانگت کے پل باندھ رہے ہو۔ آنے والی نسلیں تمہارے اس کارنامے کو فخر اور تشکر کے ساتھ یاد کریں گی۔ تمہاری لگن اور تمہارے حوصلے کی داد نہ دینا کفر کے مترادف ہوگا۔ میری جانب سے اس خوبصورت ادبی تحفے پر دلی مبارکباد۔

کملیشور نمبر ہر لحاظ سے کملیشور کے فن پر ایک جامع، مکمل اور معرکہ خیز دستاویز ہے۔ گلشن اردو ادب میں تم اس سے بھی زیادہ حسین اور دلآویز شگوفے کھلاؤ، یہی دعا ہے۔ آمین

مخلص
سریندر ناتھ ورما

سلمیٰ صدیقی

بمبئی

عام طور سے ہمارے سماج میں دو قسم کے آدمی پائے جاتے ہیں، ایک وہ جن پر نمبر لگائے جاتے ہیں، دوسرے وہ جن پر نمبر لگائے جاتے ہیں۔ لیکن سچ پوچھئے تو کبھی کبھی انسانوں کی یہ دو قسمیں ایک دوسرے میں اس طرح گڈمڈ ہوتی محسوس ہوتی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس پر نمبر لگانا چاہیئے اور کس پر نمبر لگانا چاہیئے۔ چونکہ ادیب کا شمار ایسی ہی "نمبری" شخصیتوں میں ہوتا ہے اس لئے ادیب کی حیثیت بھی ایک طور پہ منصف اور مجرم دونوں ہی کی ہوتی ہے۔ لیکھک کو لکھنے کے پُرپیچ عمل میں ایسی ایسی پُرپیچ، سنسان اور گنجان، گلستاں اور ویران راہوں سے گذرنا پڑتا ہے کہ جب وہ چاک گریباں، تار تار داماں اور لہولہان، اپنے حصے کی آخری منزل پہ پہنچتا ہے تو متاعِ لوح و قلم ہر لمحہ جنم لینے والی نئی دنیا کو سونپ کے اُس آبلہ پا کی راہ تکتا ہے جس کے انتظار میں کانٹوں کی زبان سوکھتی رہتی ہے۔

کملیشور نہ تو ایک بہت سیدھے سادے انسان ہیں اور نہ ہی ایک سیدھے سادے لیکھک ہیں۔ انہیں ایسا ہونا بھی نہیں چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ یہ دنیا جس میں ہم سب کے علاوہ خود کملیشور بھی رہتے ہیں بہت ٹیڑھی میڑھی ہے۔ چونکہ کملیشور بھی اسی ٹیڑھے میڑھے سماج کے ایک زیادہ ٹیڑھے میڑھے فرد ہیں، اس لئے ان کی نگاہ، طرزِ تحریر اور کبھی کبھی کردار بھی بہت ٹیڑھے میڑھے ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ سیدھی راہ پر سر جھکائے چلنے والے عام طور سے صرف گھر کے ہو رہتے ہیں۔ گھاٹ کے بالکل نہیں — اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے بغیر انسان، دوسرے انسان کی پیاس کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔

سترہ سال کی مدت گزری کملیشور کو پہلی بار دیکھا تھا اور اب یقین ہو گیا ہے کہ ایسے ایسے کتنے ہی سترہ سال بیت جانے پر بھی کملیشور کو آسانی سے کسی کوزے میں بند نہیں کیا جا سکے گا۔ پہلی بار ملنے پہ وہ ایک خاموش جوالا مکھی نظر آئے تھے۔ لگتا تھا بظاہر شانت دھرتی پہ کہیں کوئی لاوا اُبلنے بکھرنے کو بے قرار ہے۔ اس بے قراری کو سمجھنے اور سمجھنے کے لئے مین پوری کی سوئی ہوئی، سہمی ہوئی گلیاں، الٰہ آباد کی ادبی اور غیر ادبی محفلیں اور راجدھانی دہلی کی تنگ و تاریک سیاسی فصیلیں یقیناً ناکافی اور محدود تھیں۔ اس لئے بمبئی تو آنا ہی پڑا کہ اس بڑی بڑی عمارتوں کے جنگل کی چھتر چھایا میں شخصیت صرف پرکھی نہیں جاتی، تولی اور خریدی بھی جاتی ہے۔ لیکن کملیشور بکنے یا خریدنے والی شخصیت نہیں ہیں۔ وہ تو بظاہر سرسری نظر ڈال کر گذر جانے والوں میں سے ہیں لیکن یہی سرسری نظر جب کاغذ کے صفحات پہ اس بڑے شہر کے آنسوؤں کی روشنائی بن کے ٹپکتی ہے تو بڑی بڑی عمارتوں کے دل کانپنے لگتے ہیں۔ لگتا ہے

کملیشور سیدھے راستے سے نہ تو اپنے دفتر جاتے ہیں نہ ٹی۔ وی سنٹر، انھوں نے کہیں کوئی چور دروازہ کھوج لیا ہے اور اس چور دروازے کا قفل وہ صرف خود ہی کھول پاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کسی پانچ ستاروں والے ہوٹل کے دالان میں کوئی ٹھنڈی، گرم یا زیادہ گرم مشروب کے چھلکتے تھرکتے ہوئے گھونٹ لیتے لیتے اچانک کیوں باہر نکل بھاگتے۔ دوستوں کی بھری بزم سے بھاگ نکلتے ہیں اس لئے کہ کسی تنگ و تاریک گلی کے نکڑ پہ بیٹھے بیٹھے وہاں میں "مایوس" پورن کی بڈھی ماں ان کی راہ تک رہی ہے اور کسی ریلوے اسٹیشن کے گنجان پلیٹ فارم پر بوٹ پالش کرتے والا کوئی ننھا راموان کے انتظار میں گھڑیاں گن رہا ہوگا اور کسی بدنام بستی میں کوئی بے نام بے آسرا عورت لگا ہوا ہیں پھولوں کے ہار پہن دل کے داغوں کے شمار کے لئے اس کملیشور کی منتظر ہے جو اسے یاد دلائے گا کہ کبھی کسی گھر کی دہلیز نے اس بدنصیب کی راہ بھی روکی تھی جو کبھی چراغ خانہ تھی اور اب شمع انجمن ہے۔

میری ملاقات کملیشور سے پہلے ہوئی اور اُن کی کہانیوں سے بہت بعد میں۔ ہمارے ملک میں جتنی مختلف ذات پات ہیں اسی قدر مختلف بولیاں بھی ہیں۔ ہم اپنی اپنی ذات پات اور اپنی اپنی بولیوں میں اس قدر مگن رہتے ہیں کہ کبھی اس بات کی نہ تو فرصت ملتی ہے اور نہ ہی خواہش ہوتی ہے کہ آپس کی بولیوں اور آپس کے رہن سہن کو سمجھنے کی کوشش کریں یہی وجہ ہے کہ بولیوں سے ہم بولنے کے علاوہ لڑنے جھگڑنے کا سلسلہ بھی شروع کرتے رہتے ہیں۔ اور جھگڑنے کا سلسلہ ایک بار شروع ہو جائے تو اس کے ختم ہونے کے امکانات ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے یا بدقسمتی کہ ہم اپنی بولیوں اور اپنی ذات پات کو پیار اور بقائے باہمی کا پل بنانے کے بجائے اوچھے ہتھیاروں کا کارخانہ بنانے پہ تلے رہتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ اور انصاف کو چھوڑیئے کہ یہ بڑا "بوجھل" لفظ ہے۔ یہ سوچئے کہ یہ کس عقل کا تقاضہ ہے کہ ہم ہر وقت یہی سوچتے رہیں کہ کس دیسی زبان میں کس بدیسی زبان کے کتنے الفاظ شامل ہیں۔ کوئی بھی زبان جزیرہ نہیں ہوتی ہے کہ پورے دیش سے کٹ کے رہ جائے۔ آج اگر کوئی زبان اس لئے قابلِ زدنی ہے کہ اس کا نک سک ہمارے نک سک سے مختلف ہے تو کل وہ وقت بھی آسکتا ہے جب ایک ہی ملک میں انسانوں کی شناخت بھی ان کے چہرے مہرے اور نک سک سے ہوا کرے گی۔ مثال کے طور پر کیا بے حد گورے چٹے آدمی کو ہم اس لئے ذات باہر کر دیں گے کہ اس کی رنگت گورے جیسی ہے۔ چنانچہ وہ ہندستانی یا مستند ہندستانی نہیں ہے یا کسی زیادہ کالے چہرے والے کو ہم ٹھکانے لگا دیں گے، یہ کہہ کر کہ تم ہمارے نہیں ہو۔ اپنی زبان اور اپنا چہرہ مہرہ انسان کو اپنی پیدائش کے ساتھ ساتھ نصیب ہوتا ہے اور کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی سے اس کا نصیبہ چھین لے یا اس کی مرضی کے خلاف اس کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرا دے۔ مادری زبان بھی ماں کی کوکھ ہی سے جنم لیتی ہے اور اپنی ماں خواہ وہ کتنی ہی بدصورت یا بدزیب ہو بدلنے والی چیز نہیں ہوتی ہے۔ خون کے بدل ڈھونڈ لئے گئے ہیں لیکن شیرِ مادر کا بدل یا ڈبے کا دودھ نہیں ہو سکتا۔ یہ باتیں میں اس لئے بھی کہہ رہی ہوں کہ کملیشور نے زبان کے مسئلے پر کملیشور نمبر میں خاصی اہم باتیں کہی ہیں لیکن کوئی

اہم بات ہمیشہ "مستند" بھی ہو، یہ ضروری نہیں ہے۔ کملیشور نے زبان کے معاملے پہ جو باتیں کہی ہیں اُن میں اُن کا لہجہ بے حد شیریں لیکن باتیں خاصی کڑوی ہیں۔ لیکن کملیشور بات کی تلخی میں لہجے کی مٹھاس اس طرح ملاتے ہیں کہ نا انصافی یا تاریخی غلط بیانی میٹھے شربت کی مانند حلق سے اُترتی جاتی ہے۔ لیکن یہ شربت دل و دماغ کی تشنگی میں اضافہ کرتا ہے کمی نہیں۔

کملیشور نمبر میں چند نہایت اہم مضامین شامل ہیں۔ شری کشمیری لال ذاکر کا مضمون بلاشبہ خاصے کی چیز ہے۔ کملیشور کی "ڈائری" کے اوراق اس نمبر کی جان ہیں۔ کملیشور کو جاننے کے لئے یہ چند اوراق بہت ضروری ہیں۔ خصوصاً جب وہ اپنی والدہ مرحومہ کے بارے میں چند سطریں لکھتے ہیں یا اپنے مرحوم دوست موہن راکیش کا ذکر کرتے ہیں وہاں کملیشور اس قدر کھل کر اور آنسوؤں میں گھل کے سامنے آتے ہیں کہ مصلحت اور تصنع، دنیاداری اور ظاہری رکھ رکھاؤ کی تمام دیواریں کانپنے لگتی ہیں۔ ہم نے تو کملیشور کو ان صفحوں میں ڈھونڈ لیا ہے۔ کبھی کملیشور بھی خود کو تلاش کرنا چاہیں تو بس ذرا گردن جھکائیں اور اپنی ڈائری پڑھ لیا کریں۔

فن اور شخصیت کے مدیر صابر دت قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے پہلی بار اُردو دنیا سے اُردو والوں ہی کی زبان میں کملیشور کا تعارف کروایا۔ اس طرح کا تعارف محض وقت کی ایک اہم ضرورت ہی کو پورا نہیں کرتا ہے بلکہ ہمارے ادب اور تہذیب کے بیش بہا خزانے میں ایک قابلِ قدر اضافہ بھی کرتا ہے۔

اُردو اور ہندی کا رشتہ صرف چولی دامن یا بہن بہن ہی کا نہیں ہے بلکہ ان دو زبانوں کا رشتہ پریمیوں اور پڑوسیوں جیسا بھی ہے۔ یعنی جتنا چاہو لڑو جھگڑو تعلق ہر حال میں برقرار رہے گا۔ اور یہی وہ رشتہ ہے جس کے بارے میں غالب بہت پہلے کہہ گئے تھے ؎

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ایسی عداوتیں بہت صحت مند ہوتی ہیں اور ادب کی تندرستی کے لئے ایسی کوششیں وٹامن کا کام کرتی ہیں۔

میری دعا ہے کہ صابر دت جی آئندہ بھی ایسی ادبی خدمات ایسی ہی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہیں — آمین!

سہیل عظیم آبادی

پٹنہ

برادرم صابر صاحب ۔ سلام اور محبت

'فن اور شخصیت' کا کملیشور نمبر ملا — میں سمجھتا ہوں کہ کملیشور نمبر شائع کر کے آپ نے بڑا کام کیا ہے۔ دلی مبارکباد قبول کیجیے — کملیشور سے صرف دو بار سرسری طور پر ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کی لکھی کہانیاں بھی دو چار سے زیادہ نہیں پڑھیں۔ دونوں ملاقاتوں میں یہ محسوس ہوا کہ کملیشور اچھے ادیب تو ہیں ہی بہت اچھے انسان بھی ہیں۔ اس نمبر کے مطالعہ سے کملیشور کو زیادہ جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اور اس موقع کی فراہمی کے لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں۔

آپ نے بڑا کام کیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ دوسری زبانوں کے ادیبوں کا بھی آپ اسی طرح اردو دنیا سے تعارف کراتے۔ یہ تلخ حقیقت ہے کہ اردو ادیب اور قاری دوسری زبانوں کے ادیبوں کے بارے میں اتنا نہیں جانتے، جتنا دوسری زبانوں کے ادیب اور قاری اردو ادیبوں کے بارے میں جانتے ہیں۔ خدا کرے آپ اچھے ہوں۔ اچھے رہیں اور 'فن اور شخصیت' اپنے انداز سے اردو زبان کی خدمت کرتا رہے۔

خیر اندیش

سہیل عظیم

حسن کمال (ایڈیٹر اردو "بلٹز")

بمبئی

ڈیئر صابر دت!

کملیشور خود بہت خوبصورت شخصیت کا مالک ہے۔ اس کا نام چار دانگ یوں ہی پھیلا ہے۔ تم نے اس کا نمبر اسی کی طرح خوبصورت نکالا ہے۔ بڑے بڑے "دھرم یوگیوں" کی چھاتی پر سانپ لوٹ گیا ہوگا۔ سوچ کر مزا آتا ہے، کہیں یہ اذیت پسند تو نہیں ہو گیا؟ — مہندر ناتھ اور اختر بھائی کے نمبر پر یار لوگوں نے کیا کیا ناوکِ دشنام نہ پھینکے۔ "دیکھا دونوں کا نمبر نکلا، دونوں اللہ کو پیارے ہو گئے۔" ارے بھائی اللہ کو تو بہت سے وہ بھی پیارے ہو گئے جن کا نمبر نہ نکلا ہے نہ شاید نکلے گا — خیر ان سب کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کملیشور نہ صرف زندہ ہے بلکہ زندہ تر ہے اور ابھی بہت عرصہ تک زندہ رہے گا۔

تمہارا حسن کمال

خدیجہ اختر

بمبئی

کملیشور ہندی کے بہت مشہور اور بہت خوبصورت انداز میں لکھنے والے ہیں۔ صابر دت نے جتنی تیزی کے ساتھ یہ کام انجام دیا ہے اس کی میں قدر کرتی ہوں۔ صابر دت عزم جواں رکھنے والا نوجوان ہے۔

غزل نمبر

کے لیئے

نیک خواہشات

گلشن باورا

(گیت کار)

فارم نمبر ۴ بابت ملکیت وغیرہ

(۱) مقام اشاعت :۔ ۱۵۔ چھپرا بلڈنگ، مادھوداس پاستہ روڈ، دادر، بمبئی ۴۰۰۰۱۴

(۲) میعادِ اشاعت :۔ ششماہی (۳) پرنٹر پبلشر :۔ صابر دت

(۴) ایڈیٹر، مالک :۔ صابر دت (۵) قومیت :۔ ہندستانی

پتہ :۔ ۱۵۔ چھپرا بلڈنگ، مادھوداس پاستہ روڈ، دادر، بمبئی ۴۰۰۰۱۴

میں صابر دت مالک "فن اور شخصیت" اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست و صحیح ہیں۔ دستخط (صابر دت) پبلشر

مشیر ریاض

ہماری آئندہ پیشکش

فیض احمد فیض نمبر

فیض ✱ ترقی پسند تحریک کے ساتھ اُبھرنے والے شاعروں میں سب سے نمایاں مقام کے حامل۔

فیض ✱ اُردو دنیا کے ہر دلعزیز قد آور شاعر۔

فیض ✱ عالمگیر شہرت کے مالک جن کے کلام کا ترجمہ دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔

فیض ✱ بیباک صحافی، بلند پایہ نثار ——— پر

ہندستان میں پہلی بار ایک ضخیم نمبر

نگراں: حسن کمال   مہمان مدیر: پروفیسر گوپی چند نارنگ

علی سردار جعفری نمبر

"اُردو شاعری کا رُخ بدلنے والوں میں حالیؔ اور آزادؔ کے بعد اقبالؔ اور جوشؔ کا نام آتا ہے۔ اور اُن کے پیچھے جو صف کھڑی ہے اس میں علی سردار جعفری پیش پیش ہیں۔"

رسالہ "آج کل" دہلی

"جعفری کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اُردو کی ترقی پسند ادبی خلاقی اپنی پوری آب و تاب اور اپنے تمام پیچ و خم کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔"

سجاد ظہیر "حیات" نئی دہلی

نگراں:— ڈاکٹر قمر رئیس